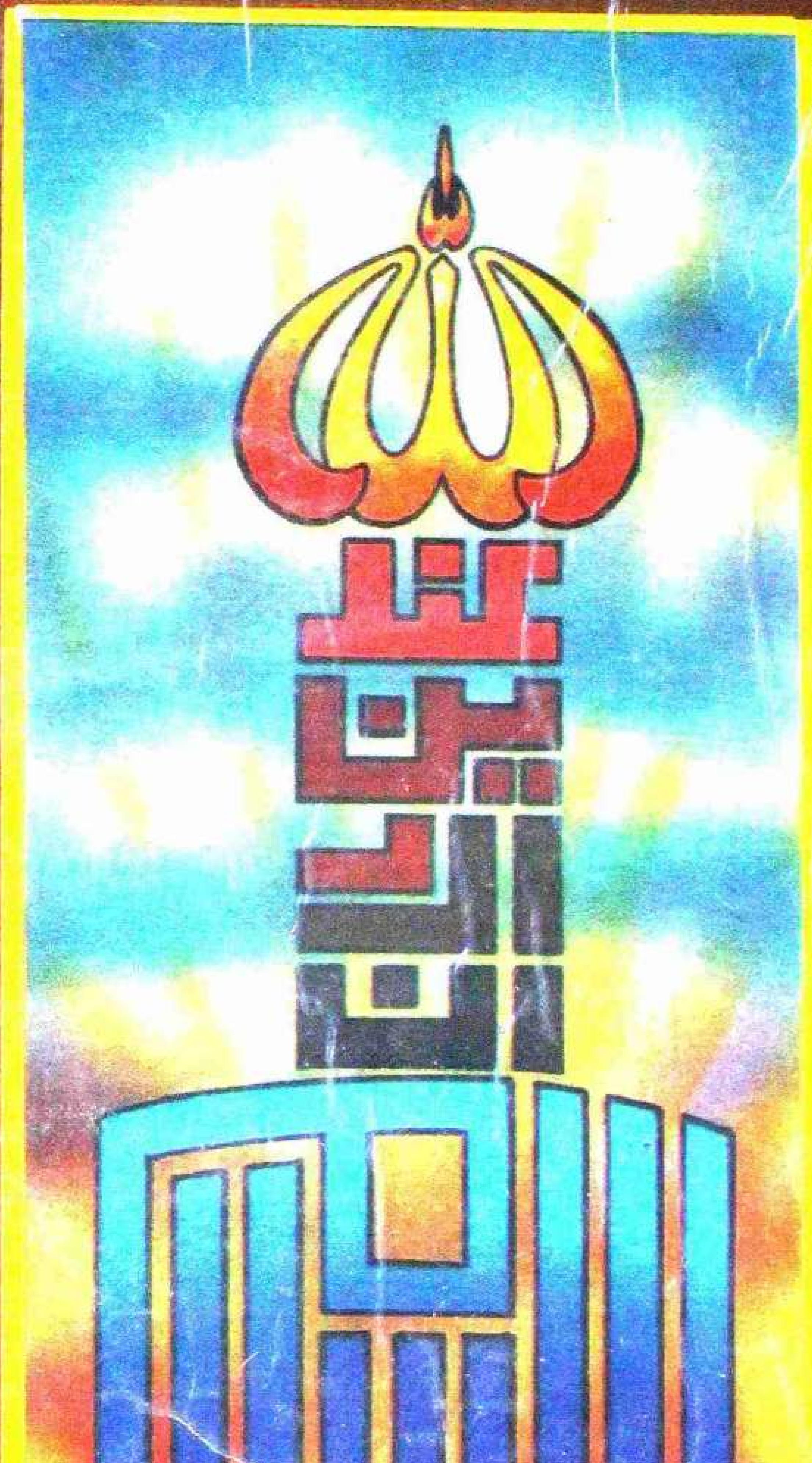

مکتبِ اسلام

علامہ محمد حسین طباطبائی

انتشارات جامعه تعلیمات اسلامی

ISLAMIC SEMINARY PUBLICATIONS

انتشارات جامعہ تعلیمات اسلامی

ISLAMIC SEMINARY PUBLICATIONS

مکتبِ اسلام

علامہ محمد حسین طباطبائی
صاحبِ تفسیر "المیزان"

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH.. 7211795

یکے از مطبوعاتِ
جامعہ تعلیماتِ اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس ۵۴۲۵ کراچی ۲

مکتبِ اسلام

مؤلّف ——— علّامہ محمد حسین طباطبائیؒ

مُرتّب ——— داؤد الہامی

مُترجم ——— محمد فضل حق

مُدیر ——— رضا حسین رضوانی

مصحّح ——— کاظم علی گجراتی

طبع ثانی ۱۹۸۶ء / ۱۴۰۶ھ

جملہ حقوق محفوظ : یہ کتاب کلّی یا جزوی طور پر اس شرط کے ساتھ فروخت کی جاتی ہے کہ راقم الحروف کی پیشگی اجازت حاصل کیے بغیر یہ موجودہ جلدبندی اور سرورق کے علاوہ کسی بھی شکل تجارت یا کسی اور مقصد کی خاطر نہ تو عاریۃً کرائے پر دی جائے گی اور نہ ہی دوبارہ فروخت کی جائے گی۔ علاوہ ازیں کسی آئندہ خریدار یا بطور عطیہ حاصل کرنے والے پر یہ شرط عائد نہ کرنے کے لیے بھی ایسی ہی پیشگی اجازت کی ضرورت ہو گی۔

(وائی کے نفسی)

یہ کتاب

معنون ہے

اُن عزیز نوجوانوں کے نام

جو مکتبِ اسلام کے

والا و شیدا ہیں

اِسلام

کیا تم نے پوری طرح سمجھ لیا ہے کہ اِسلام کیا ہے؟ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بُنیاد حق وصداقت پر رکھی گئی ہے۔ یہ عِلم کا ایک ایسا منبع ہے جس سے عقل و دانش کی متعدّد ندّیاں پھوٹتی ہیں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس سے لاتعداد چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک ایسا بلند رہنما مینار ہے جو اللہ کی راہ کو روشن کرتا ہے۔ یہ اُصولوں اور اعتقادات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو صداقت اور حقیقت کے ہر متلاشی کو اطمینان بخشتا ہے۔

اے لوگو! جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی برترین خوشنودی کی جانب ایک شاندار راستہ اور اپنی عبودیّت اور عبادت کا بلند ترین مِعیار قرار دیا ہے۔ اُس نے اِسے اعلیٰ احکام، بلند اُصولوں، محکم دلائل، ناقابلِ تردید تفوّق اور مسلّمہ دانش سے نوازا ہے۔

اب یہ تمھارا کام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِسے جو شان اور عظمت بخشی ہے اُسے قائم رکھو، اس پر خلوصِ دل سے عمل کرو اس کے مُعتقدات سے انصاف کرو، اس کے احکام اور فرامین کی صحیح طور پر تعمیل کرو اور اپنی زندگیوں میں اِسے اس کا مناسب مقام دو۔

امام علی علیہ السلام

کچھ اپنے بارے میں

حضرت آیت اللہ العظمیٰ سیّد ابوالقاسم موسوی خوئیؒ دام ظلّہ العالی کی سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ بین الاقوامی ادارہ جامعہ تعلیماتِ اسلامی دُنیا کے متعدد ممالک میں اسلامی علوم و معارف پر مشتمل معتبر اور مستند لٹریچر عوام تک پہنچانے میں کوشاں ہے۔

اِس ادارے کا مقصد دورِ حاضر کی روحانی ضروریات کو پورا کرنا، لوگوں کو اصلی اور محکم اسلامی علوم کی طرف متوجّہ کرانا اور اِس گراں بہا علمی سرمائے کی حفاظت کرنا ہے جو اہلبیتِ رسولؐ نے ایک مقدس امانت کے طور پر ہمارے سپرد کیا ہے۔

یہ ادارہ اب تک اُردو، انگریزی، فرانسیسی، سندھی اور گجراتی زبانوں میں ۸۰ سے زیادہ کتابیں شائع کرچکا ہے جو اپنے مشمولات، اسلوبِ بیان اور طباعت کی خوبیوں کی بنا پر فردوسِ کتب میں ایک نمایاں مقام حاصل کرچکی ہیں۔ نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم کی شناخت کرواتا رہے گا۔

اس کے علاوہ جامعہ کے زیرِ اہتمام چلنے والے ساٹھ سے زیادہ مدرسے گزشتہ سات برسوں سے قوم کے بچّے بچّیوں میں بنیادی اسلامی تعلیم کو عام کرنے میں اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مدرسوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ سب کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ دینی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جاسکے۔

دُعا ہے کہ خداوندِ منّان ہم سب پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے!

تعاون کا طلبگار:

(شیخ) یوسُف علی نفسی نجفی

وکیل حضرت آیت اللہ خوئی دام ظلّہ العالی

قارئین گرامی!

یہ کتاب ادارۂ جامعہ تعلیمات اسلامی کی مطبوعات میں سے ہے۔ ادارۂ ہذا کی مطبوعات کی اشاعت کا مقصد دورِ حاضر کی رُوحانی ضروریات کا پورا کرنا اور بالخصوص اسلامی طرزِ فکر کو اجاگر کرنا ہے۔

اِس ادارے نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی ہے کہ فقط وہی مواد پیش کیا جائے جو مستند ہو۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی یہی احتیاط برتی گئی ہے اور ایسی معلومات بھی شامل کی گئی ہیں جو بہت گراں قدر ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کریں جس کے تحت یہ لکھی گئی ہے۔

آپ سے یہ بھی استدعا ہے کہ ہماری مطبوعات پر اپنی بے لاگ آراء تحریر فرما کر بھیجیں جو بڑی خوشی سے اور شکریے کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔

دعوتِ اسلام کو فروغ دینا ایک ایسا کام ہے جس کی انجام دہی کے لیے ہم سب کو تعاون کرنا چاہیے۔ ادارہ آپ کو اِس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تاکہ اِس ارشادِ ربّانی کی تعمیل ہو سکے:

"(اے رسولؐ!) کہہ دیجیے: میں تمھیں بس ایک ہی نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ اللہ کی خاطر اجتماعی یا انفرادی طور پر قیام کرو اور پھر غور کرو"

(سورۂ سبا۔ آیت ۴۶)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔

تعاون کا طلبگار

سکریٹری نشر و اشاعت

فہرست

مقدمہ 15

دین

دین کی ضرورت ____ ۲۴
دین کے فوائد ____ ۲۹
انسان کی اجتماعی زندگی ____ ۳۱
معاشرے کے لیے قواعد وضوابط کی ضرورت ____ ۳۲
قواعد وضوابط کے معاملے میں انسان آزاد ہیں ____ ۳۳
قوانین کے نفاذ کا کمزور پہلو ____ ۳۴
قانون کی کمزوری کا اصلی سرچشمہ ____ ۳۶
اجتماعی قوانین پر دین کی بالادستی ____ ۳۷
قوموں کی چارہ جوئی ____ ۴۱
مذاہب کی مختصر تاریخ ____ ۴۴
دین اسلام ____ ۴۶
انسان کی آسائش کے سلسلے میں اسلام کی اہمیت ____ ۴۸
دوسرے ادیان سے اسلام کا موازنہ ____ ۴۸
دوسرے اجتماعی طریقوں سے اسلام کا موازنہ ____ ۵۰

اعتقادات

توحید ____ ۵۷
خدا کی پہچان اور اقوامِ عالم ____ ۵۸
اس قسم کی جستجو کا انسان کی زندگی پر اثر ____ ۶۰
قرآن کے نقطۂ نظر کے مطابق خدا کو پہچاننے کا طریقہ ____ ۶۲
پیدا کرنے والے کا وجود ____ ۶۵
قرآن اور توحید ____ ۶۷
خدا درجۂ کمال کی صفات کا مالک ہے ____ ۷۰
خدا کی قدرت اور اس کا علم ____ ۷۴
عدل ____ ۷۶
رحمت ____ ۷۸
کمال کی دوسری صفات ____ ۷۹
نبوّت ____ ۸۰
نبوت کا ثبوت ____ ۸۱
انسان اور دوسری موجودات میں فرق ____ ۸۲
ایک نبی کی صفات ____ ۸۴
پیغمبروں کا بنی نوعِ انسان میں سے ہونا ____ ۸۶
اولوالعزم پیغمبر اور دوسرے پیغمبر ____ ۸۷
حضرت نوح علیہ السلام ____ ۸۸
حضرت ابراہیم علیہ السلام ____ ۸۹
حضرت موسیٰ علیہ السلام ____ ۹۲
حضرت عیسیٰ علیہ السلام ____ ۹۴
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ____ ۹۵
بُحیرا راہب کا واقعہ ____ ۹۸
نسطورا راہب کی داستان ____ ۱۰۱
جو بشارت مدینہ کے یہودی دیتے تھے ____ ۱۰۲
نبوّت کی بشارتوں کی طرف قرآن کا اشارہ ____ ۱۰۳
بعثت سے ہجرت تک ____ ۱۰۴

طائف کی جانب سفر	۱۰۷
رسولِ اکرمؐ کی ہجرتِ مدینہ	۱۰۹
جنگ اُحد	۱۱۲
جنگ خندق	۱۱۴
جنگ خیبر	۱۱۵
جنگ حنین	۱۱۷
جنگ تبوک	۱۱۸
رسولِ اکرمؐ کی دوسری جنگیں	۱۱۹
غدیرِ خم اور جانشینی کا مسئلہ	۱۱۹
رسولِ اکرمؐ کا مدینہ میں قیام، اسلام کی ترقی	۱۲۰
رسولِ اکرمؐ کی معنوی اور روحانی شخصیت پر ایک نظر	۱۲۲
آنحضرتؐ کی روحانی شخصیت غیر معمولی تھی	۱۲۵
رسولِ اکرمؐ کی سیرت	۱۲۶
رسولِ اکرمؐ کی مسلمانوں کو وصیّت	۱۳۳
قرآن کریم	۱۳۴
قرآن معجزہ ہے	۱۳۹
رسولِ اکرمؐ پر اتہام بازی	۱۴۳
قرآن کا مشرکین کو مقابلے کے لیے للکارنا	۱۴۴
اہلبیتِ رسولؐ	۱۴۸
حدیثِ کساء	۱۴۹
حدیثِ ثقلین	۱۵۳
اہلبیتؑ کے فضائلِ منصوصہ	۱۵۳
امامت	۱۵۷
امامت کی دلیل	۱۵۸
ولایت کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کے ارشادات	۱۶۰
پیغمبر کی طرف سے اپنے جانشین کا تقرر	۱۶۱
امام کی عصمت	۱۶۳
امام کی اخلاقی فضیلتیں	۱۶۴
امام کا علم	۱۶۴

چودہ معصومؑ ــــــــ ۱۶۴
اہلبیتؑ کی عام سیرت ــــــــ ۱۶۶
حکام سے ائمہؑ کے اختلاف کے اسباب ــــــــ ۱۶۸
اہلبیتؑ کی روش میں استثنار ــــــــ ۱۷۲
امام علی علیہ السلام ــــــــ ۱۷۲
بی بی فاطمہ علیہا السلام ــــــــ ۱۷۸
امام حسن اور امام حسین علیہما السلام ــــــــ ۱۸۰
کیا حسنینؑ کی روش ایک دوسرے سے مختلف تھی؟ ــــــــ ۱۸۴
امام سجاد علیہ السلام ــــــــ ۱۸۸
امام محمد باقر علیہ السلام ــــــــ ۱۸۸
امام جعفر صادق علیہ السلام ــــــــ ۱۸۹
امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ــــــــ ۱۹۱
امام علی رضا علیہ السلام ــــــــ ۱۹۲
امام محمد تقی، امام علی نقی اور امام حسن عسکری علیہم السلام ــــــــ ۱۹۴
امام مہدی علیہ السلام ــــــــ ۱۹۵
پیشوایانِ دین کی روش کا اخلاقی نتیجہ ــــــــ ۱۹۷
معاد ــــــــ ۱۹۸
قیامت، مذاہب اور اقوامِ عالم ــــــــ ۲۰۰
قرآن اور انسان کی دوسری زندگی ــــــــ ۲۰۰
بدن مرتا ہے روح نہیں مرتی ــــــــ ۲۰۲
اسلام کے نقطۂ نظر سے موت کے معنیٰ ــــــــ ۲۰۳
عالم برزخ ــــــــ ۲۰۴

اخلاق

فرض کی شناخت میں اختلاف رائے ــــــــ ۲۰۸
فرض کا پہچاننا ــــــــ ۲۱۰
انسان کا فرض خدا کی نسبت سے ــــــــ ۲۱۱
خدا پرستی ــــــــ ۲۱۲
خود اپنی نسبت انسان کا فریضہ ــــــــ ۲۱۴

جسمانی حفظانِ صحّت ـــــــــ ۲۱۵
صفائی ـــــــــ ۲۱۶
لباس کی صفائی ـــــــــ ۲۱۷
مضمضہ اور مسواک ـــــــــ ۲۱۸
استنشاق ـــــــــ ۲۱۹
روحانی حفظانِ صحّت ـــــــــ ۲۲۰
علم کا حصول ـــــــــ ۲۲۱
اسلام کی نگاہ میں طالبِ علم کی اہمیت ـــــــــ ۲۲۴
استاد کی اہمیت ـــــــــ ۲۲۵
علماء کا احترام ـــــــــ ۲۲۶
استاد اور شاگرد کے فرائض ـــــــــ ۲۲۸
اسلام کی تعلیمات میں دو اہم شاہکار ـــــــــ ۲۲۸
آزادانہ غور و فکر اور اظہارِ حق سے پرہیز ـــــــــ ۲۳۰
اجتہاد و تقلید ـــــــــ ۲۳۲
والدین کی نسبت انسان کا فریضہ ـــــــــ ۲۳۴
والدین کی نافرمانی ـــــــــ ۲۳۵
ماں باپ پر اولاد کے حقوق ـــــــــ ۲۳۶
بزرگوں کا احترام ـــــــــ ۲۳۹
رشتے داروں کے حقوق ـــــــــ ۲۳۹
ہمسایوں کے حقوق ـــــــــ ۲۴۰
غریبوں اور محتاجوں کے بارے میں انسان کا وظیفہ ـــــــــ ۲۴۱
معاشرے کے بارے میں انسان کا وظیفہ ـــــــــ ۲۴۲
عدالت ـــــــــ ۲۴۴
انفرادی عدالت ـــــــــ ۲۴۵
اجتماعی عدالت ـــــــــ ۲۴۵
ظلم و ستم ـــــــــ ۲۴۶
حسن معاشرت ـــــــــ ۲۴۷
لوگوں کو ایذا پہنچانا اور شرارتیں کرنا ـــــــــ ۲۴۹
اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا ـــــــــ ۲۵۰

بُرے لوگوں کی صحبت اختیار کرنا ـــــــــ ۲۵۱
راست گوئی ـــــــــ ۲۵۲
جھوٹ بولنے کے نقصانات ـــــــــ ۲۵۳
غیبت اور افترا ـــــــــ ۲۵۵
لوگوں کے ناموس پر حملہ کرنا ـــــــــ ۲۵۶
عزّتِ نفس اور دیانت داری ـــــــــ ۲۵۷
محتاجوں کی مدد ـــــــــ ۲۵۸
تعاون ـــــــــ ۲۶۰
خیرات اور صدقات ـــــــــ ۲۶۰
سرفروشی ـــــــــ ۲۶۱
بذل وعطا ـــــــــ ۲۶۳
جہاد کے عام مسائل ـــــــــ ۲۶۶
اسلام میں جنگ کے مواقع ـــــــــ ۲۶۸
جہاد اور دفاع سے فرار ـــــــــ ۲۷۰
معاشرے کے داخلی دشمنوں سے جنگ ـــــــــ ۲۷۱
حق کا دفاع ـــــــــ ۲۷۲
قتلِ نفس ـــــــــ ۲۷۳
یتیم کا مال غصب کرنا ـــــــــ ۲۷۳
خدا کی رحمت سے نا امیدی ـــــــــ ۲۷۴
غیظ وغضب ـــــــــ ۲۷۵
رشوت ـــــــــ ۲۷۶
چوری ـــــــــ ۲۷۶
ناپ تول میں کمی کرنا ـــــــــ ۲۷۷
اسلام میں گناہوں کی سزا ـــــــــ ۲۷۸
کام اور ہنر کی اہمیت ـــــــــ ۲۷۸
بیکاری کی مذمت ـــــــــ ۲۸۱
کھیتی باڑی اور اس کے فوائد ـــــــــ ۲۸۲
خود اعتمادی ـــــــــ ۲۸۳
دوسروں کے سہارے پر جینے کے نقصانات ـــــــــ ۲۸۴

احکام

نماز ـــــــ ۲۸۶
واجب نمازیں ـــــــ ۲۸۹
مقدماتِ نماز ـــــــ ۲۸۹
۱۔ طہارت ـــــــ ۲۹۰
نجاستیں ـــــــ ۲۹۰
مطہرات ـــــــ ۲۹۲
وضو اور اس کے احکام ـــــــ ۲۹۴
وضو کا طریقہ ـــــــ ۲۹۴
مبطلاتِ وضو ـــــــ ۲۹۵
غسل ـــــــ ۲۹۶
تیمّم ـــــــ ۲۹۸
تیمّم کا طریقہ ـــــــ ۲۹۸
تیمّم کے احکام ـــــــ ۲۹۹
۲۔ وقت ـــــــ ۲۹۹
۳۔ لباس ـــــــ ۳۰۱
۴۔ مکان ـــــــ ۳۰۲
۵۔ قبلہ ـــــــ ۳۰۳
واجباتِ نماز ـــــــ ۳۰۳
ارکانِ نماز ـــــــ ۳۰۴
نیّت ـــــــ ۳۰۵
تکبیرۃ الاحرام ـــــــ ۳۰۵
قیام ـــــــ ۳۰۶
رکوع ـــــــ ۳۰۶
سجود ـــــــ ۳۰۶
تشہد اور سلام ـــــــ ۳۰۷
نمازِ آیات ـــــــ ۳۰۸
مسافر کی نماز ـــــــ ۳۰۹

نمازِ جماعت ۳۱۰
نماز جماعت کی شرطیں ۳۱۰
نمازِ جماعت کے احکام ۳۱۱
روزہ ۳۱۱
رمضان خدا کا مہینہ ہے ۳۱۳
روزہ تقویٰ کا موجب ہے ۳۱۴
مبطلاتِ روزہ ۳۱۵
بیع ۳۱۶
بیع کا لزوم ۳۱۶
خیارِ مجلس ۳۱۷
خیارِ غبن ۳۱۷
خیارِ عیب ۳۱۷
خیارِ حیوان ۳۱۸
خیارِ شرط ۳۱۸
نقد، اُدھار، سَلَم اور وعدہ ۳۱۸
اقرار اور اس کی اہمیت ۳۱۹
اقرار کے معنیٰ اور شرطیں ۳۲۰
اشیاء خورد و نوش ۳۲۰
حیوانات ۳۲۰
دریائی حیوانات ۳۲۱
صحرائی حیوانات ۳۲۱
فضائی حیوانات ۳۲۱
جامدات ۳۲۲
مایعات ۳۲۳
غصب ۳۲۵
شفعہ ۳۲۸
بنجر زمین کو آباد کرنا ۳۲۹
لُقطہ ۳۳۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اسلام آسمانی مذاہب میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل مذہب ہے۔ یہ ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کی تمام جسمانی اور روحانی ضرورتوں کا پورا پورا خیال رکھتا ہے اور اس کی تعلیمات کی کرنیں انسان کے تمام تر وجود کو منوّر کرتی ہیں۔

اسلام نے انسان کو اس کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ایسا راستہ دکھایا ہے جس میں کوئی الجھاؤ، انحراف یا ٹیڑھا پن نہیں ہے۔ یہ ایک بالکل صاف اور سیدھا راستہ ہے۔

یَھْدِیْ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ

قرآن مجید لوگوں کی رہنمائی سچائی کی جانب کرتا ہے اور انھیں ایک ایسا راستہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھا اور ہر قسم کے تضاد اور تناقض سے پاک ہے۔ (سورۂ احقاف۔ آیت ۳۰)

بالفاظِ دیگر اس کی جانب مائل ہو کر انسان زندگی کے طوفان سے اپنی جان صحیح و سالم بچا لے جاتا ہے، اسے اختیار کر کے کائنات کے کارخانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور دنیا کی عام اور ارتقائی حرکت کے ساتھ اس کا کوئی تضاد، اختلاف یا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی بدولت وہ ہستیِ لامتناہی کی عظمت کا شعور اور عظیم انسانی ذمّے داریوں نیز اجتماعی زندگی کی سربلندی کی خاطر ایثار کے جذبے سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔

اسلام انسان کی تمام حرکات و سکنات اور طور طریقوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اس نے زمان و مکان کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس کے لیے مناسب احکام اور ضوابط وضع کیے ہیں۔ چنانچہ اسلامی تعلیمات میں تبلیغ احکام میں کسی موضوع کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہر دَور میں گوناگوں انفرادی، اجتماعی، اقتصادی، عدالتی، سیاسی، ذہنی، نفسیاتی، فکری اور فلسفیانہ مسائل و مشکلات کا حل پیش کرتا ہے کیونکہ اس میں تمام اصلاحی مسالک اور نظام ہائے عمل کی خوبیاں جمع ہیں۔

عظیم مفکّر اور دانشور لارڈ ہیڈلے کہتا ہے:

"میرا پختہ ایمان ہے کہ اگر یورپ کے سب سے بڑے مفکّر اور اسکالر ایک ایسا مذہب تلاش کرنے کے لیے جمع ہوں جس کی بنیاد آفاقی منطق کے اصولوں اور عام احساسات پر رکھی گئی ہو تو وہ یقیناً اتّفاقِ رائے سے "دین اسلام" ہی کو اختیار کریں گے کیونکہ اس دین کی بڑائی اور ساتھ ہی ساتھ اس کے احکام کی سادگی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ دین جو ایک بہت بڑی نعمت ہے سرتاپا منطق اور دلیل پر مبنی ہے اور رُوح و بدن کے

آرام کا خیال رکھتے ہوئے رُوحانی ترقی کی جانب خاص توجہ دیتا ہے...... اسلام کی سادگی اور اس کی شان وشوکت کو سمجھ لینے کے بعد میری مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک تنگ وتاریک سرنگ سے نکل کر ایک وسیع اور روشن مقام پر آپہنچا ہو۔"

(اسلام، از جنرل ڈمیرھان)

اسلام میں دین اور دنیا باہم مربوط ہیں، چنانچہ ان کو الگ الگ کرنا اسلام کی نظر میں ایک بہت بڑی خطا ہے۔ لہذا ہر مسلمان فرد پر لازم ہے کہ وہ ان کو ساتھ ساتھ لے کر چلے کیونکہ اسلام کے مطابق روح وبدن اور دنیا وآخرت کو مساوی حیثیت دینا ہی سعادت کا موجب ہے۔

اسلام انسان کو نیک کاموں کی ترغیب دینے، حقیقی تہذیب، قوانینِ صحّت اور تعلیم وتربیت کے اصولوں کی نشان دہی کرنے نیز علم ودانش کے حصول کو ضروری قرار دینے کے معاملات میں بے نظیر ہے۔

اسلام نے اخلاقی فضائل کے حصول پر بہت زور دیا ہے۔ ایک حقیقی مسلمان اور کامل انسان وہی ہے جو اخلاقی کمالات اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہو۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ اسلام کی خصوصیات اور خوبیوں کا ایک اجمالی خاکہ ہے۔ یہی مطالب زیرِ نظر کتاب میں نسبتاً زیادہ وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب دین اسلام کا خلاصہ ہے۔

ایک عرصے سے ایک ایسی جامع لیکن مختصر کتاب کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں اسلام کی زندۂ جاوید تعلیمات کا نچوڑ پیش کیا گیا ہو تاکہ وہ لوگ جو ان تعلیمات سے بے بہرہ ہیں، وہ اس دین کے اصول اور احکام سے واقف ہوسکیں۔ اِس ضرورت کو دین کا درد رکھنے والے وہ حضرات بخوبی سمجھ

سکتے ہیں جنھوں نے چند سال یورپ اور امریکہ میں بسر کیے ہیں اور بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں اسلام اور بالخصوص مکتبِ اہلِ بیتؑ کے بارے میں کتابوں کی کتنی کمی ہے۔

بحمد اللہ کہ اُستاد علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ نوّر اللہ مرقدہٗ نے زیرِ نظر کتاب تصنیف فرما کر اس ضرورت کو ایک حد تک پورا کر دیا ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے اور جامعہ تعلیماتِ اسلامی اس کا اُردو ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔

امّید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو جِلا بخشنے میں ممد و معاون ثابت ہو گی اور انھیں اِس جانب راغب کرے گی کہ وہ اسلام کو ایک عظیم تخلیقی مکتبِ فکر کی حیثیت سے پہچانیں، اس سے بیش از پیش محبت کریں اور اس کی خاطر ہر ممکن قربانیاں دیں۔

یوسف علی نفسی نجفی

بسم الله الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا
لَمْ يَسْبِقْ اِلَيْهِ السَّابِقُوْنَ
وَالصَّلاۃُ علیٰ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ
صَلاۃً لَمْ يَفُزْبِهَا
الْفَائِزُوْنَ

دین

دین اعتقادی، عملی اور اخلاقی احکام کے ایک سلسلے کا نام ہے جسے انبیاءؑ خداوند تعالیٰ کی طرف سے بنی نوع انسان کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے لائے ہیں۔

ان عقائد پر یقین رکھنا اور ان احکام کے مطابق عمل کرنا دونوں جہان میں انسان کی خوش بختی کا موجب ہے لہذا اگر ہم دیندار ہوں اور خدا و رسولؐ کے احکام کی پیروی کریں تو ہم اس فانی دنیا میں بھی خوش نصیب ہوں گے اور اگلی دنیا کی جاودانی اور لامحدود زندگی میں بھی خوش قسمتی سے ہم کنار ہوں گے۔

جیساکہ ہم جانتے ہیں خوش قسمت اور سعادت مند وہ شخص ہوتا ہے جس کی زندگی کا ایک صحیح مقصد ہو اور وہ شک وشبہ اور گمراہی میں دن نہ گزارے، اس کے اخلاق اچھے اور پسندیدہ ہوں، وہ نیک کام کرے اور بکھیڑوں سے

بھری ہوئی دنیاوی زندگی میں اس کا دل مطمئن، قوی اور آسودہ ہو۔

خدا کا دین ایسی ہی سعادت اور خوش نصیبی کی جانب ہماری رہنمائی کرتا ہے اور دین کے بغیر سعادت اور خوش نصیبی کے حصول کا کوئی امکان نہیں۔ دینی عقائد خفیہ پولیس کی طرح انسان کے دل میں سکونت پذیر ہوتے ہیں اور ہر حالت میں اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ اُسے اخلاقی برائیوں سے باز رکھتے ہیں اور اچھائیوں کی ترغیب دیتے ہیں۔

ایمان، وہ سب سے زیادہ قوی اور محکم سہارا ہے جو زندگی کے اُتار چڑھاؤ میں انسان کو ہرگز پریشانی اور رنج سے دوچار نہیں ہونے دیتا۔ خدا پرست لوگ مشکل سے مشکل حالات میں بھی ہمّت نہیں ہارتے اور اپنے آپ میں کمتری کا احساس نہیں کرتے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی لامحدود قدرت سے وابستہ سمجھتے ہیں، تمام حالات میں اُسے یاد کرتے ہیں اور اس کی پناہ میں رہتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا دل مطمئن، قوی اور آسودہ رہتا ہے۔

دین ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم پسندیدہ اخلاق اپنائیں اور جہاں تک ممکن ہو اچھے اور نیک کام کریں۔

لہذا دین کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے :

۱ ـــــ عقائد

۲ ـــــ اخلاق

۳ ـــــ احکام

اب ہم اس مجمل بیان کی تفصیل سپردِ قلم کرتے ہیں :

۱۔ عقائد

اگر ہم اپنی عقل اور قوّتِ تمیز پر زور ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بات خارج از امکان ہے کہ یہ کائنات اپنے حیرت انگیز نظام کے ساتھ خود بخود وجود میں آگئی ہو اور اس بات کا بھی امکان نہیں کہ کائنات کا یہ عجیب وغریب نظام کسی چلانے والے کے بغیر چل رہا ہو۔ یقیناً کوئی ایسا پیدا کرنے والا ہے جس نے اپنی قدرت اور لامحدود علم کے ذریعے اس عظیم الشان دنیا کو پیدا کیا ہے، وہی اپنے محکم اور ناقابلِ تغیّر قوانین کے ذریعے اسے ایک دقیق نظام کے تحت چلا رہا ہے۔ کوئی چیز زائد اور بیکار پیدا نہیں کی گئی اور جو قادرِ مطلق کائنات پر حکومت کر رہا ہے کوئی موجود بھی اس کے دائرۂ اختیار سے باہر نہیں ہے۔

کیا اس بات پر یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ مہربان خدا جو اپنی تمام مخلوق کو اپنے لطف وکرم سے نوازتا ہے، وہ اس انسان کو جو اس کی تخلیق کا شاہکار ہے اس کے حال پر چھوڑ دے اور اس پوری نوع انسانی کو جس میں سے بیشتر ہوا وہوس کا شکار ہوکر گمراہی اور بدبختی کے گڑھے میں گرجاتی ہے خود اس کی عقل کے سپرد کردے ؟ اس سوال کا جواب کچھ کہے بغیر ہی واضح ہے۔

لہذا اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ خدا اپنے اُن پیغمبروں کے ذریعے جو ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے پاک ہیں بنی نوع انسان کے لیے احکام بھیجے تاکہ وہ ان پر عمل کرکے سعادت اور خوش نصیبی کے حق دار بن سکیں۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دینی احکام پر عمل کرنے کے فوائد اس دنیا میں

کھل کر سامنے نہیں آتے، نہ ہی اچھے کام کرنے والوں کو ان کا اَجر ملتا ہے اور نہ ہی شریر اور ظالم اشخاص اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک اور دنیا بھی ہونی چاہیے کہ جہاں لوگوں کے اعمال کا پورا پورا حساب کتاب ہو تاکہ اگر کسی نے کوئی اچھا کام کیا ہو تو اس کا بدلہ اسے ملے اور اگر کسی نے برا کام کیا ہو تو اس کی سزا بھی وہ بھگتے۔ دین لوگوں کو اسی طرح کے دیگر صحیح اعتقادات کی جانب راغب کرتا ہے، جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔ نیز وہ انھیں جہالت اور نادانی سے بچنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔

۲- اخلاق

دین ہمیں ہدایت کرتا ہے کہ ہم زندگی میں اچھّی صفات اختیار کریں، نیک عادتیں اپنائیں اور اپنے آپ کو اچھائیوں اور خوبیوں سے آراستہ کریں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے فرض کو پہچانیں، انسانوں سے محبت کریں اور ان کی بہتری چاہیں۔ مہربان، باوفا، خوش خلق، ہنس مُکھ اور انصاف پسند ہوں۔ اپنے حق کا دفاع کریں اور اپنی حدود اور حقوق سے تجاوز نہ کریں۔ لوگوں کے مال، جان اور عزّت آبرو پر ظلم روا نہ رکھیں۔ علم و دانش کے حصول کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دیں اور زندگی کے تمام امور میں عدل اور اعتدال کو اپنا معمول بنالیں۔

۳- احکام

دین ہمیں حکم دیتا ہے کہ زندگی میں وہ کام کریں جو خُود ہمارے لیے اور

معاشرے کے لیے مفید ہوں اور ایسے کاموں سے باز رہیں جن کا نتیجہ خرابی اور بربادی کی صورت میں نکلتا ہو۔ وہ ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ پروردگارِ عالم کی پرستش اور عبادت کے طور پر نماز، روزہ اور انھیں جیسے اور اعمال بجالائیں جو بندگی اور فرماں برداری کی علامت ہیں۔

یہ ہیں وہ احکام اور ضوابط جو دین لایا ہے اور جن کی جانب اس نے ہمیں دعوت دی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے، ان میں سے کچھ اعتقادی، کچھ اخلاقی، اور کچھ عملی ہیں۔

دین کی ضرورت

پہلا سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا دین سے اور اللہ کو پہچاننے سے کیا تعلق ہے؟ کیا معاشرہ دین سے بے نیاز ہو کر اور خدا پر ایمان لائے بغیر اپنی انسانی زندگی کو جاری نہیں رکھ سکتا؟ کیا یہ درست نہیں کہ دیندار اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کائنات کے ایک خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اس کی خوشنودی کے لیے مخصوص اعمال بجالاتا ہو؟

ممکن ہے کہ انسان کے وضع کیے ہوئے قوانین کے مطابق معاشرے کے ہر فرد کے فرضِ منصبی اور اس کے نفع اور نقصان کا تعیّن ہو جائے۔ اس صورت میں انسانی قوانین دین کی جگہ لے لیں گے اور پھر دین کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ تاہم اسلامی احکام اور ضوابط پر تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ دینِ اسلام نے فقط خدا کی حمد و ثنا اور عبادت کا ہی حکم نہیں دیا، بلکہ انسان کے تمام انفرادی و اجتماعی معاملات کے بارے

میں جامع احکام اور مخصوص ضوابط وضع کیے ہیں اور انسانیت کی وسیع و عریض دنیا کا حیرت انگیز مطالعہ کیا ہے، انسان کی ہر انفرادی و اجتماعی حرکت وسکون کے بارے میں مناسب قواعد وضوابط وضع کیے ہیں اور بالآخر انسانی معاشرے کے افراد کی سعادت اور خوش نصیبی کی زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک ضمانت دی ہے۔ ہر انصاف پسند شخص اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ جن قواعد وضوابط نے انسان کے محدود خیالات اور معلومات سے جنم لیا ہے ان میں یہ جامعیت نہیں ہے۔ خُدا نے قرآن مجید میں دینِ اسلام کی تعریف اس انداز میں کی ہے جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند آیات یہاں نقل کرتے ہیں :

"وہ دین جس کی طرف تمام پیغمبروں ؑ نے لوگوں کو دعوت دی، خُدا کی عبادت اور اس کے احکام ماننے سے عبارت ہے مختلف مذاہب کے علماء اگرچہ حق اور باطل کے فرق کو پہچانتے تھے لیکن تعصّب اور دشمنی کی وجہ سے انھوں نے حق کو قبول نہ کیا اور ہر ایک نے اپنا الگ راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں رُوئے زمین پر مختلف مذاہب پیدا ہو گئے۔ درحقیقت لوگوں کے اس گروہ نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا اور خدا جلد ہی انھیں ان کے اعمال کی سزا دے گا۔" (سورۂ آل عمران - آیت ۱۹)

"جو شخص دینِ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کا طالب ہو اور اس کا پیرو بن جائے، اس کا وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نجات پانے والوں میں سے نہ ہو گا۔"

(سورۂ آل عمران - آیت ۸۵)

"اے مسلمانو! دینی امور میں سب کے سب خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کردو اور شیطان کی پیروی نہ کرو جو کہ تمھارا کھلا دشمن ہے اور دین میں کسی چیز کی کمی بیشی نہ کرو۔" (سورۂ بقرہ۔آیت ۲۰۸)

"اے مسلمانو! اگر تم کوئی عہد و پیمان کرو تو اُسے وفا کرو۔ جب تم اپنی قسم پکّی کرلو اور خدا کو اپنا ضامن بنالو تو پھر اپنی قسم نہ توڑو کیونکہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے خُوب واقف ہے۔"

(سورۂ نحل۔آیت ۹۱)

مقصود اس آیت سے یہ ہے کہ جب مسلمان خُدا یا لوگوں کے ساتھ کوئی وعدہ کرے تو اسے پُورا کرے اور عہد شکنی نہ کرے۔

"اے رسول ص! لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھّی اچھّی نصیحتوں کے ذریعے بلاؤ۔ اگر بحث و مباحثہ بھی کرو تو ایسے طریقے سے کرو جو سب سے اچھّا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک گئے، انھیں تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں سے بھی خوب واقف ہے۔"

(سورہ نحل۔آیت ۱۲۵)

اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسان کو چاہیے کہ دین کی پیش رفت کی خاطر ہر شخص سے اس کے فہم کے مطابق اور ایسے طریقے سے بات کرے جو اس کے لیے مفید ہو۔ اگر دلائل اور وعظ و نصیحت کے ذریعے کسی کی رہنمائی نہ کرسکے تو اسے چاہیے کہ بحث و مباحثے کے ذریعے جو کسی بات کے ثابت کرنے کا ایک طریقہ ہے، اس شخص کو حق کی جانب دعوت دے۔

"اے لوگو! جب قرآن پڑھا جائے تو پورے دھیان سے سُن کر

سمجھنے کی کوشش کرو اور باہم باتیں نہ کرو۔ شاید اسی بہانے خُدا کی رحمت تمھارے شامل حال ہو جائے۔" (سورۂ اعراف۔ آیت ۲۰۴)

"اے با ایمان لوگو! خُدا، پیغمبرؐ اور ان اماموں کے حکم کے مطابق عمل کرو جن کی اطاعت خدا اور پیغمبرؐ نے تم پر واجب کی ہے۔ اگر تم خدا اور قیامت کے دن پر عقیدہ رکھتے ہو تو اپنے اختلافات قرآن اور پیغمبرؐ کے احکام کے مطابق حل کرو۔ یہی طریقہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۵۹)

مراد یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں اختلافات رفع کرنے کا ذریعہ "قرآن مجید" اور "پیغمبرؐ کے ارشادات" کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں اور ہر اختلاف انھیں کی رُو سے حل ہونا چاہیے اور اگر ایک مسلمان "منطق" کے ذریعے اختلافات رفع کرتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ قرآن مجید نے عقل کے فیصلوں کو قبول کیا ہے۔

"اے رسولؐ! یہ بھی آپ پر خدا کی طرف سے مہربانی ہے کہ آپ اتنے نرم دل اور خوش خو ہو گئے۔ اگر آپ تند مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ کب کے آپ کے ارد گرد سے تتّر بتّر ہو گئے ہوتے۔ لہذا آپ ان لوگوں کی لغزشوں سے درگزر کریں، ان کے لیے خدا سے مغفرت کی دعا مانگیں اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کریں مگر جب کسی کام کے بارے میں ٹھان لیں تو خدا پر ہی بھروسہ رکھیں، کیونکہ جو لوگ خدا پر بھروسہ کرتے ہیں خدا انھیں دوست رکھتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔"

(سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۱۵۹)

چونکہ لوگوں سے اچھی طرح سے پیش آنا، ان کی بھلائی کی کوشش کرنا اور ان سے اہم معاملات کے بارے میں مشورہ کرنا اُنس اور محبّت پیدا ہونے کا موجب بنتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں اپنے سردار کی محبّت اور اُلفت کو جگاتے ہیں اس لیے خدا نے مسلمانوں کے گرامی قدر سردار محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو لوگوں سے نیک سلوک کرنے اور ان سے مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ اپنی رائے میں اشتباہ کرنے لگیں اس لیے نبیِّ اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہ مشورہ کر چکنے کے بعد جو فیصلہ وہ خود کریں، اس پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ چونکہ خدا کے ارادے کی کوئی بھی مخالفت نہیں کر سکتا اس لیے تمام کاموں کے سلسلے میں خدا سے لَو لگائیں اور اپنے کام اسی کے سپرد کر دیں۔

خداوند تعالیٰ نے یہودیت اور نصرانیت کے مذاہب کو بھی، جن کی آسمانی کتابیں تورات وانجیل ہیں اور جن میں اجتماعی احکام وضوابط درج ہیں، اسی انداز میں متعارف کرایا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا ہے :

> "تورات اور انجیل جو اس وقت یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس ہیں، وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں کیونکہ تورات میں بہت سے دیوانی اور تعزیری قوانین موجود ہیں اور بظاہر انجیل بھی تورات کی شریعت کی تائید اور تصدیق کرتی ہے۔"

(سورۂ مائدہ - آیت ۴۳-۴۶)

نتیجہ

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں دین وہی طرزِ زندگی ہے جس سے انسان کو مفر نہیں۔ دین

اور ایک اجتماعی قانون میں جو فرق پایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ دین خُدا کی جانب سے ہے اور اجتماعی قانون لوگوں کے خیالات کی پیداوار ہے۔ دُوسرے الفاظ میں دین لوگوں کی اجتماعی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی پرستش و فرماں برداری کو آپس میں جوڑ دیتا ہے لیکن انسانی اجتماعی قوانین میں اس قسم کی مناسبت کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔

دین کے فوائد

جو کچھ اُوپر کہا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ دین فرد اور معاشرے کی اصلاح میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے بلکہ وہ ان کی سعادت اور خوش نصیبی کا واحد ذریعہ ہے۔

جو معاشرہ دین کا پابند نہ ہو وہ حقیقت پسندی اور روشن خیالی سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنے انمول وقت کو گمراہی، ظاہر بینی اور غفلت میں گزار دیتا ہے، عقل کو ٹھکرا کر حیوانوں کی طرح تنگ نظری اور بے عقلی کی زندگی گزارتا ہے، بُرے اخلاق اور گھٹیا کردار اس کا مقدر بن جاتے ہیں اور یوں وہ تمام انسانی خوبیاں کھو بیٹھتا ہے۔ ایسا معاشرہ نہ صرف یہ کہ ابدی سعادت اور حقیقی کمال تک نہیں پہنچ پاتا بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس دنیا کی مختصر اور عارضی زندگی میں بھی اپنی گمراہی کے بُرے اور منحوس نتائج دیکھ لے پھر جلد یا بدیر خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور واضح طور پر سمجھ لے کہ خوش نصیبی کا واحد راستہ دین اور خدا پر ایمان ہے اور بالآخر اپنے کردار پر پشیمان ہو

ایک اور جگہ کلام مجید میں ارشاد ہے:

"جس نے اپنے نفس کو گناہ سے پاک رکھا وہ تو کامیاب ہوا

اور جس نے اسے گناہ کر کے دبا دیا وہ نامراد رہا۔" (سورۂ شمس آیت ۹-۱۰)
یعنی جو شخص اپنے آپ کو آلودگیوں سے محفوظ رکھے، وہ نجات پانے والا ہے اور جو شخص گناہوں سے آلودہ ہو، وہ اپنے مقصد یعنی خوش نصیبی اور نجات تک نہیں پہنچ سکتا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس چیز سے فرد اور معاشرے کی خوش نصیبی اور نجات وابستہ ہے وہ دینی احکام پر عمل کرنا ہے۔ محض دین کا نام لینے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ جو چیز "واقعی قدر و قیمت" رکھتی ہے وہ حقیقت کا دعویٰ نہیں بلکہ خود "حقیقت" ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو لیکن اس کا دل سیاہ، اخلاق پست اور کردار خراب ہو اور پھر وہ خوش بختی کے فرشتے کا بھی انتظار کرے تو وہ اس مریض کی مانند ہے جو ڈاکٹر کا نسخہ بغل میں دبا کر صحّت یاب ہونے کی توقع رکھے۔ پس یہ مسلّمہ امر ہے کہ ایسی سوچ کے ساتھ وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

خداوند تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے:

"باایمان لوگوں (مسلمانوں)، یہودیوں، عیسائیوں اور صابئیوں[1] میں سے جو واقعی خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لے آئے اور نیک کام کرتے رہے انھیں بارگاہِ الٰہی سے اچھا بدلہ ملے گا۔"

(سورۂ بقرہ - آیت ۶۲)

ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ اس آیت کے مضمون کے مطابق جو لوگ

---

[1] جو لوگ مجوس کے مذہب سے یہود کے مذہب کی طرف مائل ہوئے اور مجوسیت و یہودیت کا ملا جلا دین رکھتے ہیں انھیں "صابئی" کہا جاتا ہے۔

خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال بجالاتے ہیں، اگر وہ تمام یا بعض پیغمبروںؑ کو نہ بھی مانیں تب بھی نجات کے حق دار ہوں گے، تاہم یاد رکھنا چاہیے کہ قرآنِ مجید میں خدا نے ان لوگوں کو جو تمام یا بعض پیغمبروںؑ پر ایمان نہیں رکھتے کافر قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

"جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبروںؑ کے بارے میں کفر کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ خدا اور اس کے پیغمبروںؑ کے درمیان جُدائی ڈال دیں، پھر یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پیغمبروںؑ پر ایمان لائے ہیں اور بعض دوسروں کے بارے میں کافر ہیں (یعنی ان کے منکر ہیں) گویا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اس کفر اور ایمان کے درمیان ایک راستہ اختیار کریں لیکن درحقیقت وہ کافر ہیں۔" (مثلاً یہودی جو حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کے منکر ہیں اور عیسائی جو حضرت محمدؐ کو نہیں مانتے)۔ (سورۂ نساء - آیت ۱۵۰-۱۵۱)

لہٰذا وہی اشخاص اپنے ایمان سے فائدہ اُٹھاسکیں گے جو سب پیغمبروںؑ کو مانتے ہوں گے اور جن کے اعمال بھی نیک ہوں گے۔

انسان کی اجتماعی زندگی

اگر ہم ان اسباب اور عوامل کا مطالعہ کریں جن کی بدولت گزشتہ زمانوں میں انسانی معاشرے وجود میں آئے ہیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان اپنی زندگی میں سعادت اور کامرانی کے علاوہ کسی چیز کی خواہش یا جستجو نہیں کرتا۔ بلاشبہ اس سعادت کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک زندگی کے تمام وسائل کو مکمّل طور پر بروئے کار نہ لایا جائے۔

دوسری طرف انسان اپنی خداداد ذہانت کی بدولت یہ بات جانتا ہے کہ نہ وہ تن تنہا اپنی تمام ضروریات پوری کرسکتا ہے اور نہ ہی اسے وہ آرام اور خوش نصیبی حاصل ہوسکتی ہے جس کا وہ خواہش مند ہے۔ چونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اکیلا زندگی کی مشکلات پر قابو پاکر کمال حاصل نہیں کرسکتا لہذا وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اجتماعی زندگی کا سہارا لیتا ہے، دُوسرے افراد سے اشتراکِ عمل کو اپنے مقصد کے حصول کا آسان ترین ذریعہ سمجھتا ہے اور ان سے مِل جل کر زندگی کے وسائل حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ عمل یوں انجام پاتا ہے کہ ہر شخص ان وسائل کی کچھ مقدار مہیّا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے اور اس کا اہتمام کرتا ہے، پھر سبھی افراد اپنی اپنی محنت کا نتیجہ ایک جگہ جمع کردیتے ہیں، اس کے بعد ہر شخص اپنی محنت اور سماجی حیثیت کے مطابق اس میں سے اپنا حصّہ لے لیتا ہے اور اسے استعمال میں لاکر اپنی زندگی کا کاروبار چلاتا ہے۔

یوں اپنی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے انسان اپنے ہم جنسوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اور ان کی مدد کے ساتھ کام کرتا ہے یعنی درحقیقت سبھی ایک دوسرے کی خاطر محنت کرتے ہیں، اپنی اپنی محنت کے نتائج ایک جگہ جمع کردیتے ہیں اور پھر ہر شخص اپنی محنت اور حیثیت کے مطابق حصہ لے لیتا ہے۔

مُعاشرے کے لیے قواعد وضوابط کی ضرورت

چونکہ افراد کی محنت کا حاصل ایک جگہ اکٹھا کردیا جاتا ہے اور پھر ہر شخص اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے لہذا قدرتی طور پر اس دائمی ارتباط

سے منافع کے بارے میں باہمی جھگڑا اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ مادّی فوائد کے سلسلے میں عموماً اختلافات اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور لوگوں کا باہمی خلوص زائل ہوجاتا ہے۔ افراد کے خلوص کو قائم رکھنے کے لیے مُعاشرے کو کئی ایک قواعد و ضوابط کی ضرورت ہے جن پر عمل پیرا ہوکر بدنظمی اور افراتفری پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اگر معاشرے کا انتظام چلانے کے لیے قواعد وضوابط اور قوانین نہ ہوں تو ایسی افراتفری پیدا ہوتی ہے کہ انسانی معاشرہ ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

بلاشبہ یہ قوانین تہذیبوں کے فرق، معاشروں کی سوچ اور ان کے حکومتی اداروں کے تفاوت کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں تاہم کسی حالت میں بھی کوئی معاشرہ ایسی رسوم اور قواعد وضوابط سے بے نیاز نہیں ہوسکتا جن کا اس کے افراد کی اکثریت احترام کرتی ہو۔ عالمِ اِنسانیت کی تاریخ میں کبھی بھی کوئی ایسا معاشرہ وجود میں نہیں آیا کہ جس کے کوئی مشترکہ آداب، رسوم اور قواعد وضوابط نہ ہوں۔

قواعد وضوابط کے معاملے میں انسان آزاد ہیں

چُونکہ انسان اپنے تمام کام اپنے اختیار اور انتخاب سے انجام دیتا ہے اِس لیے وہ اپنے اعمال میں ایک قسم کی آزادی محسوس کرتا ہے لیکن وہ اس آزادی کو مطلق یعنی کسی شرط کے بغیر سمجھتے ہوئے ہر طرح کی بندش سے بچنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اسے اپنی خواہشات کی تکمیل میں کسی رکاوٹ یا محرومی کا سامنا کرنا پڑے تو اُسے دکھ ہوتا ہے اور بالآخر

جب کبھی کوئی رکاوٹ پیش آئے تو وہ اپنے اندر ایک خاص بوجھ اور مایوسی محسوس کرتا ہے۔ لہذا اجتماعی ضوابط خواہ کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں، وہ انسان پر کچھ پابندیاں عائد کرتے ہیں اِس لیے وہ اس کی آزادی پسند طبیعت کے خلاف ہوتے ہیں۔

دوسری جانب وہ یہ بات بھی سمجھتا ہے کہ اگر وہ معاشرے اور اس کے نظم وضبط کی بقاء کے لیے ان قوانین کے مقابلے میں اپنی آزادی کی کچھ مقدار سے دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوگا تو ایسی افراتفری پیدا ہوگی جو یکایک اس کی تمام آزادی اور آرام کو نیست و نابود کردے گی کیونکہ اگر وہ کِسی دوسرے شخص کے ہاتھ سے روٹی کا ایک لقمہ چھینے گا تو دوسرے بھی بلاشبہ خود اس سے کئی ایک لقمے چھین لیں گے یعنی اگر وہ کِسی پر ظلم کرے گا تو اس پر بھی ظلم کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی آزادی کی کچھ مقدار محفوظ رکھنے کے لیے اس کی باقیماندہ مقدار سے دست بردار ہوجاتا ہے اور یہ امر مجبوری اجتماعی قواعد وضوابط کا احترام کرتا ہے۔

قوانین کے نفاذ کا کمزور پہلو

جو کچھ اُوپر کہا گیا ہے، اس کے مطابق انسان کی آزادی پسند طبیعت اور اجتماعی قوانین کے مابین ایک قسم کا تضاد اور اختلاف موجود ہے۔ یوں سمجھیے کہ اجتماعی قوانین ایک بیڑی کی مانند ہیں جو انسان کے پاؤں میں ڈال دی گئی ہے لہذا اس کی شدید خواہش ہے کہ اس بیڑی کو توڑ کر پھینک دے اور اس سے نجات حاصل کرے۔ یہ صورتِ حال اجتماعی

قوانین کے لیے ایک مستقل اور عظیم خطرہ ہے جو اُن کی بُنیادوں کو متزلزل کردیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عملی قوانین اور فرائض کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ان کی خلاف ورزی کی سزا کے لیے بھی کچھ قوانین وضع کیے جاتے ہیں جو لوگوں کو خوف دلاکر انھیں خلاف ورزی سے باز رکھتے ہیں اور قانون کی پابندی پر راغب کرنے کے لیے اجر اور انعام کی امّید دلاتے ہیں۔ تاہم اس بات سے قطعاً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ چیزیں (یعنی سزا کا خوف اور جزا حاصل کرنے کا شوق) ایک حد تک ہی قانون کے اجراء میں مدد دیتی ہیں، وہ نہ تو خلاف ورزیوں کا پورا پورا سدِّ باب کرسکتی ہیں اور نہ ہی قانون کی مکمل حکمرانی کی حفاظت کرسکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعزیری قوانین میں بھی دوسرے قوانین کی طرح خرابی پیدا ہوجاتی ہے، ان کی بھی خلاف ورزی کی جاسکتی ہے اور انھیں آزادی پسند لوگوں کی طبیعت سے ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا ہے کیونکہ با اثر لوگ کسی خوف وخطر کے بغیر ان کی علانیہ مخالفت کرتے ہیں یا اپنا اثر ورسوخ استعمال کرکے عدالتی اور انتظامی محکموں کو اپنا ہمنوا بننے پر مجبور کردیتے ہیں۔

جو لوگ کافی اثر ورسوخ اور طاقت نہیں رکھتے وہ معاشرے کے منتظمین کی لاپروائی یا کمزوری سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے چوری چھپے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں - وہ رشوت اور سفارش کے ذریعے یا قانون نافذ کرنے والوں سے دوستی اور رشتہ داری کی بدولت اپنا کام نکال لیتے ہیں اور نتیجے کے طور پر معاشرے کے پہیّے کو اس کے محور سے ہٹاکر ناکارہ بنادیتے ہیں۔

جو کچھ اُوپر کہا گیا ہے، اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ ہم ہر روز مختلف

مُعاشروں میں قانون شکنی کی ہزاروں مثالیں دیکھتے ہیں۔

قانون کی کمزوری کا اصلی سرچشمہ

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس خطرے کا سرچشمہ کہاں ہے؟ انسان کی سرکش اور آزادی پسند طبیعت کو کس طرح رام کیا جاسکتا ہے؟ تاکہ قانون شکنی کا سدِّباب ہو سکے۔

اِس خطرے کا وہ سرچشمہ کہ جو معاشرے کے جسم میں خرابی پھیلانے کا سب سے بڑا سبب ہے اور قوانین بھی اس کا سدِّباب نہیں کر سکتے یہ ہے کہ وہ عام معاشرتی قواعد جو قانون کو وجود میں لاتے ہیں اُن کی نگاہ افراد کے مادّی پہلو پر ہوتی ہے اور وہ ان کی رُوحانی خاصیتوں اور اندرونی جبلّتوں کی جانب کوئی توجّہ نہیں دیتے۔ ان کا واحد مقصد لوگوں کے اعمال میں ہم آہنگی، نظم وضبط اور توازن پیدا کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ اعمال اس انداز سے انجام پائیں کہ اس کے نتیجے میں کوئی اختلاف اور کشمکش پیدا نہ ہو۔

جو چیز اجتماعی قانون چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے مفردات پر عمل کیا جائے اور وہ معاشرے کو اپنے قابو میں رکھے۔ اسے لوگوں کی اندرونی صفات اور احساسات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، جو کہ ان کے اعمال کے اصلی محرک اور قوانین کے داخلی دشمن ہوتے ہیں۔ حالانکہ اگر انسان کی آزادی پسند طبیعت اور سینکڑوں دوسری جبلّتوں (مثلاً خود غرضی اور شہوت پرستی جو کہ تمام خرابیوں کی جڑ ہیں) کی طرف توجہ نہ دی جائے تو معاشرے میں انتشار اور بدنظمی پیدا ہوتی ہے اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی جاتی ہے کیونکہ تمام قوانین، زبردست باغیوں کے حملوں اور زبردست چوروں کے شب خون سے جو

انھیں جبلّتوں سے جنم لیتے ہیں معرضِ خطر میں پڑجاتے ہیں ۔ لہٰذا کوئی بھی عام قانون خرابیوں کا سدِّ باب اور اختلافات کی روک تھام نہیں کرسکتا ۔

اجتماعی قوانین پر دین کی بالادستی

اجتماعی قانون کی حفاظت کے لیے معاشرے کا آخری حربہ تعزیری قوانین وضع کرنا اور نگران مقرر کرنا ہے ۔ تاہم جیسے اُوپر کہا گیا ہے، تعزیری قوانین اور پولیس کے ذریعے یہ ممکن نہیں کہ انسان کی سرکش طبیعت اور دوسری باغی جبلّتوں پر قابو پالیا جائے تاکہ اجتماعی قوانین پر عمل درآمد ہوسکے ۔

دین بھی انسانی قوانین کی طرح انتظامات کی حفاظت کی خاطر نگران مقرر کرتا ہے اور سرکشوں اور قانون شکنی کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے تعزیری قوانین وضع کرتا ہے ۔ تاہم اس کے علاوہ اسے اور بھی ایسے قوی وسائل میسّر ہیں کہ جن کے ذریعے وہ ہر مخالف قوت کو مغلوب کرلیتا ہے اور اُسے توڑ دیتا ہے ۔

(۱) دین انسان کی اجتماعی زندگی کا خدا سے جو تعلق قائم کرتا ہے اس کی رُو سے وہ انسان کو تمام انفرادی و اجتماعی اعمال اور حرکات وسکنات میں خدا کے سامنے جواب دہ گردانتا ہے کیونکہ خدا اپنی لامحدود قدرت اور عِلم کے ذریعے انسان کو ہر جانب سے گھیرے ہوئے ہے ۔ انسان جو کچھ بھی سوچے اور جو بھید بھی اس کے دل میں ہو خُدا اس سے پوری طرح آگاہ ہے، اور کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے ۔

دین انسان کی نگہداشت کی باگ ڈور ظاہری نگران کے علاوہ ایک باطنی نگران کے سپرد بھی کرتا ہے جو اپنے کام میں ہرگز لاپروائی نہیں برتتا

اور اس کی دی ہوئی سزا سے بچ نکلنا ممکن نہیں جیساکہ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

"جو کچھ بھی لوگ کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ کیے ہوئے ہے"۔
(سورۂ انفال۔آیت ۴۷)

نیز فرماتا ہے :

"چاہے تم جہاں کہیں رہو وہ تمھارے ساتھ ہے"۔
(سورۂ حدید۔آیت ۴)

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے :

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمھارا پروردگار ان کے اعمال کا بھرپور بدلہ دے گا"۔ (سورۂ ہودؑ۔آیت ۱۱۱)

خداوند تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے :

"بے شک خدا تمھارا نگہبان ہے"۔ (سورۂ نساء۔آیت ۱)

اگر ہم ایک ایسے شخص کا جو قانون کے دائرے میں رہ رہا ہو، کسی ایسے شخص سے مقابلہ کریں جو دین کے دائرے میں زندگی بسر کر رہا ہو تو دین کی بالادستی اور برتری ہم پر مکمل طور پر واضح ہو جائے گی کیونکہ جس مُعاشرے کے تمام افراد دیندار ہوں اور اپنے دینی فرائض انجام دیتے ہوں چُونکہ وہ ہر حالت میں یہ سمجھتے ہیں کہ خدا انھیں دیکھ رہا ہے ، اس لیے وہ ایک دوسرے کی برائی کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے لہٰذا جو عام افراد اس قسم کے ماحول میں رہتے ہیں ان کے لیے ایک دوسرے کے ہاتھ اور زبان سے آسودہ رہنا سہل ہے حتّیٰ کہ وہ فکر و خیال کے معاملے میں بھی محفوظ رہتے ہیں ، جب کہ دنیاوی قوانین میں اس قسم کی آسودگی کا کوئی وجود نہیں۔

دین انسان کو بدظنی سے بھی منع فرماتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے ہوا ہے:

"اے ایمان والو! بہت زیادہ گمان کرنے سے اجتناب کرو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ ہے اور ایک دوسرے کے حال کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔" (سورۂ حجرات۔ آیت ۱۲)

انسان دینی ماحول میں مکمل طور پر آسودہ رہتا ہے، اپنی زندگی خوشی اور آرام سے بسر کرتا ہے اور ابدی سعادت حاصل کرتا ہے۔ تاہم جس ماحول میں فقط انسانی قانون کی حکومت ہو، وہاں صورت یہ ہوتی ہے کہ جب ایک شخص یہ دیکھتا ہے کہ پولیس اس پر نظر رکھے ہوئے ہے تو وہ قانون شکنی سے باز رہتا ہے ورنہ عین ممکن ہوتا ہے کہ وہ کوئی بھی خلافِ قانون حرکت کر گزرے۔

ہر دیندار شخص دین کی رہنمائی کی بدولت اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ اس کی زندگی فانی دنیا میں چند روزہ قیام تک محدود نہیں بلکہ ابھی اُسے لامحدود زندگی گزارنا ہے کہ جو موت کی وجہ سے ختم نہیں ہوتی۔ نیز اس کے لیے ابدی خوش نصیبی اور راحت حاصل کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ان دینی احکام کی پیروی کرے جو خدا نے اپنے پیغمبروںؑ کے ذریعے بھیجے ہیں۔ چونکہ وہ جانتا ہے کہ دینی احکام اس دانا و بینا اور صاحبِ قدرت پروردگار کی جانب سے ہیں کہ جس پر انسان کا ظاہر اور باطن پوری طرح عیاں ہے اس لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ وہ چھپ چھپا کر کوئی ایسا کام کرے جو خدا کے احکام کی نافرمانی پر مبنی ہو اور یہ سمجھے کہ میں اس فعل کے لیے اس قادرِ مطلق کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔

۲ ہر دیندار شخص اپنے دینی عقائد کے مطابق یہ بھی جانتا ہے کہ اگر وہ دین کے احکام بجالاتا ہے تو اپنے پروردگار کی اطاعت کرتا ہے اور خدا کی مہربانی اور عنایت سے اسے اپنے عمل کا نیک بدلہ ملے گا لہذا ہر اطاعت جو وہ بجالاتا ہے، درحقیقت ایک معاملہ اور لین دین ہے جو وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے کیونکہ وہ برضا ورغبت اپنی آزادی کے کچھ حصّے سے دست بردار ہوتا ہے اور اس کے بدلے میں خداوند تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور اس کا نیک اجر پاتا ہے۔

ایک دیندار شخص دینی قوانین اور احکام کی پیروی کر کے بے حد خوشی کے ساتھ لین دین میں مصروف ہوتا ہے۔ وہ اپنی آزادی میں سے جو کچھ خرچ کرتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ منافع حاصل کرتا ہے۔ وہ ایک مال بیچتا ہے اور اس سے بہتر مال خرید کر اس کی جگہ رکھتا ہے لیکن جو شخص دین کا پابند نہ ہو، چونکہ وہ قواعد وضوابط اور قانون کی پیروی کرنے کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھتا ہے اور آزادی کے کچھ حصے سے دست بردار ہونے سے اس کی آزادی پسند طبیعت کو دُکھ پہنچتا ہے اس لیے وہ موقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ اس بیڑی کو توڑ دے اور آزادی حاصل کر لے۔

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب ہو گا کہ دین اور قانون کے مابین کچھ اور معاملات میں بھی فرق ہے۔ دیندار لوگ اپنی پسند سے گناہ سے پرہیز کرتے ہیں جب کہ عام قانون کے پیرو فقط خوف کی وجہ سے جُرم نہیں کرتے۔ دین دیندار لوگوں کے تمام اعضاء پر حکومت کرتا ہے جب کہ قانون کی حکمرانی فقط ہاتھوں اور پیروں پر ہوتی ہے۔ دین ظاہر اور پوشیدہ دونوں حالتوں میں حکم دیتا ہے جب کہ قانون کا حکم فقط ظاہرا طور پر چلتا ہے۔ دین کی حیثیت

فقط نگران کی ہی نہیں کہ جو بُرے کاموں سے روکتا ہے بلکہ یہ ایک "اُستاد" بھی ہے جو انسان کو فضائل اور کمالات سکھاتا ہے لیکن انسانی قانون کی حیثیت ایک "پولیس مین" سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

قانون سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے، اگر اسے ایک اکائی تصور کیا جائے تو دین سے حاصل ہونے والا فائدہ اس کے مقابلے میں ہزارہا گنا زیادہ ہے۔ پس جو لوگ دین کو تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور قانون سے امّید باندھتے ہیں وہ اس شخص کی مانند ہیں جو اپنا اصلی پاؤں اپنے ہاتھ سے کاٹ دے اور اس کی بجائے مصنوعی پاؤں لگالے۔

نتیجہ

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ دین انسانی معاشرے کو منظّم کرنے کا بہترین طریقہ ہے اور ہر دوسرے طریقے سے بہتر طور پر لوگوں کو اجتماعی قوانین پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔

قوموں کی چارہ جوئی

اگرچہ دنیا کے پس ماندہ ممالک نے جنھیں گزشتہ ایک صدی میں ترقّی اور عُروج کا خیال آیا ہے، اجتماعی طرزِ حکومت کو اپنایا ہے لیکن چونکہ انھوں نے قانون کے کمزور نقطے کی جانب توجہ نہیں دی اور دین کی قوّت سے فائدہ نہیں اٹھایا اس لیے ان کے حالات خراب ہوگئے ہیں اور ان کی زندگی کا ماحول وحشی پن کا نمونہ بن گیا ہے۔

ان کے مقابلے میں دنیا کی ترقی یافتہ اور عقلمند قومیں ہیں جنھوں نے

قانون کے کمزور نقطے کو بھانپ لیا، قوانین کو یقینی شکست سے بچانے کیلئے چارہ جوئی کی اور دوسرا راستہ اختیار کیا ہے۔

ان قوموں نے تعلیم و تربیت کا ایسا طریقہ اپنایا ہے کہ جس سے افراد بہر طور صحیح اخلاق کے ساتھ پروان چڑھتے ہیں اور جب میدان عمل میں آتے ہیں تو قانون کو "مقدس" چیز سمجھتے ہیں کہ جس کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی۔ اِس قسم کی تربیت اس امر کا موجب بنتی ہے کہ لوگوں کو قانون پر عمل کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے، نتیجے کے طور پر ایک بڑی حد تک معاشرہ بہتری سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور قانون شکست سے بچ جاتا ہے۔

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو معاشرے اس قسم کی تربیت پاتے ہیں ان کے خیالات دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱ انسان دوستی، خیر خواہی اور رحم دلی وغیرہ جیسے نظریات و خیالات کہ جن کی بنیاد "حقیقت پسندی" پر ہے اور وہ بلاشبہ آسمانی مذاہب سے اخذ کیے گئے ہیں کیونکہ ترقی یافتہ معاشروں کے وجود میں آنے سے مدّتوں پہلے، دین نے لوگوں کو ان احساسات اور خیالات کی جانب متوجّہ کیا ہے، لہذا وہ خوش حالی جو ان خیالات کی بدولت ترقی یافتہ معاشروں میں دیکھنے میں آتی ہے، اس کا شمار بھی دین ہی کی برکتوں میں ہوتا ہے۔

۲ بیہودہ اور موہوم نظریات و خیالات کہ جن کی حیثیت خرافات کی ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگوں کو تلقین کی جاتی ہے کہ اگر وہ ملکی فلاح کے لیے تکلیف اٹھائیں یا مارے جائیں تو ان کے نام تاریخ کے صفحات پر سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔

گو اس قسم کے توہّم پرستانہ خیالات سے بھی عملی نتائج برآمد ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ ایک شخص ایسی تعلیمات سے متأثر ہوکر میدان جنگ میں سر دھڑ کی بازی لگا دے اور دشمن کے بہت سے افراد کو قتل کر دے لیکن ایسے خیالات سے جتنا فائدہ حاصل ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچتا ہے کیونکہ یہ انسان کو "توہّم پرست" بنا دیتے ہیں اور اس کی حقیقت پسندی کی حِس کو معطّل کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور روزِ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور موت کے معنیٰ نیست و نابود ہو جانا سمجھتے ہیں ان کی نگاہ میں اَبَدی زندگی اور موت کے بعد کسی کامیابی کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔

انسان اپنی خداداد طبیعت اور سرشت کی رُو سے دین کی طلب رکھتا ہے کیونکہ وہ جب تک زندہ رہتا ہے، اپنی بہتری کے لیے برابر تگ و دو کرتا ہے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایسے اسباب اور وسائل مہیّا کرتا ہے جو اس مقصد کو پورا کریں۔ بلاشبہ وہ ایک ایسا سبب چاہتا ہے جو ہمیشہ مؤثر ہو اور کبھی شکست نہ کھائے۔ دوسری طرف یہ صورت ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا سبب نہیں کہ جس کی تاثیر دائمی ہو اور جو کبھی شکست سے دوچار نہ ہو۔ پس دین کی طلب اسی حقیقت سے عبارت ہے کہ انسان اپنی فطرت کے مطابق اپنی خوش بختی کے لیے ایسا سبب چاہتا ہے جو شکست نہ کھائے اور ایسے سہارے کا طالب ہے جو کبھی نہ ٹوٹے تاکہ وہ اپنی زندگی کا پیوند اس کے ساتھ جوڑے اور ایک حقیقی باطنی سکون حاصل کرے۔ واضح ہو کہ صرف خدا وہ ذات ہے جو اپنے ارادے میں ہرگز شکست نہیں کھاتی اور زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ جس کے ذریعے خدا سے تعلّق قائم کیا جاسکتا ہے دینِ اسلام کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کے تینوں اُصولوں (توحید، نبوت اور قیامت) کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انسان کی یہ فطری طلب ہی بہترین دلیل ہے۔ کیونکہ وہ فطری شعور کہ جو بالخصوص انسانی ساخت کا لازمہ ہے، ہرگز غلطی نہیں کرتا۔ جیسا کہ انسان غلطی سے دوستی کے معنیٰ دشمنی کے نہیں لیتا اور جب پیاس محسوس کرتا ہے تو اسے سیرابی نہیں سمجھتا۔

یہ درست ہے کہ انسان بعض اوقات آرزو کرتا ہے کہ پرندوں کی طرح اس کے بھی پَر ہوتے اور وہ اڑتا پھرتا یا مثلاً یہ کہ وہ ستاروں کی طرح آسمان پر رہتا کیونکہ وہ تہ دل سے اور سنجیدگی سے اپنی خوش بختی کے لیے ایک حقیقی سہارا یا مکمّل سکون یا ایک مکمّل انسانی زندگی چاہتا ہے اور جب تک زندہ ہے اس خیال سے دست بردار نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر کائنات میں شکست نہ کھانے والے سبب (خدا کی ہستی) کا وجود نہ ہوتا تو انسان اپنی پاکیزہ فطرت کی بنا پر اس کے بارے میں غور ہی نہ کرتا۔ اسی طرح اگر مطلق آرام اور سکون موجود نہ ہوتا (جو کہ عالم آخرت کا آرام اور سکون ہے) اور دین کا طریقہ (جو نبوّت کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے) صحیح نہ ہوتا تو انسان کے دل میں ان کی طلب پیدا ہی نہ ہوتی۔

مذاہب کی مختصر تاریخ

مذاہب کی پیدائش کی مختصر تحقیق کا سب سے زیادہ تسلّی بخش ذریعہ کہ جس پر دینی نقطۂ نگاہ سے اعتماد کیا جاسکتا ہے قرآن مجید ہے کیونکہ یہ کتاب ہر قسم کی غلطی، شک و شبہ، تعصّب اور خود غرضی سے پاک ہے۔ اس موضوع پر قرآن مجید مختصراً فرماتا ہے کہ خدا کا دین تو فقط دینِ اسلام ہی ہے۔

یہ دین انسان کی پیدائش کے پہلے ہی دن سے اس کے ساتھ رہا ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں وضاحت کی گئی ہے کہ موجودہ انسانی نسل ایک مرد اور ایک عورت کی اولاد ہے۔ قرآن مجید میں مرد کا نام آدم بتایا گیا ہے اور حضرت آدمؑ پیغمبر تھے، ان پر آسمانی وحی نازل ہوتی تھی، ان کا دین بے حد سادہ تھا اور چند عام اصولوں پر مشتمل تھا مثلاً یہ کہ لوگوں کے لیے لازم ہے کہ خدا کو یاد کریں، ایک دوسرے کے ساتھ بالخصوص والدین کے ساتھ احسان اور نیکی کریں، فتنہ و فساد اور قتل جیسے دوسرے بُرے کاموں سے پرہیز کریں۔

حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کے بعد ان کی اولاد اپنا وقت بے حد سادگی کے ساتھ اور بغیر کسی اختلاف کے گزارنے لگی۔ چونکہ افراد کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی، اس لیے رفتہ رفتہ وہ مل جل کر رہنے لگے اور یُوں اجتماعی زندگی کی بنیاد پڑی۔ ان حالات میں وہ بتدریج زندگی کے طور طریقے سیکھتے رہے اور اپنے آپ کو تہذیب و تمدّن کے قریب کرتے رہے۔ جب لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو وہ مختلف قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر قبیلے میں ایسے بزرگ بھی پائے جاتے تھے جن کا اہل قبیلہ احترام کرتے تھے، حتّیٰ کہ اُن کی موت کے بعد ان کے مجسّمے بنا کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے تھے۔ اسی زمانے سے لوگوں میں بُت پرستی کو رواج ہوا، جیسا کہ دینی پیشواؤں کی روایات میں بتایا گیا ہے، بُت پرستی کا آغاز اسی طریقے سے ہوا ہے اور بُت پرستی کی تاریخ بھی اس بات کی تائید کرتی ہے۔ چونکہ طاقتور لوگ کمزور لوگوں کا استحصال کرنے لگے اس لیے رفتہ رفتہ لوگوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ یہ اختلافات اور کبھی کبھار پیدا ہونے والے بڑے بڑے اختلافات زندگی کی

گوناگوں کشمکشوں کا باعث بن گئے۔

یہ اختلافات انسان کو نیک بختی کے راستے سے ہٹا کر بدبختی اور ہلاکت کی جانب کھینچنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ مہربان خدا نے پیغمبر مبعوث کیے اور ان کو لوگوں کے اختلافات دور کرنے کے لیے آسمانی کتابیں دیں چنانچہ خداوند تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے:

"پہلے سب لوگ ایک ہی دین رکھتے تھے، پھر وہ آپس میں جھگڑنے لگے۔ تب خدا نے نجات کی خوشخبری دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے پیغمبروں کو بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ ساتھ برحق کتاب بھی نازل کی تاکہ جن باتوں کے بارے میں لوگ جھگڑتے تھے ان کا فیصلہ کر دے۔" (سورۂ بقرہ - آیت ۲۱۳)

دینِ اسلام

دینِ اسلام آخری آسمانی دین ہے اور اسی وجہ سے سب ادیان کے مقابلے میں کامل ترین دین ہے۔ اس دین کے آنے پر سابقہ ادیان منسوخ ہو گئے کیونکہ جب ایک کامل چیز موجود ہو تو ناقص کی ضرورت نہیں رہتی۔

دینِ اسلام ہمارے جلیل القدر پیغمبر حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعے بنی نوعِ انسان کے لیے بھیجا گیا۔ نجات اور خوش بختی کا یہ دروازہ اہلِ عالم کے لیے اس وقت کھولا گیا جب انسانی مُعاشرے ذہنی خامی اور کمزوری کے ادوار گزار چکے تھے اور انسانیت کا کمال حاصل کرنے کے لیے تیّار تھے یعنی انھوں نے اتنی صلاحیّت پیدا کر لی تھی کہ بلند پایہ الٰہی معارف اور مطالب کو سمجھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں۔

لہذا اسلام نوعِ بشر کے لیے ایسے حقائق اور معارف لایا ہے جنھیں حقیقت پسند انسان سمجھ سکے۔ ان کے علاوہ وہ ایسے پسندیدہ اخلاق لایا ہے جو انسان کے لیے وجہِ امتیاز ہیں اور ایسے احکام بھی لایا ہے جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے امور کو ترتیب دیتے ہیں اور وہ بنی نوعِ انسان کو ان کے مطابق عمل کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

اِس بنا پر اسلام ایک آفاقی اور ہمیشہ قائم رہنے والا دین ہے۔ یہ اعتقادی اُمور اور اخلاقی و عملی قواعد و ضوابط کا وہ مجموعہ ہے کہ جس کے مطابق عمل کر کے انسان دنیا اور آخرت میں سعادت اور نیک بختی حاصل کرتا ہے دین اسلام کے احکام ایسے ہیں کہ جو فرد اور جو معاشرہ بھی ان پر عمل کرے وہ بہترین زندگی گزارتا ہے اور ان کی بدولت انسان کمال کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہوتا ہے۔

دین اسلام ہر شخص اور ہر معاشرے کو مساوی طور پر اپنی برکتوں سے بہرہ مند کرتا ہے۔ بڑے اور چھوٹے، عقلمند اور نادان، مرد اور عورت، گورے اور کالے، مشرقی اور مغربی کسی امتیاز کے بغیر اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور اپنی ضروریات بہترین طریقے سے پوری کر سکتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے معارف اور قوانین کی بنیاد کائنات پر رکھی ہے اور وہ انسان کی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے ان کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مختلف لوگوں، نسلوں اور زمانوں میں انسان کی فطرت اور ساخت ایک جیسی ہوتی ہے کیونکہ جیسا کہ ظاہر ہے، مشرق سے مغرب تک سارا انسانی معاشرہ ایک ہی نوع کا خاندان ہے یعنی سبھی بنی نوع انسان ہیں بڑا اور چھوٹا، مرد اور عورت، عقلمند اور نادان، گورا اور کالا وغیرہ سبھی اس

خاندان کے افراد اور انسانی عمارت کی بنیادوں میں برابر کے شریک ہیں۔ ان مختلف افراد اور نسلوں کی ضروریات ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور آئندہ پیدا ہونے والے انسان بھی انھیں لوگوں کی اولاد ہوں گے، جو یقینی طور پر انھی جیسی ضروریات ورثے میں پائیں گے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسان کی حقیقی اور فطری ضروریات پوری کرتا ہے۔ یہ دین سب کے لیے کافی ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اسی بنا پر خدا، اسلام کو "دینِ فطرت" کا نام دیتا ہے اور لوگوں کو انسانی فطرت کے قائم رکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ اسلام ایک آسان دین ہے جو انسانوں پر سخت گیری نہیں کرتا۔

اِنسان کی آسائش کے سِلسلے میں اسلام کی اہمیّت

جس طرح دین دوسرے اجتماعی طریقوں کے مقابلے میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے اِسی طرح اسلام بھی دُوسرے ادیان کے مقابلے میں ایک اعلیٰ حیثیت کا مالک ہے۔ اس لحاظ سے اسلام انسانی معاشرے کے لیے ہر دوسرے طریقِ عمل سے زیادہ سُود مند ہے۔ یہ حقیقت اسلام اور دُوسرے اَدیان کے طریقہ ہائے عمل کا موازنہ کرنے سے واضح ہو جاتی ہے۔

دُوسرے اَدیان سے اسلام کا موازنہ

تمام ادیان میں اسلام وہ واحد دین ہے جو سو فی صد اجتماعی ہے اسلام کی تعلیمات نہ تو عیسائیوں کے موجودہ مذہب کے مطابق ہیں جو فقط لوگوں کی عاقبت کی بھلائی کی فکر کرتا ہے اور ان کی دنیاوی خوش بختی کے بارے میں

خاموش ہے نہ ہی یہودیوں کے موجودہ مذہب کے مطابق ہیں جو اپنی تمام کوششیں فقط ایک قوم کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کرتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات مجوسیوں کے مذہب اور بعض دوسرے مذاہب کی مانند بھی نہیں جو اخلاق اور اعمال پر مبنی چند موضوعات تک محدود ہیں۔

اسلام میں ہمیشہ کے لیے، ہر وقت اور ہر جگہ پر تمام لوگوں کی تعلیم و تربیت اور دونوں جہانوں میں ان کی خوش بختی کو مدّنظر رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاشروں کی اصلاح اور لوگوں کی دونوں جہان کی خوش بختی کا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ اول تو یہ کہ آج کل جب کہ دنیا کے مختلف ملکوں کے باہمی تعلقات زیادہ مستحکم ہو رہے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے نزدیک آ رہے ہیں، فقط ایک معاشرے یا ایک قوم کی اصلاح کرنا ایک بیکار کوشش ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بڑے تالاب یا ایک آلودہ نہر میں سے صرف ایک قطرہ پانی لے کر اسے صاف کر لیا جائے۔ دوم یہ کہ دوسرے معاشروں کو نظر انداز کر کے فقط ایک معاشرے کی اصلاح کرنا اصلاح پسندی کی حقیقت کے منافی ہے۔

کائنات اور انسان کی تخلیق کے بارے میں جن خیالات کا انسانی دماغ میں پیدا ہونا ممکن ہے، اسلام کی تعلیمات میں ان سب کا احاطہ کیا گیا ہے پھر وہ اخلاق جو انسانی نفوس میں جاگزیں ہو سکتے ہیں اور جو افعال انسان کی زندگی میں وقوع پذیر ہو سکتے ہیں ان سب کو زیرِ غور لایا گیا ہے۔

جہاں تک خیالات کا تعلق ہے، اسلام میں انھی خیالات کا انتخاب کیا گیا ہے اور انھیں کو بنیاد قرار دیا گیا ہے جو حقیقت پسندی کا پہلو رکھتے ہیں۔ اور ان میں "توحید" سرِفہرست ہے۔

جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے، اسلام میں انھی اخلاق کا انتخاب کیا گیا جو عقلِ سلیم کے نزدیک واقعی پسندیدہ ہیں اور وہ توحید کی بنیاد پر قائم کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد اخلاق کی بنیاد پر بہت سے ایسے عملی قوانین وضوابط وضع کیے گئے ہیں جو انسان کی زندگی کی تمام جزئیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں فرد اور معاشرے، کالے اور گورے، شہری اور دیہاتی، مرد اور عورت، چھوٹے اور بڑے، خادم اور آقا، امیر اور غریب اور حاکم و محکوم سب کی ذمّے داریاں عام حالات میں بھی اور مخصوص حالات میں بھی واضح ہو گئی ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"کلمۂ توحید کی کیسی اچھی مثال بیان کی ہے، گویا ایک پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی ٹہنیاں آسمان سے لگی ہیں۔" (سورۂ ابراہیم۔ آیت ۲۴)

جو شخص اسلامی علوم، اخلاقی تعلیمات اور فقہ کے ماخذ پر تحقیقی نگاہ ڈالے گا وہ ایک ایسے ناپیدا کنار سمندر کا مشاہدہ کرے گا کہ جس کی چوڑائی اور گہرائی کا اندازہ لگانے سے عقلِ انسانی عاجز ہے۔ اس کے باوجود اس کا ہر جزو دوسرے اجزا سے مربوط اور متناسب ہے اور تمام اجزا مل کر ایک ایسی "خدا پرست" اور انسان دوست اکائی تشکیل دیتے ہیں جس کے بارے میں خدا نے اپنے جلیل القدر پیغمبرؐ کو وحی فرمائی ہے۔

دُوسرے اجتماعی طریقوں سے اسلام کا مُوازنہ

اگر ہم دنیا کے ترقّی یافتہ معاشروں کے طور طریقوں کو غور سے دیکھیں تو

بخوبی پتا چلتا ہے کہ اگرچہ ان معاشروں نے بے مثال علمی اور صنعتی ترقّی کی ہے، چاند اور مریخ پر کمندیں ڈالی ہیں اور عظیم الشان ادارے قائم کر کے دنیا کو حیران کر دیا ہے لیکن انھی ترقی پسندانہ طریقوں نے قابلِ تعریف ترقی کے ساتھ ساتھ "عالمِ انسانیت" کے لیے "بدبختی" کے دروازے بھی کھول دیے ہیں یعنی چوتھائی صدی سے بھی کم مدّت میں دنیا کو دو مرتبہ کُشت و خون میں مبتلا کر کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کی جانیں لے لی ہیں اور اب بھی دُنیا کو تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ ہے جس کے نتیجے میں عین ممکن ہے کہ انسانی نسل ہی نیست و نابود ہو جائے۔

یہی وہ طریقے ہیں جنھوں نے اپنی پیدائش کے پہلے دن سے انسان دوستی اور آزادی بخشی کا نام دے کر دُنیا کی باقی قوموں کے ماتھے پر غلامی کا ٹیکہ لگا دیا ہے۔ دنیا کے چار برِّاعظموں کی اقوام کو استعمار کی زنجیروں سے باندھ کر غیر مشروط طور پر مغرب کے ماتحت کر دیا ہے اور ایک چھوٹے سے گروہ کو کروڑوں بے گناہ انسانوں کے مال، جان اور آبرو کا مطلق العنان حاکم بنا دیا ہے۔

اِس بات سے یقیناً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ترقّی یافتہ قومیں اپنے اپنے ماحول میں دنیاوی نعمتوں اور لذّتوں سے بہرہ ور ہیں اور ان کی سماجی انصاف اور تعلیمی و صنعتی ترقی جیسی انسانی آرزوئیں پوری ہو گئی ہیں لیکن وہ بہت سے مصائب اور مشکلات میں مبتلا ہیں جن میں سب سے بڑی مصیبت بین الاقوامی تصادمات ہیں۔ اس کے علاوہ ہر گھڑی دُنیا کو بد تر حالات سے دوچار ہونے کا خطرہ درپیش ہے۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ یہ تمام کڑوے اور میٹھے میوے تہذیب

کے درخت سے حاصل ہوئے ہیں اور ان قوموں اور مُعاشروں کے طرزِ زندگی کا براہِ راست نتیجہ ہیں جو بظاہر ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جن میٹھے میووں سے بہرہ ور ہو کر ان قوموں نے معاشرے کو خوش حالی سے ہمکنار کیا ہے، ان کا سرچشمہ صرف قانون ہی نہیں بلکہ راست گوئی، ایمانداری، فرض شناسی، خیر خواہی اور فداکاری جیسے پسندیدہ اخلاق کا ایک سلسلہ ہے۔ کیونکہ وہی قوانین ایشیا اور افریقہ کی پس ماندہ اقوام میں بھی رائج ہیں لیکن ان قوموں کی پسماندگی اور بد نصیبی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے !!

اس درخت کے وہ کڑوے پھل جو انسان کے منہ کا مزا خراب کرتے ہیں اور اس کی بدبختی اور بدنصیبی کا موجب بنتے ہیں خود ان ترقی یافتہ قوموں کو بھی دوسروں کی طرح بربادی کی طرف کھینچتے ہیں کیونکہ ان کا سرچشمہ حرص، طمع، بے رحمی، غرور اور سرکشی جیسے ناپسندیدہ اخلاق ہوتے ہیں۔

اگر ہم اسلام کے مقدس دین کے احکام پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ پہلی قسم کی صفات اپنانے کا حکم دیتا ہے اور دوسری قسم کی صفات میں آلودہ ہونے سے منع کرتا ہے۔ وہ ایک عام قاعدے کے طور پر ایسے اچھے کاموں کی دعوت دیتا ہے جن میں بنی نوعِ انسان کی بھلائی ہو اور ان بُرے اور ناجائز کاموں سے بچنے کی ہدایت کرتا ہے جو انسانی زندگی کے آرام میں خلل ڈالتے ہیں۔ (خواہ ان میں کسی خاص قوم کی بھلائی ہی کیوں نہ مضمر ہو)۔

نتیجہ

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرتے ہیں:

(۱) اسلام کا طریقہ ہر دوسرے اجتماعی طریقے سے بہتر اور عالمِ انسانیت کے لیے زیادہ سود مند ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

"یہی مضبوط اور بالکل سیدھا دین ہے، مگر بہت سے لوگ نہیں جانتے۔" (سورۂ روم۔ آیت ۳۰)

(۲) دُنیا کی موجودہ تہذیب کے تمام تر روشن نقاط اور میٹھے پھل اسلام کے پاک مذہب کی برکتوں کا نتیجہ ہیں۔ وہ اس مواد کے زندہ آثار ہیں جو اہلِ مغرب نے اس مقدس دین سے حاصل کیا ہے، کیونکہ اسلام نے مغربی تہذیب کے ظاہر ہونے سے صدیوں پہلے لوگوں کو انھی آداب و اخلاق کی جانب دعوت دی ہے جن پر عمل کرنے میں اہلِ مغرب ہم سے سبقت لے گئے ہیں۔

امیرالمؤمنین امام علی علیہ السلام نے بسترِ شہادت پر لوگوں سے فرمایا تھا:

"مبادا تم ایسا رویہ اختیار کرو کہ دوسرے لوگ قرآن مجید پر عمل کرنے میں تم پر سبقت حاصل کرلیں۔"

(۳) اسلامی احکام کے مطابق یہ ضروری ہے کہ انسان اپنا اصلی مقصد اخلاق کو قرار دے کر قوانین کی بنیاد اس پر استوار کرے کیوں کہ پسندیدہ اخلاق کو بھلا دینا اور فقط مادّی فوائد کی خاطر قوانین وضع کرنا معاشرے کو رفتہ رفتہ مادّیت کی جانب مائل کردیتا ہے اور اُسے رُوحانیت سے ــــ جو دوسرے حیوانات پر انسان کی برتری کا واحد سبب ہے ــــ محروم کردیتا ہے۔ اس کی بجائے اس میں بھیڑیے اور چیتے جیسی

چیرنے پھاڑنے اور گائے اور بھیڑ جیسی چرنے کی عادات پیدا کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ"

یعنی ہمارا اصلی مقصد لوگوں کی اخلاقی تربیت ہے۔

اعتقادات

انسان جو منظر اور جو واقعہ دیکھتا ہے اپنی خداداد قوّتِ تمیز کے ساتھ اس کے پیدا ہونے کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ہرگز یہ گمان نہیں کرتا کہ کوئی چیز خود بخود اور بغیر کسی سبب کے یعنی اتفاقاً وجود میں آگئی ہے۔ جب ایک ڈرائیور دیکھتا ہے کہ اس کی موٹر کار رک گئی ہے تو وہ نیچے اُترتا ہے اور ان پرزوں کو دیکھتا ہے جن میں خرابی پیدا ہونے کا اسے شک ہوتا ہے تاکہ کار کے رُک جانے کی وجہ کا پتا چلائے۔ وہ ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ موٹر کار ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک ہونے کے باوجود بلاوجہ رک گئی ہے۔ اسی طرح جب وہ کار کو چلانا چاہتا ہے تو ان پرزوں کو حرکت دیتا ہے جو اس مقصد کے لیے اس میں لگائے گئے ہیں۔ وہ اس امید پر نہیں بیٹھا رہتا کہ موٹر کار اتّفاق سے خود بخود چل پڑے گی۔

انسان اگر بھوکا ہو تو روٹی مہیّا کرنے کی فکر کرتا ہے، پیاس لگے تو پانی تلاش کرتا ہے اور اگر اسے سردی محسوس ہو تو گرم کپڑے پہنتا ہے یا آگ تاپتا ہے۔ وہ ہرگز یہ امید نہیں کرتا کہ سردی اتّفاق سے خود بخود دُور ہو جائے گی۔ جو شخص کوئی عمارت تعمیر کرنا چاہے وہ قدرتی طور پر انجینئروں اور راج مزدوروں کی خدمات حاصل کرتا ہے اور ضروری سامان مہیّا کرتا ہے کیونکہ اُسے ہرگز یہ توقع نہیں ہوتی کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ خُود بخود ہو جائیگا۔

جب سے انسان وجود میں آیا ہے، پہاڑ، جنگل اور بڑے بڑے سمندر بھی رُوئے زمین پر موجود رہے ہیں۔ پھر وہ ہمیشہ سورج، چاند اور چمکتے دمکتے ستاروں کو آسمان میں منظم اور مسلسل طور پر حرکت کرتے دیکھتا رہا ہے۔ اس کے باوجود دنیا کے سائنس داں ان حیرت انگیز چیزوں کی پیدائش کے اسباب دریافت کرنے کی اَن تھک کوششوں میں مصروف ہیں۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ چونکہ جب سے ہم وجود میں آئے ہیں یہ چیزیں بھی موجود ہیں اس لیے یہ خُود بخود پیدا ہو گئی ہیں۔

جستجو کرنے اور وجوہات اور اسباب کے بارے میں بحث کرنے کی یہی جبلّت انسان کو اس پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ دنیا کی پیدائش اور اس کے حیرت انگیز نظام کے متعلق چھان بین کرے اور اس بات کا پتہ چلائے کہ آیا یہ وسیع دنیا جس کے تمام حصے ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور جو درحقیقت ایک بہت بڑا منظر ہے، خود بخود وجود میں آگئی ہے یا اس کی پیدائش اور ہستی کا سرچشمہ کوئی اور جگہ ہے۔ نیز وہ اس بات کا پتہ بھی چلائے کہ یہ حیرت انگیز نظام جو مستحکم اور مستقل قوانین کے مطابق ساری دُنیا کے گوشے گوشے میں چل رہا ہے اور ہر چیز کی رہنمائی اس کے مخصوص مقصد

کی طرف کر رہا ہے آیا اس کا بندوبست ایک لامحدود قدرت اور علم کے ہاتھوں میں ہے یا یہ محض اتّفاق سے وجود میں آگیا ہے۔

توحید

جب انسان اپنی حقیقت پسندی کی جبلّت سے کام لیتا ہے تو وہ دنیا کے جس کونے پر بھی نگاہ ڈالتا ہے اسے دنیا کو پیدا کرنے والے اور پالنے والے کی ہستی کے کئی ایک ثبوت نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی حقیقت پسندی کی جبلّت کی بدولت اس بات کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ تمام مخلوقات جو ہستی کی نعمت سے بہرہ ور ہیں ان میں سے ہر ایک خواہ نخواہ ایک مقررہ راستے پر گامزن ہے اور کچھ وقت گزرنے پر اپنی جگہ دوسروں کو دے دیتا ہے۔ انھوں نے ہرگز اپنی ہستی کو خود پیدا نہیں کیا اور جس منظم راستے پر وہ چل رہے ہیں اُسے انھوں نے خود اپنے لیے ایجاد نہیں کیا اور ان معاملات میں ان کا رتی بھر بھی دخل نہیں ہے کیونکہ جہاں تک خود انسان کا تعلّق ہے، اس نے انسانیت اور انسانی خاصیّتیں اپنی مرضی سے چُن کر اختیار نہیں کیں بلکہ انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور انسانی خاصیتیں اُسے عنایت کی گئی ہیں۔ اسی طرح انسان کی حقیقت پسندی کی جبلّت ہرگز اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ یہ تمام چیزیں خود بخود اور اتفاقاً وجود میں آگئی ہیں اور ان کی ہستی کا نظام سرسری طور پر اور بغیر کسی سوچ سمجھ کے پیدا ہو گیا ہے کیونکہ وہ جبلّت تو اس قسم کا اتفاق اس صورت میں بھی قبول نہیں کرتی جب چند اینٹیں ایک دوسری پر ترتیب سے رکھی ہوئی ہوں۔ اسی بنا پر انسان کی حقیقت پسند جبلّت اعلان کرتی ہے کہ دنیا کا یقینی طور پر ایک سہارا ہے جو ہستی

کا مَبدَأ، دُنیا کا پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔ ہاں وہ لامحدود ہستی اور علم وقدرت کا منبع خدا ہے جس کے وجود کے سمندر سے ہستی کے نظام کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ چنانچہ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"اِس کائنات کا خُدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اُسے ایک مخصوص شکل دی اور پھر اُسے زندگی اور بقا کا راستہ دکھایا۔" (سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۵۰)

خُدا کی پہچان اور اقوامِ عالم

موجودہ زمانے میں رُوئے زمین پر بسنے والے لوگوں کی اکثریت دیندار ہے۔ وہ اس خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں جس نے دنیا کو پیدا کیا ہے اور اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں بھی بنی نوعِ انسان کی یہی کیفیت رہی ہے۔ جہاں تک تاریخ بتاتی ہے، زیادہ تر انسان دیندار رہے ہیں اور کائنات کے لیے ایک خُدا کے قائل رہے ہیں۔ گو دیندار معاشروں میں نظریات کا اختلاف بھی موجود رہا ہے اور ہر قوم نے بعض مخصوص اوصاف خالقِ کائنات سے منسوب کیے ہیں لیکن اصلی مطلب پر سب نے اتفاق کیا ہے نیز اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب مثلاً نصرانیت، یہودیت اور مجوسیت بھی اس بارے میں ہم عقیدہ ہیں۔ جو لوگ خالق کے وجود کے مُنکر ہیں، ان کے پاس انکار کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہوگی بلکہ درحقیقت وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس خالق کے وجود کے بارے میں کوئی دلیل نہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ہم اس کے نہ ہونے کے متعلق کوئی دلیل رکھتے ہیں۔

ایک مادّی انسان کہتا ہے کہ "میں نہیں جانتا" وہ یہ نہیں کہتا کہ "نہیں ہے"

دوسرے لفظوں میں، ایک مادّی انسان منکر نہیں بلکہ متردّد ہے یعنی اس کی کیفیت انکار کی نہیں بلکہ بے یقینی کی ہے۔

خُداوند تعالیٰ نے اپنے کلام میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس دنیا ہی کی ہے، جہاں ایک مرجاتا ہے اور دوسرا زندہ ہو جاتا ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ہم مرجاتے ہیں (اور پردے کے پیچھے کیا ہے اس کا کوئی عِلم نہیں) یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کا خود انھیں یقین نہیں ہے۔" (سورۂ جاثیہ۔آیت ۲۴)

اِنسان کے بارے میں جو قدیم ترین آثار دریافت ہوئے ہیں ان میں بھی دین اور خدا پر عقیدے کے وجود کی نشانیاں ملی ہیں۔ کچھ ایسی علامتیں بھی دستیاب ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ مَابَعْدَ الطبیعیات پر عقیدہ اور ایمان رکھتے تھے۔ حتّٰی کہ امریکہ اور آسٹریلیا جیسے نئے برِّاعظموں اور پُرانے برِّاعظموں سے بہت دُور واقع پچھلی صدی میں دریافت ہونے والے جزیروں کے مقامی باشندے بھی خدا پر ایمان رکھتے تھے اور مختلف طریقوں سے کائنات کے مَبْدَأ کی پرستش کرتے تھے حالانکہ ان کے پرانی دنیا سے رابطے کی تاریخ قطعاً دستیاب نہیں ہوئی۔

جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ انسان کا خدا پر ہمیشہ ایمان رہا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان فطری طور پر خُدا کا معتقد ہے اور وہ اپنی خداداد فطرت کی بدولت کائنات کو پیدا کرنے والے خدا کے وجود کی تائید کرتا ہے۔ قرآنِ مجید انسان کی اِس فطری خاصیّت کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"اگر تم اُن سے پوچھو کہ تمھیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ یقیناً کہیں گے کہ خُدا نے۔" (سورۂ زخرف - آیت ۸۷)

قرآن مجید ایک اور مقام پر فرماتا ہے :

"اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ تو وہ یقیناً کہیں گے کہ "اللہ"۔" (سورۂ لقمان - آیت ۲۵)

اِس قسم کی جُستجو کا انسان کی زندگی پر اَثر

حقیقت کی تلاش کی انسانی جبلّت کے تقاضے کے مطابق، دُنیا اور اس کے نظام کے پیدا کرنے والے کے بارے میں یہ سوالات انسانی ذہن میں ہیں۔ اگر وہ ان کا جواب "ہاں" میں دے تو وہ دنیا کی پیدائش اور اس کی گردش کے حیرت انگیز نظام کے لیے ایک ازلی اور ابدی مَبدَأ کے وجود کی تصدیق کر کے ہر چیز کو اس کے اس ناقابلِ شکست ارادے سے مربوط کر دیتا ہے جسے اس کے لامحدود علم اور قدرت کا سہارا حاصل ہے۔

اس کے نتیجے میں انسان کے دل میں ایک قسم کی تسلّی اور امّید پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی میں اسے جو دشواریاں پیش آتی ہیں اور جن مشکلات کے حل کے تمام راستے اس پر بند ہو جاتے ہیں، ان کے بارے میں وہ مکمل طور پر نا امید نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کوئی سبب خواہ کتنا ہی زبردست کیوں نہ ہو، اس کی باگ ڈور خدائے قدیر کے طاقتور ہاتھوں میں ہے اور ہر چیز اس کے فرمان کے تابع ہے۔ ایسا شخص ہرگز اسباب وعلل کے سامنے مکمل طور پر ہتھیار نہیں ڈالتا، جب حالات اس کی خواہش کے

مطابق ہوں تو مغرور نہیں ہوتا اور اپنی اور دُنیا کی حیثیت کو بھول نہیں جاتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ظاہری اسباب و علل اپنی مرضی کے مالک نہیں بلکہ خُدا کے حکم کے مطابق رُونما ہوتے ہیں۔ آخر کار ایسا انسان یہ بھی سمجھ لیتا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی چیز کے آگے سر تسلیم خم کرنا درست نہیں اور اس کے حکم کے علاوہ کسی کا حکم غیر مشروط طور پر نہیں ماننا چاہیے۔

لیکن جو شخص مذکورہ بالا سوالات کا جواب نفی میں دے وہ اس امّید، حقیقت پسندی اور بالآخر اس فطری بلند حوصلے اور شجاعت سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ جن مُعاشروں پر مادّیت کی رُوح غالب آگئی ہے ان میں خُودکشی کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں، وہ لوگ فقط ظاہری اسباب و علل میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس لیے حالات کے تھوڑا سا بگڑنے پر اپنی نیک بختی سے مایوس ہو جاتے ہیں اور اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں تاہم جن لوگوں کو خدا کو پہچاننے کی نعمت حاصل ہے، وہ خواہ اپنے آپ کو موت کے مُنہ میں بھی پائیں پھر بھی ناامّید نہیں ہوتے کیونکہ ان کا اس بات پر ایمان ہوتا ہے کہ ان کا خُدا بڑا طاقت ور اور دانا و بینا ہے۔ (بے شک خدا کی رحمت اور مدد سے مایوس ہونا گناہِ کبیرہ ہے۔)

حضرت امام حُسین علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں جب کہ آپ چاروں طرف سے دُشمنوں کی تلواروں میں گِھرے ہُوئے تھے یہ ارشاد فرمایا:

"وہ واحد چیز جس نے اس ناگوار مصیبت کو میرے لیے آسان بنا دیا ہے یہ ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ خُدا میرے اعمال پر مُسلسل

نظر رکھے ہوئے ہے۔"

قرآن مجید نے چند آیات میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔ مثلاً:

"جو لوگ خداوندِ عالم کو اپنا پیدا کرنے والا مانتے ہیں، اس کے پروردگار ہونے کا اعتراف کرتے ہیں اور اپنے قول پر ثابت قدم رہتے ہیں وہ ہرگز خوف اور پریشانی سے دوچار نہیں ہوتے۔"

(سورۂ احقاف - آیت ۱۳)

"جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، ان کا دل خدا کی یاد کے نتیجے میں مطمئن ہوتا ہے۔ یاد رکھو! لوگوں کے اطمینانِ قلب کا واحد ذریعہ خدا کی یاد ہے۔" (سورۂ رعد - آیت ۲۸)

قرآن کے نقطۂ نظر کے مُطابق خُدا کو پہچاننے کا طریقہ

جب کوئی شیر خوار بچّہ دونوں ہاتھوں سے اپنی ماں کا پستان پکڑ کر دُودھ پینے کے لیے چُوستا ہے تو وہ درحقیقت دُودھ پینا چاہتا ہے۔ اگر وہ کوئی چیز اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر کھانے کے لیے اپنے منہ کی طرف لے جاتا ہے تو اس کا اصلی مقصد کھانا ہوتا ہے۔ پھر جب وہ دیکھتا ہے کہ اُسے مغالطہ ہُوا ہے اور جو چیز اس نے اُٹھائی ہے وہ کھانے کی چیز نہیں ہے تو اسے پھینک دیتا ہے۔ اِسی طرح انسان جس مقصد کے لیے تگ و دو کرتا ہے، درحقیقت اسی کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس سے چوک ہو گئی ہے اور وہ غلط راستے پر چلتا رہا ہے تو وہ اپنی غلطی اور فروگزاشت کی وجہ سے آزردہ ہوتا ہے اور ایک غلط مقصد کی خاطر تکلیف اٹھانے پر اُسے افسوس ہوتا ہے۔ دراصل انسان ہر سہو اور خطا سے بچنا چاہتا ہے اور جہاں تک

ممکن ہو اپنا صحیح مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی فطرت اور جبلّت کی رُو سے حقیقت پسند واقع ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ اور ہر حالت میں حقیقت کو تلاش کرتا ہے اور سچّائی کی پیروی کرتا ہے۔ یہ اس کی فطری عادت ہے جو اس نے کِسی سے نہیں سیکھی۔ اگر کسی وقت انسان سرکشی کا اظہار کرتا ہے اور سچّائی اور حقیقت کو قبول نہیں کرتا تو یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ غلطی کھا جاتا ہے اور سچّائی اور حقیقت اس پر واضح نہیں ہوتی، اگر اسے سچائی اور حقیقت کا عِلم ہو جاتا تو وہ غلَط راستے پر نہ چلتا۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ہَوا وہَوس کے اثر کے تحت انسان ایک قسم کی رُوحانی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے سچّائی کا میٹھا ذائقہ اسے کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت وہ سچّائی کو پہچانتے ہوئے بھی اس کی پیروی نہیں کرتا حالانکہ وہ سچّائی کے درست ہونے کا اعتراف کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے، پھر بھی وہ اس کی متابعت سے باز رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مُضر اور نقصان دِہ چیزوں کا عادی ہو کر وہ اپنی انسانی جبلّت کو (جو خطرے کو دُور کرنے اور نقصان سے بچنے کی متقاضی ہے) پامال کر ڈالتا ہے اور ایسے کام کرتا ہے جو اس کے لیے نقصان دِہ ہوں۔ جیسا کہ کچھ لوگ سگریٹ، ہیروئن، بھنگ اور شراب وغیرہ کے عادی ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ مجید انسان کو حقیقت پسندی اور سچّائی کی پیروی کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اس بارے میں بے حد اصرار کرتا ہے۔ وہ اپنے بہت سے بیانات کے ذریعے لوگوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت پسندی اور سچّائی کی پیروی

کرنے کی جبلّت کو زندہ رکھیں۔

خُداوندِ عالم فرماتا ہے :

"کیا سچّائی کے بعد گمراہی کے علاوہ اور کوئی چیز ہوسکتی ہے؟"

(سورۂ یونس ۱۰- آیت ۳۲)

ایک اور مقام پر فرماتا ہے :

"ان لوگوں کے سوا جو ایمان لائے، اچھّے کام کرتے رہے سچّائی کی پیروی کرتے رہے اور ایک دوسرے کو سچّائی پر قائم رہنے کی سفارش کرتے رہے باقی سب لوگ گھاٹے میں ہیں۔"

(سورۂ عصر- آیت ۲-۳)

ظاہر ہے کہ خُدا نے یہ تمام تاکید اس لیے کی ہے کہ اگر انسان اپنی حقیقت پسندی کی جبلّت کو زندہ نہ رکھے اور سچّائی اور حقیقت کی پیروی کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوگا۔ وہ ہر ہوس آمیز اور دل کو لبھانے والے قول وفعل کے پیچھے بھاگے گا اور غلط اور بیہودہ خیالات میں گرفتار ہوجائے گا۔ یہی وہ وقت ہوگا جب وہ اپنے راستے سے۔ جو انسان کا اصلی سرمایہ ہے۔ ہٹ جائے گا اور ایک چوپائے کی طرح اپنی ہوا وہوس، لااُبالی پن اور نادانی کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔

اِرشادِ خداوندی ہے :

"تم ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو جو اپنی ہوائے نفس کی پرستش کرتے ہیں ؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم ان کی اصلاح اور تربیت کرسکتے ہو ؟ کیا تمھارا خیال ہے کہ ان میں سے بیشتر سنتے اور سمجھتے ہیں ؟ نہیں۔ بلکہ یہ تو چوپایوں سے بھی زیادہ

گمراہ ہیں۔" (سورۂ فرقان - آیت ۴۴)

جب انسان کی حقیقت پسندی کی جبلّت زندہ ہو جائے اور سچائی کی پیروی کرنے کی عادت اس کے اندر کام کرنے لگے تو حقیقتیں یکے بعد دیگرے اس کے سامنے آجاتی ہیں۔ جس سچّائی اور حقیقت کو وہ پالیتا ہے، کشادہ بازوؤں کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے اور ہر روز سعادت اور خوش نصیبی کی جانب ایک نیا قدم اُٹھاتا ہے۔

پیدا کرنے والے کا وجود

قرآن مجید فرماتا ہے:

"جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، کیا اُس کے وجود کے بارے میں شک کیا جاسکتا ہے۔" (سورۂ ابراہیمؑ آیت ۱۰)

توضیح

دن کی روشنی میں ہر چیز انسان کی آنکھوں کے سامنے نمایاں ہوتی ہے اور ہم اپنے آپ کو، دوسروں کو اور گھروں، پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کو دیکھ سکتے ہیں لیکن جب رات کا اندھیرا پھیل جاتا ہے تو وہ تمام چمکتی دمکتی چیزیں اپنی روشنی کھو بیٹھتی ہیں اور اس وقت یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ یہ روشنی ان کی اپنی نہیں تھی بلکہ سُورج کی تھی جو ایک قسم کے رابطے کی وجہ سے انھیں روشن کر رہا تھا۔ سُورج خود روشن ہے اور اپنے نُور سے زمین کو اور اس میں موجود چیزوں کو منوّر کرتا ہے۔ اگر ان چیزوں کی روشنی اپنی ہوتی تو یہ کبھی اس سے محروم نہ ہوتیں۔

انسان اور دُوسرے زندہ حیوانات اپنی آنکھوں، کانوں اور دُوسرے حَواس کے ذریعے چیزوں کی سُوجھ بوجھ حاصل کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ پاؤں اور دُوسرے اندرونی اور بیرونی اعضاء کی بدولت مختلف کام کرتے ہیں۔ تاہم کچھ مدّت گزرنے کے بعد ان کی محسوس کرنے، حرکت کرنے اور کوئی کام کرنے کی قوت ختم ہوجاتی ہے، مطلب یہ کہ وہ مرجاتے ہیں۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو شعور، ارادہ اور حرکت ان جانداروں میں دیکھنے میں آتی ہے وہ ان کے جسم کی نہیں بلکہ رُوح کی ہے۔ چنانچہ جب رُوح جسم سے جدا ہوجاتی ہے تو ان کی زندگی اور عمل کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔

مثلاً اگر دیکھنے اور سُننے کا تعلّق فقط آنکھوں اور کانوں سے ہوتا تو ضروری تھا کہ جب تک یہ دونوں اعضاء موجود ہوتے دیکھنے اور سُننے کا عمل بھی جاری رہتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

یہی صُورت اس وسیع کائنات کی ہے جس کے اجزا میں سے ہم خود ایک جُزو ہیں اور اس کے وجود کے ہونے میں ہرگز کوئی شک نہیں کرسکتے۔ اگر اس کی ناقابلِ تردید ہستی اور پیدائش خود اس کی اپنی دی ہوئی ہوتی تو پھر اس کا اس سے محروم ہونے کا کوئی سوال نہ ہوتا لیکن ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اس کے اجزا ایکے بعد دیگرے اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں اور ہمیشہ تغیّر و تبدّل کی حالت میں رہتے ہیں۔ ایک حالت سے دست بردار ہوجاتے ہیں اور دوسری حالت اختیار کرلیتے ہیں۔

پس ہمیں قطعی طور پر اس فیصلے پر پہنچنا چاہیے کہ تمام موجودات کی ہستی اور پیدائش کا سرچشمہ کوئی اور چیز ہے جو کہ اس کو پیدا کرنے والی اور ظاہر

کرنے والی ہے۔ پس جونہی وہ اپنے پیدا کرنے کے عمل کا رابطہ کسی چیز سے منقطع کرلیتی ہے وہ چیز نیست و نابود ہوجاتی ہے اور اپنی ہستی کھو بیٹھتی ہے۔

جس ہستی کا لامحدود وجود دُنیا کا سہارا ہے اور اہلِ دنیا کی نگہداشت کرتا ہے اسے اللہ کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا موجود ہے جس کے نیست و نابود ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ ورنہ دُوسری موجودات کی طرح اس کا وُجود بھی خود اس کی اپنی طرف سے نہ ہوتا بلکہ وہ کسی دُوسرے کا محتاج ہوتا۔

قرآن اور توحید

اگر انسان اپنی پاک سرشت اور پُرسکون دل کے ساتھ کائنات پر نگاہ ڈالے تو وہ اس کے چپّے چپّے میں پیدا کرنے والے کے پاک وجود کی نشانیاں اور ثبوت دیکھے گا اور ہر در و دیوار سے اس حقیقت کی گواہی سُنے گا کیوں کہ انسان اِس دنیا میں جس چیز سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ یا تو ایک مظہر ہے جسے خدا نے پیدا کیا ہے یا کوئی خاصیّت ہے جو خدا نے اس مظہر میں رکھی ہے یا کوئی نظام ہے جو خدا کے حکم سے ہر چیز کو اپنے زیرِ تسلّط رکھتا ہے۔ خُود آدمی بھی انھی چیزوں میں سے ایک ہے اور اس کا سراپا اس حقیقت کی گواہی دیتا ہے کیونکہ نہ اس نے اپنی ہستی کو خود پیدا کیا ہے اور نہ وہ خاصیّتیں کہ جو اس میں ظاہر ہوتی ہیں وہ اس کے اپنے اختیار میں ہیں، نہ زندگی کا وہ پروگرام کہ جس کی ابتدا اس کی پیدائش کے لمحے سے ہی ہوجاتی ہے خود اس نے وضع کیا ہے، نہ ہی وہ اِس نظام کو اتّفاقی اور ٹوٹا پھوٹا قرار دے سکتا ہے اور نہ وہ اپنی ہستی اور اس کے نظام کو اس محیط سے نسبت دے سکتا ہے جس میں وہ وجود میں آیا ہے کیوں کہ وہ محیط اپنی ہستی کو اور اس نظام کو جو اس پر حکومت کرتا ہے خُود وجود

میں نہیں لایا اور نہ ہی وہ اتّفاق سے خُودبخود پیدا ہوگیا ہے۔

لہٰذا انسان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ کائنات کیلیئے ایک مَبْدَأ کا اعتراف کرے جو تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا ہو۔ وہی ہے جو ہر موجود کو ہستی بخشتا ہے اور پھر بقا کی شاہراہ پر جس کا ایک خاص نظام ہے، اس کے لیے مخصوص کمال کی جانب اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

چُونکہ انسان دیکھتا ہے کہ تمام چیزوں کی پیدائش ایک دوسری سے مربوط ہے اور دُنیا میں صرف ایک ہی نظام جاری ہے، لہٰذا وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا اور اس نظام کو چلانے والا ایک سے زیادہ نہیں ہے۔

قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"اگر خُدائے واحد کے علاوہ اور خُدا بھی آسمان اور زمین میں (یعنی دنیا میں) موجود ہوتے تو دنیا تباہ وبرباد ہوجاتی۔"

(سورۂ انبیاء - آیت ۲۲)

توضیح

اگر کئی ایک خدا دنیا میں حکومت کر رہے ہوتے، اور جیسا کہ بُت پرست کہتے ہیں، دنیا کے ہر حصّے کا انتظام ایک الگ خدا کے ہاتھ میں ہوتا تو کئی ایک خُدا ہونے کی وجہ سے دنیا میں ہر جگہ کا نظم بھی الگ ہوتا۔ اس صورت میں دنیا لازمی طور پر تباہ وبرباد ہوجاتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام اجزا مکمل طور پر ایک دوسرے سے مربوط اور ہم آہنگ ہیں اور سبھی مل کر ایک نظام تشکیل دیتے ہیں۔ لہٰذا کہنا چاہیے کہ دُنیا کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا بس ایک ہی ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ سوچے کہ وہ کئی خدا جو فرض کیے گئے ہیں شاید وہ سمجھ دار ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ان کے اختلاف کے نتیجے میں دنیا تباہ ہو جائے گی، اس لیے وہ آپس میں اختلاف نہیں کرتے۔ تاہم سوچنے کا یہ انداز غلط ہے کیونکہ وہ خدا جو کائنات یا اس کے کسی گوشے کا انتظام چلاتا ہے، تخلیق کا نظام اسی کا فعل ہے اور وہ ہماری طرح فکر و خیال کے تحت کام نہیں کرتا۔

اس قول کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ پہلے ہی دن سے کہ جب ہماری آنکھ اِس دُنیا میں کھلتی ہے اور ہم اس میں جاری نظام کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس نظام کی کچھ شکلیں اپنے ذہن میں رکھ لیتے ہیں جو ہماری معلومات ہوتی ہیں۔ پھر ہم اپنی ضرورتیں رفع کرنے کے لیے تگ و دو کرتے ہیں تاکہ وہ کائنات میں جاری نظام سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ مثلاً ہم بھوک مٹانے کے لیے کھانا کھاتے ہیں اور پیاس بجھانے کے لیے پانی پیتے ہیں۔ اسی طرح گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے مناسب لباس پہنتے ہیں کیونکہ ہم نے دیکھ رکھا ہے کہ دنیا کے نظام میں ان ضروریات کو رفع کرنے کے لیے یہی اشیاء استعمال ہوتی ہیں۔

پس (اس لحاظ سے) ہمارا فعل ہماری سوچ پر منحصر ہوتا ہے اور یہ ہماری سوچ کے بعد واقع ہوتا ہے، جب کہ ہماری سوچ دنیا کے نظام پر منحصر ہوتی ہے اور یہ سوچ اس نظام کے بعد واقع ہوتی ہے۔ نتیجے کے طور پر ہمارا فعل دنیا کے نظام سے دو قدم پیچھے ہوتا ہے لیکن خدا جو دنیا کا یا اس کے ایک ایک گوشے کا نظام چلاتا ہے خود دنیا کا خارجی نظام اس کا فعل ہے، اور یہ بات قرینِ عقل نہیں کہ اس کا کام کسی ایسی سوچ کا نتیجہ ہو جسے اس نظام سے حاصل کیا گیا ہو جو پہلے ہی سے موجود ہو۔ (یہ نکتہ قابلِ غور ہے)۔

خُدا درجۂ کمال کی صفات کا مالک ہے

کمال کیا ہے؟ ایک گھر اس وقت کامل ہوتا ہے جب اس میں ایک خاندان کے لیے زندگی گزارنے کی تمام سہولتیں موجود ہوں۔ مثلاً گھر والوں کے رہنے اور مہمانوں کو بٹھانے کے لیے اس میں کافی کمرے موجود ہوں۔ کھانا پکانے کے لیے باورچی خانہ ہو، غسل خانہ ہو اور بیت الخلاء وغیرہ ہو۔ پس جس قدر یہ سہولتیں کم ہوں گی اتنا ہی وہ گھر ناقص ہوگا۔

تھوڑی سی توجّہ دینے سے یہ حقیقت انسان پر واضح ہوجاتی ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی بجز اس کے کہ بعض اوقات انسان زندگی کے جھمیلوں میں اس قدر اُلجھ جائے کہ اپنے شعور کی تمام قوّت دنیاوی گتھیاں سُلجھانے اور اپنا تمام وقت زندگی کی بھاگ دوڑ میں صَرف کردے اور اس قسم کے خیالات کی طرف توجّہ دینے کی اُسے فرصت ہی نہ ملے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت سے غافل ہوجاتا ہے یا فطرت کی ظاہری دلفریبیوں سے متاثّر ہوکر عیش وعشرت میں پڑجاتا ہے۔ چُونکہ حقیقتوں کی پابندی مادیّت کی بہت سی آزادیوں سے روکتی ہے، اس لیے انسان فطری طور پر اس حقیقت اور اسی طرح کی دوسری حقیقتوں کی جستجو کرنے سے اجتناب کرتا ہے اور ان کی پابندی نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے مخلوقات کی پیدائش اور اس پر حاوی نظام کا ذکر مختلف طریقوں سے کیا ہے اور اس کے متعلق ثبوت فراہم کیے ہیں کیونکہ اکثر لوگ، بالخصوص وہ لوگ جو فطرت کی ظاہری رعنائیوں پر فریفتہ ہیں اور عیش وعشرت کی زندگی کو ہی خوش نصیبی کی علامت سمجھتے ہیں، وہ مادّی اور محسوس کی جانے والی

چیزوں سے لگاؤ کی بنا پر فلسفیانہ سوچ بچار اور دقیق عقلی نظریات کے مطالعے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

تاہم انسان ہر حالت میں دُنیا کا جزو ہے اور دُنیا کے دوسرے اجزاء سے اور ان مفصّل اور عام نظاموں سے جو اس پر حکومت کررہے ہیں ایک لحظے کے لیے بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا اور جب چاہے اپنے ذہن کو دنیا اور اس پر حاوی نظام کی طرف متوجّہ کرسکتا ہے اور پیدا کرنے والے اور پالنے والے (یعنی خدا) کے وُجود کو سمجھ سکتا ہے۔

خداوند تعالی اپنے کلام میں فرماتا ہے:

"آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ان کی رہنمائی توحید کی جانب کرتی ہیں اور تمھاری اپنی اور جانوروں کی پیدائش میں بھی جنھیں خُدا زمین پر پھیلاتا رہتا ہے یقین رکھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو انھیں خُدا کی وحدانیّت سے رُوشناس کراتی ہیں۔ اور دن اور رات میں جو فرق پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ کبھی برابر اور کبھی ایک دوسرے سے بڑے چھوٹے ہوتے ہیں اور کبھی زیادہ گرم اور کبھی زیادہ سرد ہوتے ہیں، اس میں اور اس بارش میں جو خدا آسمان (کی طرف) سے نازل کرتا ہے اور اس کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے اور اسی طرح ہواؤں کے رُخ کی تبدیلی میں عقل مند لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جن کی وجہ سے وہ سچّے دین کا اعتراف کرتے ہیں۔"

(سُورۂ جاثیہ۔ آیات ۳ تا ۵)

توضیح

قرآن مجید کی بہت سی آیتیں ہیں جن میں انسان کو آسمان، سورج چاند، ستاروں، زمین، درختوں، پہاڑوں، سمندروں، حیوانوں اور انسانوں کی پیدائش پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور اس حیرت انگیز نظام کی جانب توجّہ دلائی گئی ہے جو ان سب چیزوں میں کارفرما ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ پیدائش کا کارخانہ اور وہ نظام جو دنیا کی گوناگوں سرگرمیوں کو تخلیق اور ہستی کے مقاصد کی جانب بڑھا رہا ہے بے حد حیران کُن ہے۔ گندم کا دانہ یا بادام کی گٹھلی جو زمین سے اُگتی ہے، ایک خوشہ دار پودا یا میوہ دار درخت بن جاتی ہے اور اس وقت سے جب کہ وہ دانہ یا گٹھلی زمین کے پیٹ میں قرار پاتی ہے، پھر پھٹ جاتی ہے، اس کی سبز نوک باہر نکل آتی ہے اور سفید جڑ زمین کے دل میں پیوست ہو جاتی ہے، اس کے منزلِ مقصود پر پہنچنے تک اتنی بڑی اور وسیع تنظیمیں کام کرتی ہیں کہ ان کی عظمت اور وسعت دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ستارے، چاند، سورج اور زمین سبھی اپنے محوری اور انتقالی حرکت اور پوشیدہ قوتوں کے ساتھ اور اسی طرح دانے یا گٹھلی میں رکھی گئی پُراسرار قوّت، سال کے چاروں موسم، فضا کی کیفیت، بارش، ہوا، رات اور دن سبھی مل کر مثال کے طور پر گندم کے ایک پودے کی پیدائش کے سلسلے میں خدمات انجام دیتے ہیں اور اس نئے منظر کو جسے انھوں نے پرورش کے جھولے میں لٹا رکھا ہے، دایوں اور آیاؤں کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی جانب بڑھاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی نشو و نما کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح انسان کے ایک نومولود بچّے کی پیدائش جو نباتات کے ایک نومولود یا کسی دوسرے مظہر کی پیدائش سے زیادہ پیچیدہ چیز ہے، تخلیق کے پیچیدہ اور منظم کارخانے کی کروڑوں بلکہ اربوں سال کی کارگزاری کا نتیجہ ہے۔ ایک انسان کی روزمرّہ کی زندگی کا دور اُن تعلّقات کے علاوہ جو وہ اپنے وجود سے باہر کی کائنات سے رکھتا ہے، اس کے وجود کے حیرت انگیز اندرونی نظام سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو صدیوں پر پھیلا ہُوا ہے۔ دُنیا کے سائنس دان اس کی ظاہری کیفیت پر توجّہ مرکوز کرکے ہر روز اس کے اَسرار پر سے ایک نیا پردہ اٹھاتے ہیں لیکن ابھی تک ان کی معلومات ان حقائق کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہیں جو تاحال دریافت نہیں ہو سکے۔ لہذا اگر ایک شخص وہ چیزیں رکھتا ہو جو ایک طبیعی انسان کے وجود کے ڈھانچے کے لیے ضروری ہیں تو وہ کامل ہوگا لیکن اگر اس میں ان میں سے کسی ایک کی کمی ہو مثلاً اگر اس کا ہاتھ یا پاؤں یا آنکھ نہ ہو تو وہ اس حد تک ناقص ہوگا۔

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے، اس کی بنا پر **کمال کی صفت** وہ چیز ہے جو ہستی کی کسی ضرورت کو رفع کرے اور نقص کو دور کرے۔ مثلاً **عِلم کی صفت** جو جہالت کے اندھیرے کو دُور کرتی ہے اور جو چیز معلوم ہو اُسے لوگوں پر واضح کرتی ہے۔ اسی طرح **قدرت کی صفت** جو قدرت رکھنے والے شخص کے لیے اس کی خواہشات کا حصول ممکن بناتی اور اُسے ان پر مسلّط کرتی ہے۔ چنانچہ **زندگی** اور **اِحاطہ** ایسی دیگر صفات کی بھی یہی صُورت ہے۔

ہمارا وجدان (قُوّتِ تمیز) یہ کہتا ہے کہ دنیا کا پیدا کرنے والا (یعنی وہ جو دُنیا اور اس میں جو کچھ ہے اس کی ہستی کا سرچشمہ ہے)، ہر ممکن ضرورت

پُوری کرتا ہے اور ہر نعمت اور کمال عنایت کرتا ہے) کمال کی تمام صفات رکھتا ہے کیونکہ حقیقت پسندی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے یہ ہرگز تصوّر نہیں کیا جاسکتا کہ جو کوئی خُود حاجت مند ہو وہ دُوسروں کی حاجتیں رفع کر سکے۔

خُدا بھی قرآن مجید میں کمال کی تمام صفات کے ساتھ اپنی ستائش کرتا ہے اور اپنا تعارف ایک ایسی ہستی کے طور پر کراتا ہے جو ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔

ارشاد ہُوا ہے:

"صِرف اور صِرف وہی ہے جو مطلق طور پر مالک اور بے نیاز ہے اور ہر حاجت مند کی حاجت رفع کرتا ہے"۔ (سورۂ انعام - آیت ۱۳۳)

ایک اَور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

"اچھّے اچھّے ناموں اور صفات کا مالک وہ خُدا ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں"۔ (وہی ہے جو زندہ، دانا، بینا، سننے والا طاقت والا، پیدا کرنے والا اور بے نیاز ہے)۔ (سورۂ طٰہٰ - آیت ۸)

لہذا خُدا کو کمال کی صفات کا مالک اور اس کی مقدّس ہستی کو ہر نقص اور عیب سے پاک سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر اس میں کوئی نقص ہوتا تو اس نقص کی بنا پر وہ ضرورت مند ہوتا اور لازم تھا کہ اس سے بھی بالاتر ایک خُدا ہوتا جو اس کی ضرورت پوری کرتا۔

سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِكُوۡنَ ۔ (سورۂ یونسؑ - آیت ۱۸)

خُدا کی قُدرت اور اس کا علم

جب ایک عقلمند انسان اس وسیع دُنیا کے ایک دُوسرے سے پیوستہ اجزاء

اس کی حسبِ معمول حیرت انگیز گردش اور اس کے چپّے چپّے پر محیط ان عظیم نظاموں کا مشاہدہ کرتا ہے جن کے نتیجے میں مختلف مظاہر پُورے نظم اور ترتیب کے ساتھ اپنے مخصوص ہدف اور مقصد کی جانب رواں دواں ہیں تو وہ بخوبی سمجھ جاتا ہے کہ اس دنیا اور اس میں موجود ہر چیز کے وجود اور بقا کا سرچشمہ ایک ایسا وجود ہے جسے فنا نہیں اور جس نے اپنی لامحدود قدرت اور بے پایاں علم کے ذریعے ساری کائنات کو پیدا کیا ہے۔ وہی اپنی مخلوق کے ہر فرد کی پرورش کر کے اپنی خاص عنایت کے ساتھ اس کی رہنمائی اس کے درجۂ کمال کی جانب کرتا ہے۔ وہی ہے جس کی ہستی کو فنا نہیں، وہ ہر چیز کا مالک ہے اور اس پر قدرت رکھتا ہے۔

خُداوندِ عالم قرآنِ مجید میں فرماتا ہے :

"آسمانوں اور زمین کا مالک اور فرماں روا صِرف خُدا ہے، وہی زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے اور وہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، وہی ہے جو اوّل، آخر، ظاہر اور باطن ہر طرف سے ہر چیز کا احاطہ کیے ہُوئے ہے اور وہی ہے جو سب چیزوں کو جانتا ہے۔" (سورۂ حدید-آیت ۲-۳)

ایک اور آیت میں ارشاد ہوا ہے :

"کائنات پر حقیقی سلطنت فقط اللہ کی ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔" (سورۂ مائدہ-آیت ۱۷)

توضیح

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص موٹر کار خریدنے کی طاقت رکھتا ہے تو

ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ موٹر کار خریدنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے، (یعنی کافی روپیہ) وہ اس کے پاس ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بیس سیر وزنی پتھر اُٹھانے کی طاقت رکھتا ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر بیس سیر وزنی پتھر اُٹھانے کی قوّت ہے۔

بہرحال کسی چیز کے متعلق قدرت اور قوّت رکھنا اس چیز کے حصول کا لازمی ذریعہ ہے۔ چُونکہ دُنیا میں جس مظہر کے وارد ہونے کا امکان ہو اس کی ضروریات خُدا کے ذریعے ہی رفع ہوسکتی ہیں لہذا یہ کہنا چاہیے کہ خُدا ہر چیز پر قادر ہے اور اسی کی پاک ذات ہستی کا سرچشمہ ہے۔

ایک اور آیت میں خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"کیا خُدا اسے نہیں جانتا جسے اس نے خود پیدا کیا ہے۔"

(سورۂ ملک - آیت ۱۴)

لہذا جب ہر موجود اپنی پیدائش اور ہستی کے بارے میں خدا کی لامحدود ہستی کا محتاج ہے تو یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کسی پردے کی موجودگی فرض کرلی جائے یا یہ سمجھا جائے کہ وہ خدا کی نگاہ سے اوجھل ہے بلکہ ہر چیز اس پر عیاں ہے اور وہ ہر چیز کے ظاہر و باطن پر مسلّط ہے اور اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

عَدل

خُدا عادل ہے کیونکہ عدل کمال کی صفات میں سے ایک ہے اور خُداوندِ عالَم کمال کی تمام صفات کا مالک ہے۔ علاوہ ازیں وہ خود اپنے کلام میں عدل کی توثیق کرتا ہے، ظلم وستم کو بُرا گردانتا ہے، لوگوں کو عدالت کا حکم دیتا ہے

اور ظلم سے منع فرماتا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کسی چیز کو بُرا کہے اور وہ بُری صفت خود اس میں موجود ہو یا وہ کسی چیز کو اچّھا کہے اور وہ صفت خود اس میں موجود نہ ہو۔

قرآنِ مجید ارشاد فرماتا ہے:

"خدُا ایک ذرّے کے وزن کے برابر بھی کِسی پر ظلم نہیں کرتا۔"

(سورہٗ نساء - آیت ۴۰)

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے۔

"خدُا کسی موجود پر ظلم نہیں کرتا۔" (سورہٗ کہف - آیت ۴۹)

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

"خدُا یہ نہیں چاہتا کہ اپنے بندوں پر ظلم کرے۔"

(سورہٗ مؤمن - آیت ۳۱)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

"جو نیکی تجھے پہنچتی ہے وہ خدُا کی طرف سے ہے اور جو بدی تجھے پہنچتی ہے وہ خوُد تیری طرف سے ہے۔"

(سورہٗ نساء - آیت ۸۰)

ایک دُوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

"وہ خدُا ہے جس نے جو چیز بنائی ہے اچھّی بنائی ہے۔"

(سورہٗ سجدہ - آیت ۷)

لہذا ہر چیز اپنی جگہ پر نہایت عمدہ بنائی گئی ہے۔ بُرائی، عیب یا نقص جو بعض چیزوں میں دیکھنے میں آتا ہے وہ مقابلے اور نسبت کی رُو سے ہے۔ مثلاً سانپ اور بچھّو کا وجود انسان کے مقابلے میں بُرا اور قابلِ نفرت ہے۔

اسی طرح اگر کانٹے کا مقابلہ پھول سے کیا جائے تو کانٹا کوئی خوبصورت چیز نہیں لیکن اپنے اپنے مقام پر تمام چیزیں حیرت انگیز اور سرتا پا خوبصورت ہیں۔

بلاشبہ خدا نے انسان کے بعض اختیاری اعمال کو شریعت کے نقطۂ نظر سے بُرے کاموں میں شمار کیا ہے اور ان سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ اعمال مختلف قسم کے گناہ ہیں۔ مثلاً شرک، وَالِدَیْن کی نافرمانی، کسی شخص کو بے گناہ قتل کرنا، شراب نوشی، قمار بازی اور ان کے علاوہ ہر ایسا کام جس سے دین کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

اِس قسم کے اعمال کو گناہ کہا جاتا ہے۔ چُونکہ یہ احکامِ دین کی خلاف ورزی اور مخالفت پر مبنی ہیں اِس لیے بُرے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص ان کا ارتکاب اختیاری طور پر کرے تو ان کے لیے جواب دہ ہے اور سزا کا مستحق ہے۔

رحمت

ہم بعض اوقات کِسی بے کس، حاجت مند کو دیکھتے ہیں تو اپنی ہمّت کے مطابق اس کی حاجت روائی کرتے ہیں، کِسی کمزور شخص کو سہارا دیتے ہیں یا کسی نابینا شخص کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ اِس قسم کے کاموں کو ہم مہربانی یا رحمت شمار کرتے ہیں اور انھیں اچھّا سمجھتے ہیں۔

جو کام بے نیاز پروردگار انجام دیتا ہے وہ رحمت کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتے۔ کیوں کہ وہ سبھی کو اپنی نعمتوں سے بہرہ ور کرتا ہے اور گو وہ خود کسی کا محتاج نہیں لیکن مناسب حد تک موجودات کی حاجت برآری کرتا ہے۔

چنانچہ فرماتا ہے کہ

"جو کچھ تم نے مانگا، اس میں سے مناسب حد تک

تمھیں دیا۔" (سورۂ ابراہیمؑ۔ آیت ۳۴)

نیز فرماتا ہے کہ

"میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے"۔ (سورۂ اعراف۔ آیت ۱۵۶)

کمال کی دُوسری صفات

قرآنِ مجید میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے :

"تمھارا پروردگار ہر چیز کا مالک، بے نیاز مطلق اور اپنی مخلوق پر مہربان ہے۔" (سورۂ انعام۔ آیت ۱۳۴)

توضیح

دُنیا میں جو خُوبی اور خوبصورتی ہے اور کمال کی جس صِفَت کا بھی ہم تصوّر کرتے ہیں وہ ایک نعمت ہے جو خُدا نے اپنے بندوں کو عطا فرمائی ہے اور اس کے ذریعے سے مخلوق کی ایک ضرورت پوری کی ہے۔ بلاشبہ اگر اس ربِّ جلیل کو خود یہ کمال حاصل نہ ہوتا تو وہ اسے دوسروں کو بھی نہ بخش سکتا اور ضروریات کے معاملے میں وہ بھی دوسروں کے ساتھ شریک ہوتا۔ پس خدا خود کمال کی تمام صفات کا مالک ہے اور بغیر اس کے کہ دوسرے سے کوئی کمال حاصل کرے یا دستِ سوال دراز کرے، وہ بذاتِ خُود کمال کی تمام صفات مثلاً زندگی علم اور قدرت وغیرہ سے متّصف ہے اور اس میں کسی ناقص صفت کے ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں کہ جس سے احتیاج کا پہلو نکلتا ہو (مثلاً کمزوری، نادانی، موت، پریشانی وغیرہ)۔

نبوّت

اس کے باوجود کہ خُدا ہر لحاظ سے بے نیاز ہے، اس نے اپنی قُدرتِ کاملہ سے گوناگوں موجودات پر مشتمل دُنیا کو پیدا کیا اور انھیں بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ انسان اور ہر جاندار اپنی پیدائش کے پہلے دن سے اپنی زندگی کے آخری دن تک خدا کے زیرِ پرورش رہتا ہے۔ اس کی رہنمائی ایک خاص نظم اور تربیت کے ساتھ ایک جانے بوجھے اور مقررہ مقصد کی جانب کی جاتی ہے اور وہ اس کی جانب بڑھتا رہتا ہے۔ اس دوران میں خُدا کی عنایت ہر لمحے اس کے شاملِ حال رہتی ہے۔

اگر ہم فقط اپنی زندگی کے مختلف ادوار پر غور کریں یعنی اپنی شیر خوارگی بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے زمانوں پر نظر ڈالیں تو ہمارا وجدان اس بھرپور عنایت کی گواہی دے گا جو خدا ہم پر فرماتا ہے۔ اپنے اسی لُطف و کرم اور مہربانی کی بنا پر وہ ہمیشہ اپنی مخلوق کی بھلائی کا خیال رکھتا ہے اور کبھی بھی حکمت اور مصلحت کے بغیر اس کے کام میں بگاڑ پیدا نہیں ہونے دیتا۔ انسان بھی خدا کی ایک مخلوق ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی بھلائی اور خوش نصیبی اسی میں ہے کہ اس کے عقائد صحیح، اخلاق پسندیدہ اور کردار نیک ہو۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ کہے کہ انسان اپنی خداداد عقل کی بدولت نیکی اور بدی کو پہچان سکتا ہے اور گڑھے اور راستے میں تمیز کر سکتا ہے تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تنہا عقل اس مشکل کو حل نہیں کر سکتی اور وہ حقیقت پسندی اور نیکوکاری کی طرف انسان کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہے کیونکہ معاشرے میں جو بُرے اور ناجائز کام دیکھنے میں آتے ہیں انھیں انجام دینے والے سبھی

عقل اور قوّتِ تمیز رکھتے ہیں لیکن خود غرضی، لالچ اور نفسانی خواہشات کے زیرِ اثر ان کی عقل جذبات سے مغلوب ہوگئی ہے اور وہ ہوا وہوس کے بندے بن کر سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ خدا نیک بختی کی طرف ہماری رہنمائی ایک نئے راستے اور ایسے وسیلے سے کرے جو ہوا وہوس سے ہرگز مغلوب نہ ہو اور رہنمائی کے معاملے میں کوئی غلطی نہ کرے۔ پس ایسا راستہ نبوّت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔

نبوّت کا ثبوت

ہم نے توحید کے بارے میں جو بحث کی ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ خدا ہی نے مختلف چیزیں پیدا کی ہیں اور ان کی پرورش بھی وہی کرتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا ہر مظہر اپنی پیدائش کے پہلے لمحے سے اپنی بقا اور تعمیرِ ذات کے لیے سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے اپنی خامیوں کو دُور اور ضرورتوں کو پورا کر لیتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو کامل اور خود کفیل بنا لیتا ہے۔ وہ بقا کے راستے پر جو منظّم سفر کرتا ہے اور اس کے دوران اپنے وجود کو قائم رکھتا ہے تو بلاشبہ خُدا ہی اس کے اس سفر کا منتظم اور ہر منزل پر اس کی رہنمائی کرنے والا ہے۔

اس نظریے کے مطابق ہم اس قطعی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دنیا کے مظاہر کی ہر قسم اپنے دورانِ زیست میں پیدائشی طور پر ایک خاص لائحہ کار رکھتی ہے جس پر وہ اپنی مخصوص مساعی کے ذریعے عملدرآمد کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں دُنیا کے مظاہر کی زندگی کے سفر میں ان کے ہر مخصوص گروہ کی کچھ خاص ذمّے داریاں ہوتی ہیں جن کی جانب خدا ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

اِس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:

"ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو ایک مخصوص شکل میں تخلیق کیا اور پھر اس کی رہنمائی کی (یعنی اسے زندگی گزارنے کے طریقے بتائے)۔" (سورۂ طٰہٰ - آیت ۵۰)

اِس حکم کا اطلاق مخلوق کے سب گروہوں پر ہوتا ہے اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ آسمان کے ستارے، ہمارے پاؤں کے نیچے واقع زمین، اس میں موجود تمام عناصر اور وہ ترکیبیں جو ابتدائی مظاہر کو ظاہر کرتی ہیں نیز نباتات و حیوانات سبھی کی یہی کیفیّت ہے۔

اِس عام رہنمائی کے سلسلے میں انسان کی حالت بھی دُوسرے مظاہر جیسی ہے تاہم اس میں اور دوسروں میں ایک فرق ہے۔

انسان اور دُوسری موجودات میں فرق

مثال کے طور پر کُرّۂ ارض کو لیجیے۔ یہ کروڑوں سال پہلے پیدا کیا گیا تھا اور جہاں تک مخالف عوامل اجازت دیتے ہیں یہ اپنی تمام پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لاکر سرگرمِ عمل ہے اور اپنی محوری اور انتقالی حرکت کی بدولت اپنے وجود کے آثار کو ظاہر کر کے اپنی بقا کو محفوظ کرتا ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی اس سے زیادہ طاقتور عامل اس کا راستہ نہ روک لے یہ اپنا عمل جاری رکھے گا اور اپنا کوئی فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرے گا۔

مثلاً بادام کے درخت کو لیجیے۔ گٹھلی سے باہر آنے کے وقت سے لے کر مکمل درخت بننے تک اس پر اپنی غذا اور نشوونما کے سلسلے میں (یا دُوسرے الفاظ میں اس کے دورانِ سفر میں) ایسے فرائض عائد ہوتے ہیں کہ اگر کوئی اس سے

زیادہ طاقت ور عامل سدِّ راہ نہ بن جائے تو یہ ان فرائض کو انجام دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کرتا اور نہ ہی کر سکتا ہے۔

دُوسرے مظاہر کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔تاہم انسان اپنے مخصوص کام اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے اور جو کام وہ کرتا ہے اس کا سرچشمہ اس کی سوچ اور ارادہ ہوتا ہے۔ انسان بعض اوقات ایک ایسا کام انجام دینے سے پہلو تہی کرتا ہے جس میں اس کا سو فی صد فائدہ ہوتا ہے اور جس کے انجام دینے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہوتی مگر وہ جان بُوجھ کر ایک ایسے کام کا انتخاب کرتا ہے جس میں اس کا سو فی صد نقصان ہوتا ہے۔بعض اوقات وہ تریاق پینے سے انکار کر دیتا ہے اور بعض اوقات زہر کا پیالہ پی کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

یہ امر بلاشبہ واضح ہے کہ جو موجود مختار پیدا کیا گیا ہو اس پر عام خداوندی ہدایت کا اطلاق زبردستی نہیں کیا جاسکتا۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ خدا کی طرف سے بھلائی اور بُرائی کا راستہ واضح کرتے ہیں اور دین کی پیروی نہ کرنے والوں کو خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔جب کہ لوگ ان دونوں (یعنی بھلائی یا بُرائی) میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے میں آزاد اور خُود مختار ہوتے ہیں۔

یہ دُرست ہے کہ انسان عقل کے ذریعے سے ایک حد تک اپنی بھلائی بُرائی اور نفع نقصان کو سمجھ سکتا ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عقل دیکھتی رہ جاتی ہے اور انسان نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے غلط راستے پر لگ جاتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ہدایتِ خداوندی عقل کے علاوہ کسی دُوسرے ذریعے سے بھی میسّر ہو جو غلطی اور لغزش سے قطعی طور پر محفوظ ہو یا دوسرے

الفاظ میں جو احکام خُدا مختصر طور پر لوگوں کو عقل کے ذریعے سمجھاتا ہے، ان کی تائید کسی دُوسرے ذریعے سے بھی کرے۔

یہ ذریعہ نبوّت ہے کہ جس کے مطابق خُدا اپنے مبارک احکام وحی کی صورت میں اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو سمجھاتا ہے اور اسے یہ ذمّے داری سونپتا ہے کہ وہ ان احکام کو لوگوں تک پہنچائے اور انھیں شوق اور خوف دلا کر ان کی پیروی کرنے پر آمادہ کرے۔

خُدا اپنے کلام میں فرماتا ہے:

"(اے رسولؐ!) ہم نے تمھارے پاس بھی اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد والے پیغمبروں پر بھیجی تھی ...... اور ہم نے دین کی پیروی کرنے والوں کو خوش خبری دینے والے اور سرکشی کرنے والوں کو عذاب سے ڈرانے والے پیغمبر بھیجے تاکہ اس قسم کی ہدایت میسّر نہ ہونے کی بنا پر لوگوں کو خُدا پر کوئی حجّت باقی نہ رہ جائے۔" (سورۂ نساء - آیات ۱۶۳ تا ۱۶۵)

ایک نبی کی صفات

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خدا اپنے بندوں میں سے چند ایک کو ایسے معارف اور قوانین عطا کر کے جو انسانوں کی خوش بختی کے ضامن ہیں ان کی جانب بھیجے۔

جو شخص خدا کا پیغام لے کر آتا ہے وہ پیغمبر یا رسول کہلاتا ہے اور وہ تمام پیغامات جو وہ خدا کی طرف سے لاتا ہے مجموعی طور پر دین کہلاتے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ ایک پیغمبر کے لیے مندرجۂ ذیل

صفات ضروری ہیں :

(۱) اپنا فریضہ انجام دینے کے لیے وہ ہر خطا سے محفوظ اور معصوم ہو اور بھول چوک یا کوئی اور ذہنی نقص اس میں موجود نہ ہو تاکہ جو کچھ اسے خُدا کی جانب سے عنایت کیا گیا ہے وہ اسے کسی لغزش یا غلطی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دے۔ کیونکہ دوسری صورت میں ہدایتِ خداوندی اپنا مقصد حاصل نہ کر پائے گی، عام ہدایت کا قانون اپنی عمومیت کھو بیٹھے گا اور انسان کے معاملے میں مؤثر ثابت نہیں ہوگا۔

(۲) وہ اپنے کردار اور گفتار میں ہر قسم کی لغزش اور گناہ سے پاک ہو کیونکہ گناہ تبلیغ کا اثر زائل کر دیتا ہے۔ جس شخص کا کردار اس کے قول کے خلاف ہو لوگ اس کے قول کو کوئی اہمیّت نہیں دیتے بلکہ اس کے کردار کو اس کے جھوٹا اور عیّار ہونے کا ثبوت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اگر اس کا کہنا صحیح ہوتا تو وہ اپنے کہے کے مطابق عمل بھی کرتا۔"

ان دونوں باتوں کو ایک جگہ جمع کرکے کہا جاسکتا ہے کہ تبلیغ کے صحیح اور مؤثر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پیغمبر غلطی اور گناہ سے پاک ہو۔ خُداوندِ متعال بھی اپنے کلام میں اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ

> "وہی غیب دان ہے اور اپنی غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا بجُز اس کے جسے وہ اس کام کے لیے پسند کرتا ہے (پسندیدہ پیغمبر) اور اس صورت میں خُدا اس کی نگہبانی کا اہتمام کرتا ہے تاکہ خداوندی پیغامات بے کم و کاست لوگوں تک پہنچ جائیں۔" (سورۂ جن - آیات ۲۶ تا ۲۸)

(۳) اس میں عِفّت، شجاعت، عدالت وغیرہ جیسی اخلاقی خوبیاں موجود ہوں کیونکہ ان سب کا شمار پسندیدہ صفات میں ہوتا ہے۔ اور جو شخص گناہوں سے پاک ہو اور دین کی پوری پوری متابعت کرتا ہو اس کا دامن گھٹیا اخلاق سے ہرگز داغدار نہیں ہوتا۔

پیغمبروں کا بنی نوع انسان میں سے ہونا

تاریخ کی رُو سے یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ بنی نوعِ انسان کے درمیان پیغمبر ہوئے ہیں اور انھوں نے لوگوں کو دینِ حق کی دعوت دی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی زندگی کی تاریخ زیادہ واضح نہیں ہے۔ فقط حضرت محمدؐ ایک ایسے پیغمبر ہیں جن کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کوئی ابہام نہیں۔ اور قرآن مجید آنحضرتؐ پر نازل کی گئی آسمانی کتاب ہے جو دین اسلام کے بلند اور اعلیٰ مقاصد کو بیان کرنے کے علاوہ سابقہ پیغمبروں کی دعوت کا ذکر کرتی ہے اور ان کے اغراض و مقاصد بھی بیان کرتی ہے۔

قرآن مجید اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ خدا کی جانب سے پیغمبر لوگوں کی طرف آئے ہیں اور ان سب نے توحید اور دینِ حق کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ

> "آپؐ سے پہلے ہم نے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا بجُز اس کے کہ اسے وحی کی کہ میرے سوا کوئی خُدا نہیں۔ پس صِرف میری پرستش کرو۔" (سورۂ انبیاء۲۱ ۔ آیت ۲۵)

اولوالعزم پیغمبر اور دوسرے پیغمبر

جن پیغمبروں پر آسمانی کتابیں نازل ہوئیں اور جن کی تعلیمات مستقل تھیں وہ پانچ ہیں :- یعنی **حضرت نوح**ع، **حضرت ابراہیم**ع، **حضرت موسیٰ**ع، **حضرت عیسیٰ**ع اور **حضرت محمد**ص - ان کی جانب مندرجہ ذیل آیت میں اشارہ کیا گیا ہے :

"اس نے تمھارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا جس کا نوحع کو حکم دیا تھا اور (اے رسولص!) اسی کی ہم نے تمھارے پاس وحی بھیجی ہے اور اسی کا ابراہیمع، موسیٰع اور عیسیٰع کو بھی حکم دیا تھا کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔"

(سورۂ شوریٰ - آیت ۱۳)

یہ پانچ بزرگوار جو صاحبِ کتاب اور صاحبِ شریعت ہیں، اولوالعزم پیغمبر کہلاتے ہیں - تاہم فقط یہی پانچ حضرات ہی پیغمبر نہیں بلکہ ہر امّت کی جانب خدا نے پیغمبر بھیجا ہے - چنانچہ پیغمبروں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن قرآن مجید میں جن پیغمبروں کے نام بتائے گئے ہیں وہ پچیس سے زیادہ نہیں - جیساکہ خُدا فرماتا ہے :

"ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم سے بیان کر دیے اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات تم سے نہیں کہے۔"

(سورۂ مومن - آیت ۷۸)

اور پھر فرماتا ہے :

"اور ہر اُمّت کا ایک خاص رسول ہوا ہے۔" (سورۂ یونس - آیت ۴۷)

علاوہ ازیں فرماتا ہے :

"اور ہر قوم کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہے۔" (سورۂ رعد آیت ۷)

ہر اُولوالعزم پیغمبر کے بعد جو پیغمبر آئے انھوں نے لوگوں کو اس اولوالعزم پیغمبر کی شریعت کی جانب دعوت دی اور اس طرح بعثت اور دعوت کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ خُدا نے پیغمبروں کا یہ سلسلہ ختم کرنے اور آخری قوانین اور مکمّل ترین دینی ضوابط نافذ کرنے کے لیے پیغمبر اکرم حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کی آسمانی کتاب آخری آسمانی کتاب قرار پائی۔ نتیجے کے طور پر آنحضرتؐ کا دین قیامت تک باقی رہے گا اور ان کی شریعت ہمیشہ زندہ رہے گی۔

حضرت نوُح علیہ السلام

وہ پہلے پیغمبر کہ جنھیں خُدا نے شریعت اور آسمانی کتاب کے ساتھ عالمِ بشریت میں مبعوث فرمایا، حضرت نوحؑ تھے۔ حضرت نوحؑ نے اس زمانے کے لوگوں کو توحید اور خدائے واحد کی پرستش کرنے اور شرک اور بُت پرستی سے اجتناب برتنے کی دعوت دی، جیساکہ قرآنِ مجید میں بیان کردہ ان کے قصے میں مذکور ہے۔ انھوں نے طبقاتی اُونچ نیچ دُور کرنے اور ظلم وستم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے سخت جدّوجہد کی اور اپنی تعلیمات لوگوں تک ایسے دلائل کے ساتھ پہنچائیں جو ان کے لیے نئے اور اچھوتے تھے۔

حضرت نوحؑ بڑی مدّت تک ان نادان، ضدّی اور سرکش لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے لیکن بہت کم لوگوں کو ہدایت نصیب ہوئی۔ آخر خدائے تعالیٰ نے ایک زبردست طوفان کے ذریعے کُفّار کو ہلاک کرکے دُنیا کو ان کے وُجود

سے پاک کر دیا۔ تب حضرت نوحؑ اور ان کے چند پیروؤں نے جو اس طوفان سے بچ گئے تھے اس دنیا میں ایک دینی معاشرے کی از سرِ نو بنیاد ڈالی۔

یہ جلیل القدر پیغمبر شریعتِ توحید کے بانی اور خُدا کے بھیجے ہوئے وہ پہلے رسول ہیں کہ جنھوں نے ظلم و ستم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کی۔ انھوں نے سچّائی اور دینِ حق کی جو خدمت کی اس کے صِلے میں خدا نے انھیں درود و سلام کے تحفے سے نوازا جو رہتی دنیا تک زندہ اور پائندہ رہے گا:

"ساری خدائی میں نوحؑ پر سلام ہے"۔

(سُورۂ صافّات۔ آیت ۷۹)

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت نوحؑ کے بعد ایک بڑی مدّت گزر گئی۔ اگرچہ اس دوران میں، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور بہت سے دوسرے پیغمبروں نے لوگوں کو توحیدِ الٰہی اور نیکوکاری کی جانب بلایا لیکن شرک اور بُت پرستی بڑھتی گئی حتّٰی کہ ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اس موقع پر خُدا نے اپنی حکمتِ بالغہ سے حضرت ابراہیمؑ کو مبعوث فرمایا۔

حضرت ابراہیمؑ ایک فطری انسان کا کامل نمونہ تھے۔ انھوں نے اپنی پاک و پاکیزہ سرشت کے ساتھ حقیقت کی جستجو کی۔ خدا کی وحدانیت کو پہچانا اور جب تک زندہ رہے ظلم اور شرک سے برسرِ پیکار رہے۔

جیسا کہ قرآن مجید سے ظاہر ہے اور ائمۂ اہلِ بیتؑ کی روایت کردہ احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنا بچپن لوگوں کے شور و غل اور شہری ہنگاموں سے معمور زندگی سے دُور ایک غار میں گزارا، وہاں فقط وہ اپنی والدہ کو دیکھ پاتے تھے جو کبھی کبھی ان کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر آتی تھیں۔

ایک دن وہ اپنی والدہ کے ساتھ شہر آئے۔ یہاں وہ اپنے چچا سے ملے جس کا نام آزر تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی نظر جس چیز پر پڑتی وہ ان کے لیے نئی اور حیرت انگیز ہوتی، وہ ہر چیز کو بڑے تعجّب سے دیکھتے، اس کی پیدائش پر غور کرتے اور تخلیق کا بھید جاننے کی کوشش کرتے۔ انھوں نے دیکھا کہ آزر اور دوسرے لوگ بُت تراش کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے ان کے اس فعل کی حقیقت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے بُتوں کے پروردگار ہونے کے بارے میں وضاحت پیش کی۔ اس سے ان کی تسلّی نہیں ہوئی۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ لوگ ستارہ زہرہ کی پرستش کرتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو سورج اور چاند کو پوجتے ہیں۔ تاہم چونکہ یہ سب چیزیں کچھ وقت گزرنے کے بعد غروب ہوگئیں اس لیے آپ کو ان کے پروردگار ہونے کا بھی یقین نہیں آیا۔

اِن مرحلوں سے گزرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے بلاخوف وخطر اعلان کردیا کہ وہ فقط خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں اور شرک اور بُت پرستی سے بیزار ہیں۔ چنانچہ آپ بُت پرستی اور شرک کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور بُت پرستوں کو توحید کی جانب دعوت دی۔

ایک دن حضرت ابراہیمؑ بُت خانے میں جا پہنچے اور بُتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ چونکہ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ سب سے بڑا جرم تھا اس لیے آپ پر مقدمہ چلایا گیا اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ آپ کو زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ آپ کو آگ میں پھینک دیا گیا لیکن خدا نے آپ کی حفاظت کی اور آپ زندہ سلامت آگ میں سے باہر آگئے۔

کچھ مدت گزرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے بابل سے جو ان کا اصلی وطن تھا، شام اور فلسطین کی جانب ہجرت فرمائی اور وہاں بھی دینِ حق کی تبلیغ جاری رکھی۔

خُدا نے حضرت ابراہیمؑ کو ان کی عمر کے آخری حصے میں دو بیٹے عطا کیے ان میں سے ایک حضرت اسحاقؑ تھے جن کی اولاد "بنی اسرائیل" کہلاتی ہے اور دُوسرے حضرت اسماعیلؑ تھے جو عربوں کی "مُضر" شاخ کے جدِّ بزرگوار ہیں۔

ابھی حضرت اسماعیلؑ دودھ پیتے بچّے تھے جب حضرت ابراہیمؑ انھیں اور ان کی والدہ کو خُدا کے حکم کے مطابق حجاز لے گئے اور وہاں انھیں بے آب وگیاہ اور اُجاڑ مقام پر چھوڑ دیا اور یوں صحرا نشین عربوں کو توحید کی دعوت دی۔ بعد ازاں انھوں نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا اور لوگوں کو حج کرنے کا حکم دیا۔ عرب یہ عمل اسلام کے ظہور اور رسولِ اکرمؐ کی دعوت کے وقت بھی انجام دیتے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ دینِ فطرت کے علمبردار تھے اور جیسا کہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے ان پر آسمانی کتاب بھی نازل ہوئی تھی۔ آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے خدا کے دین کو "اسلام" کا نام دیا اور اس کے پیروؤں کو "مسلمین" کہہ کر پُکارا۔

دُنیا میں جن مذاہب کی بُنیاد توحیدِ الٰہی پر ہے (یعنی یہودیت، نصرانیت اور اسلام) ان سب کی انتہا حضرت ابراہیمؑ پر ہوتی ہے کیونکہ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ جو مذکورہ بالا مذاہب کے پیشوا ہیں، وہ تینوں انھیں کی اولاد میں سے ہیں اور انھوں نے انھیں خطوط پر دین کی دعوت دی ہے جن پر خُود حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ بن عمرانؑ تیسرے صاحبِ کتاب و شریعت اور اُولوالعزم پیغمبر تھے۔ آپ اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) کی اولاد میں سے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہنگاموں سے پُر تھی۔ آپ اس وقت پیدا ہوئے جب بنی اسرائیل مصر میں قبطیوں کے درمیان ذلّت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور فرعون[1] کے حکم کے مطابق ان کے لڑکوں کے سر قلم کر دیے جاتے تھے۔

خواب میں ملنے والے حکم کے مطابق حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے انھیں لکڑی کے صندوق میں لٹا کر دریائے نیل میں ڈال دیا اور صندوق بہتا ہوا سیدھا فرعون کے محل کے پاس کنارے جا لگا۔

فرعون کے حکم کے مطابق صندوق کو پانی سے نکالا گیا اور اسے کھولنے پر معلوم ہوا کہ اس میں ایک بچّہ لیٹا ہُوا ہے۔

اپنی بیوی کے اصرار کو دیکھتے ہوئے فرعون نے بچّے کو قتل نہ کرایا۔ چونکہ ان کی کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے انھوں نے اسے گود لے لیا اور ایک دایہ (جو اتّفاق سے خود حضرت موسیٰؑ کی والدہ تھیں) کے سپرد کر دیا۔

حضرت موسیٰؑ جوانی کے آغاز تک فرعون کے دربار میں رہے۔ اس کے بعد ایک قتل کے واقعے کی بنا پر فرعون کے خوف سے مصر سے نکل کر مَدین چلے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات حضرت شعیبؑ سے ہوئی، بعد میں آپ نے ان کی ایک

---

[1] مصر میں بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا۔

بیٹی سے شادی کرلی۔

حضرت موسیٰؑ چند سال تک حضرت شعیبؑ کی بھیڑ بکریاں چراتے رہے پھر انھیں اپنے وطن کی یاد آئی اور وہ کچھ پونجی ساتھ لے کر اپنی بیوی کے ہمراہ مصر کی جانب روانہ ہوگئے۔ دورانِ سفر میں جب وہ رات کے وقت طورِ سینا پر پہنچے تو خُدا نے انھیں منصبِ رسالت پر فائز کیا اور حکم دیا کہ فرعون کو دینِ توحید کی دعوت دیں، بنی اسرائیل کو قبطیوں کی غلامی سے نجات دلائیں اور اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو اپنا وزیر قرار دیں۔ تاہم جب انھوں نے اپنا فریضہ انجام دیتے ہوئے خدا کا پیغام فرعون کو پہنچایا تو اس نے جو خود بُت پرست تھا اور ساتھ ہی ساتھ مصریوں کا پروردگار ہونے کا دعوے دار بھی تھا، ان کی رسالت سے انکار کردیا اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے کا مطالبہ بھی مسترد کردیا۔

اگرچہ حضرت موسیٰؑ نے سالہا سال لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور بہت سے معجزے دکھائے لیکن فرعون اور اس کی قوم نے سختی اور تندخوئی کے علاوہ کسی ردِّعمل کا اظہار نہ کیا۔ بالآخر حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر رات کے وقت صحرائے سینا کی طرف روانہ ہوگئے۔

جب وہ بحیرۂ احمر کے کنارے پہنچے تو فرعون کو بھی ان کی روانگی کی اطلاع مل گئی اور اس نے اپنی فوج کے ساتھ ان کا تعاقب کیا۔

حضرت موسیٰؑ نے معجزے کے ذریعے سمندر میں شگاف ڈال دیا اور اپنی قوم کے ساتھ پانی کے بیچ میں سے گزر گئے لیکن فرعون اور اس کے فوجی غرق ہوگئے۔ اس واقعہ کے بعد خُدا نے حضرت موسیٰؑ پر تورات نازل کی اور ان کی شریعت بنی اسرائیل میں قائم فرمائی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰؑ چوتھے صاحبِ کتاب و شریعت اور اولوالعزم پیغمبر تھے۔ ان کی ولادت غیر معمولی طریقے پر ہوئی۔ ایک دن جب کہ ان کی والدہ حضرت مریمؑ جو ایک پاکدامن دوشیزہ تھیں، بیت المقدس میں عبادت میں مشغول تھیں، رُوح القدس نے خُدا کی جانب سے نازل ہوکر انھیں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا مژدہ سنایا اور ان کی آستین میں پھُونک ماری جس کے نتیجے میں ان کو حمل ٹھہر گیا۔

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت پر جب لوگوں نے آپ کی والدہ پر ناروا تہمتیں لگانی شروع کردیں تو آپ نے جھولے میں کلام کرکے اپنی والدہ کا دفاع کیا اور لوگوں کو اپنی نبوّت اور کتاب کے بارے میں بتایا۔ جوانی کی عمر کو پہنچ کر انھوں اپنی دعوت کی ابتدا کی اور تھوڑی بہت تبدیلیوں کے بعد حضرت موسیٰؑ کی شریعت کو دوبارہ رائج کیا۔ نیز اپنے حواریوں کو دین کی تبلیغ کے لیے مختلف مقامات پر بھیجا۔

کچھ مدّت گزرنے کے بعد جب ان کی دعوت پھیل گئی تو قومِ یہود کے لوگوں نے انھیں قتل کرنے کی ٹھانی لیکن خدا نے انھیں محفوظ رکھا اور یہودیوں نے ان کی جگہ کسی اور شخص کو صلیب پر چڑھا دیا۔

یہاں اس نکتے کا بیان کرنا ضروری ہے کہ قرآن مجید میں خدا نے اس امر کی تصدیق فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پر انجیل نامی کتاب نازل کی گئی۔ اس انجیل کا ان انجیلوں سے کوئی تعلق نہیں جو آپ کے بعد آپ کی سیرت اور دعوت کے بارے میں لکھی گئیں اور ان میں سے لوقا۔ مرقس۔ متّی اور یوحنا

کی لکھی ہوئی انجیلوں کو رسمی طور قبول کر لیا گیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہمارے رسولِ اکرم حضرت محمد بن عبداللہ ص کی زندگی کی تاریخ باقی تمام پیغمبروں کی تاریخ سے زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور تاریخی انقلابات کی وجہ سے ان پیغمبروں کی کتابوں اور شریعت حتّٰی کہ ان کی شخصیت میں بھی تحریف کر دی گئی ہے اس لیے ان کی زندگی کی تاریخ مبہم ہو کر رہ گئی ہے۔

اسلام کے گرامی قدر پیغمبر، خُدا کے وہ آخری پیغمبر ہیں جنھیں خُدا نے عالَمِ انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔

آج سے چودہ سو سال پہلے انسان اس وضع سے زندگی بسر کر رہے تھے کہ دین توحید کا فقط نام باقی رہ گیا تھا اور لوگ خدائے واحد کی پرستش اور اس کی پہچان سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔ معاشرے میں انسانیت اور عدالت کا نام ونشان تک باقی نہ رہا تھا۔ خانۂ کعبہ کو بت خانے میں اور حضرتِ ابراہیم ع کے دین کو بت پرستی میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

عرب قبائلی زندگی بسر کرتے تھے حتّٰی کہ جو چند شہر حجاز اور یمن وغیرہ میں موجود تھے ان میں بھی یہی نظام رائج تھا۔ عرب بدترین حالات میں دن گزار رہے تھے اور انتہائی پس ماندہ قوم تھے، تہذیب وتمدن کی بجائے ان میں بےحیائی عیّاشی، شراب خوری اور جوئے بازی کا دور دورہ تھا، وہ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زیادہ تر لوگوں کا ذریعہ معاش چوری، رہزنی، قتل اور ایک دوسرے کا مال مویشی لوٹ کھانا تھا۔ خوں ریزی اور ظلم وستم بے حد فخر کا موجب سمجھا

جاتا تھا۔

ان حالات میں خدا نے رسولِ اکرمؐ کو اہلِ عالم کی اصلاح اور رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا ان پر حق وصداقت، عدل وانصاف، پند ونصائح اور خداشناسی پر مبنی کتاب قرآن مجید نازل فرمائی اور حکم دیا کہ وہ اس آسمانی قانون کے مطابق لوگوں کو اچھا انسان بننے اور حق کی پیروی کرنے کی دعوت دیں۔

رسول اکرمؐ ۵۷۰ء میلادی میں (ہجرت سے ۵۳ سال قبل) مکّہ شہر میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جس کا شمار عرب کے شریف ترین گھرانوں میں ہوتا تھا۔

آنحضرتؐ کی ولادت سے کچھ دن پہلے ہی ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہوگیا اور جب آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ بھی رحلت فرماگئیں۔ اب ان کی سرپرستی ان کے دادا حضرت عبدالمطلب نے سنبھالی لیکن دو سال بعد وہ بھی فوت ہوگئے۔ حضرت عبدالمطلب کی وفات کے بعد آنحضرتؐ کی پرورش کی ذمّے داری ان کے مہربان چچا حضرت ابوطالبؑ (امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کے والدِ ماجد) کے حصّے میں آئی۔

حضرت ابوطالبؑ آنحضرتؐ کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ وہ ہجرت سے چند ماہ قبل تک مُسلسل ان کی حمایت اور نگہداشت میں کوشاں رہے اور اس معاملے میں کبھی بھی رتی بھر غفلت نہ کی۔

مکہ کے لوگ دوسرے عربوں کی طرح بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالتے تھے اور اکثر ہمسایہ ممالک بالخصوص شام کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ وہ اَن پڑھ لوگ تھے اور اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے۔

آنحضرتؐ نے بھی اپنی قوم کے دُوسرے افراد کی مانند لکھنا پڑھنا نہیں

سیکھا لیکن وہ اپنی زندگی کی ابتدا سے ہی بہت سی پسندیدہ صفات کے مالک تھے۔ انھوں نے نہ تو کبھی جھوٹ بولا اور نہ ہی چوری یا خیانت کی۔ وہ ناپسندیدہ اور گھٹیا کاموں سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے اور بے حد عقلمند اور باشعور تھے۔ یہی وجہ ہوئی کہ بہت ہی تھوڑی مدّت میں وہ ہر دلعزیز ہو گئے اور "محمدؐ امین" کے لقب سے پکارے جانے لگے۔

عرب اپنی امانتیں ان کے سپرد کرتے اور ان کی دیانت داری کے گُن گاتے تھے۔ جب آپ کی عمر تقریباً بئیس[۲] سال کی تھی تب مکّہ کی ایک دولتمند خاتون (خدیجۃ الکبریٰؑ) نے اپنے مال کی تجارت کی ذمّے داری آپ کو سونپی۔ آپ کی عقلمندی اور راست بازی کی بدولت اس تجارت میں کافی نفع ہوا اور خدیجۃ الکبریٰؑ کی نگاہوں میں آپ کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔ بالآخر انھوں نے آپ کو شادی کی پیشکش کی جسے آپ نے منظور کر لیا۔ شادی کے بعد بھی آپ نے اپنی بیوی کا تجارتی کاروبار سنبھالے رکھا۔

چالیس سال کی عمر تک آنحضرتؐ لوگوں کے ساتھ گھُل مِل کر رہے اور انھیں کے ایک فرد شمار ہوتے تھے، فرق یہ تھا کہ آپ کے اخلاق پسندیدہ اور قابلِ ستائش تھے اور آپ ان بدعنوانیوں اور برائیوں کے کبھی مرتکب نہیں ہوئے جن میں دوسرے لوگ ملوّث تھے۔ نہ ہی آپ نے کبھی ظلم اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی دُوسروں پر حکومت کرنے کی خواہش کی۔ اس کے برعکس لوگ خُود آپ کی خوبیوں کی بدولت آپ پر اعتماد کرتے اور کا احترام کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ جب عرب خانۂ کعبہ کی مرمّت کر رہے تھے، حجرِ اسود کو دوبارہ نصب کرنے کے سوال پر مختلف قبیلوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا جس میں انھوں نے اتفاقِ رائے سے آنحضرتؐ کو اپنا ثالث تسلیم کیا۔ تب آپ نے فرمایا کہ ایک

چادر بچھاکر حجرِ اسود کو اس پر رکھ دیا جائے ، پھر آپ نے قبیلوں کے سرداروں سے کہا کہ وہ چاروں طرف سے چادر کو اٹھائیں۔ جب چادر کو بلند کیا گیا تو آنحضرتؐ نے خود حجرِ اسود کو اُٹھاکر اُس کی صحیح جگہ پر نصب کردیا۔ یوں یہ مسئلہ بڑی خوش اُسلوبی سے طے ہوگیا اور کُشت وخون کا خطرہ ٹل گیا۔

اگرچہ بعثت سے پہلے ہی سے آنحضرتؐ فقط خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے اور آپ نے کبھی بتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا لیکن اس وقت آپ بُت پرستی کے بیہودہ عقائد سے براہِ راست برسرِ پیکار نہیں تھے ،اس لیے لوگ آپ سے کوئی تعرّض نہیں کرتے تھے۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے دوسرے مذاہب کے پیرو مثلاً یہودی اور عیسائی عربوں کے درمیان رہتے ہوئے عزّت واحترام کی زندگی بسر کرتے تھے اور عرب ان کی کوئی مزاحمت نہیں کرتے تھے۔

بُحیرا راہب کا واقعہ

جن ایّام میں آنحضرتؐ اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ کی زیرِ کفالت زندگی بسر کررہے تھے اور سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے ، حضرت ابوطالبؑ نے تجارت کی غرض سے شام کا سفر اختیار کیا اور آنحضرتؐ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

قافلہ بہت بڑا تھا اور اہلِ قافلہ بہت سا سامانِ تجارت لیے ہوئے سرگرم سفر تھے حتیٰ کہ وہ سرزمینِ شام میں داخل ہوئے اور بصریٰ نامی شہر میں پہنچے۔ وہاں انھوں نے ایک خانقاہ کے قریب پڑاؤ کیا اور آرام کی خاطر خیمے نصب کیے۔ ایک راہب جس کا نام بحیرا تھا ، وہ خانقاہ سے باہر آیا اور اس نے قافلے والوں کو کھانے کی دعوت دی۔ سب نے بحیرا کی دعوت قبول کرلی اور خانقاہ میں پہنچ گئے۔ حضرت ابوطالبؑ نے بھی اپنے بھتیجے کو مال واسباب کے

پاس چھوڑا اور خُود دعوت میں شرکت کی غرض سے دوسروں کے ساتھ چلے گئے۔

بحیرا نے پوچھا کہ کیا سب لوگ آ گئے ہیں ؟ حضرت ابوطالبؑ نے جواب دیا کہ ایک نوجوان جو سب سے نوعمر ہے نہیں آیا، باقی سب آ گئے ہیں۔

بحیرا نے کہا : "اس نوجوان کو بھی لے آیئے"۔

حضرت ابوطالبؑ نے آنحضرتؐ کو جو اس وقت ایک زیتون کے درخت کے نیچے کھڑے تھے اپنے پاس بلایا اور انھیں ساتھ لے کر بحیرا کے پاس آئے۔

بحیرا نے آنحضرتؐ کو بڑے غور سے دیکھا اور کہا : "ذرا میرے قریب آئیں کہ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ پھر وہ آنحضرتؐ کو ایک طرف لے گیا۔ حضرت ابوطالبؑ بھی وہیں پہنچ گئے۔

بحیرا نے آنحضرتؐ سے کہا : "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں اور آپ کو لات و عُزّیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ آپ میری بات کا جواب دیں"۔ (لات اور عُزّیٰ دو بت تھے جن کی اہلِ مکّہ پرستش کرتے تھے)۔

آنحضرتؐ نے فرمایا : "میرے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ نفرت چیزیں یہی دو بُت ہیں"۔

بحیرا نے کہا : "میں آپ کو خدائے واحد کی قسم دیتا ہوں کہ آپ سچ کہیں گے"۔

آپ نے فرمایا : "میں ہمیشہ سچی بات کہتا ہوں۔ میں نے کبھی جھُوٹ نہیں بولا، آپ کو جو کچھ پوچھنا ہو پوچھیں"۔

بحیرا نے کہا : "آپ کو کون سی چیز سب سے زیادہ پسند ہے ؟"

آنحضرتؐ نے جواب دیا : "تنہائی !"

بحیرا نے کہا : آپ کون سی چیز زیادہ دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُسے

دیکھتے ہی رہیں ؟"

آنحضرتؐ نے جواب دیا۔ "آسمان اور اس کے ستاروں کو۔"

بحیرا نے پُوچھا : "آپ اکثر کس چیز کے بارے میں سوچتے ہیں؟"

آنحضرتؐ نے جواب میں خاموشی اختیار کی لیکن بحیرا نے آپ کی پیشانی پر غور سے نگاہ ڈالی اور کہا : "آپ کس وقت اور کیا سوچتے ہوئے سوتے ہیں؟"

آپ نے فرمایا : جب میری آنکھیں آسمان پر لگی ہوتی ہیں تو میں ستاروں کو دیکھتا ہوں اور انھیں اپنے دامن میں اور اپنے آپ کو ان سے بلند تر پاتا ہوں۔"

بحیرا نے پوچھا : "کیا آپ خواب بھی دیکھتے ہیں ؟"

آپ نے جواب دیا : ہاں دیکھتا ہوں اور جو کچھ خواب میں دیکھتا ہوں وہی جاگتے ہوئے بھی دیکھتا ہوں۔"

بحیرا نے کہا : "مثلاً" آپ خواب میں کیا دیکھتے ہیں ؟

آنحضرتؐ نے خاموشی اختیار کی۔ بحیرا بھی چپ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد بحیرا نے کہا : "کیا میں آپ کے دونوں کندھوں کی درمیانی جگہ دیکھ سکتا ہوں ؟"

آنحضرتؐ نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر فرمایا : "آیئے اور دیکھ لیجیے۔"

بحیرا اپنی جگہ سے اُٹھ کر آپ کے نزدیک آیا اور آپ کے کندھوں پر سے کپڑا ہٹایا تو اس کی نظر ایک سیاہ تل پر پڑی۔ تل کو دیکھ کر اس نے زیرِلب کہا : "وہی ہے۔"

حضرت ابوطالبؑ نے پوچھا : "کون ہے ؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

بحیرا نے الٹا ان سے سوال کیا : "مجھے بتایئے کہ اس نوجوان سے آپ کا

کیا رشتہ ہے؟"

حضرت ابوطالبؑ چونکہ آنحضرتؐ کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اس لیے انھوں نے جواب دیا: "میرا بیٹا ہے۔"

بحیرا نے کہا: "نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ضروری ہے کہ اس نوجوان کا باپ فوت ہوچکا ہو۔"

حضرت ابوطالبؑ نے کہا: "آپ کو کیسے پتا چلا؟ بہرحال یہ نوجوان میرا بھتیجا ہے۔"

بحیرا نے ابوطالبؑ سے کہا: "میری بات غور سے سنیے۔ اس نوجوان کا مستقبل بے حد تابناک اور حیرت انگیز ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اگر دوسروں نے بھی دیکھ لیا اور اسے پہچان گئے تو وہ اسے قتل کردیں گے۔ اسے دشمنوں سے پوشیدہ رکھیے اور اس کی حفاظت کیجیے۔"

حضرت ابوطالبؑ نے کہا: "مجھے یہ تو بتائیے کہ وہ کیا ہے؟"

بحیرا نے کہا: "اس کی آنکھوں میں ایک بہت بڑے پیغمبر کی علامت ہے اور اس کی پشت پر اس چیز کی واضح نشانی ہے۔"

نسطورا راہب کی داستان

چند سال بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کے نمائندے کی حیثیت سے مالِ تجارت لے کر آنحضرتؐ ایک دفعہ پھر شام کی جانب روانہ ہوئے۔ حضرت خدیجہؑ نے اپنے غلام مَیسرہ کو بھی آپ کے ہمراہ بھیجا اور اسے تاکید کی کہ آپ کی پوری پوری اطاعت کرے۔ اس دفعہ بھی جب آپ شام کی سرزمین میں داخل ہوئے تو بصریٰ شہر کے نزدیک ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا۔ وہاں سے قریب ہی نسطورا نامی

ایک راہب کی خانقاہ تھی جو میسرہ کو پہلے سے جانتا تھا۔

نسطورا نے میسرہ سے پوچھا: "وہ شخص جو درخت کے نیچے آرام کر رہا ہے کون ہے؟"

میسرہ نے جواب دیا: "قبیلۂ قریش کا ایک آدمی ہے۔"

راہب نے کہا: "خدا کے پیغمبروں کے علاوہ کوئی شخص اس درخت کے نیچے قیام نہیں کرتا۔"

پھر اس نے پوچھا: "کیا اس کی آنکھوں میں سُرخی جھلکتی ہے؟"

میسرہ نے جواب دیا: "ہاں! اس کی آنکھوں کی ہمیشہ یہی کیفیت رہتی ہے۔"

راہب نے کہا: "یہ وہی ہیں۔ یہ خدا کے پیغمبر ہیں۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب یہ لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دیں۔

جو بشارت مدینہ کے یہودی دیتے تھے

یہودیوں کے بہت سے قبیلے جنھوں نے اپنی کتابوں میں آنحضرتؐ کے اوصاف اور ان کے مقام کے بارے میں پڑھ رکھا تھا وہ اپنا اصلی وطن چھوڑ کر حجاز آ گئے تھے اور مدینہ اور اس کے قرب وجوار میں بس گئے تھے وہ نبیِّ اُمّیؐ کے منتظر تھے اور چونکہ وہ مالدار لوگ تھے، اس لیے عرب کبھی کبھی انھیں دق کرتے تھے اور ان کا مال واسباب لُوٹ لیتے تھے۔

یہودی ان زیادتیوں کے بارے میں کہتے تھے کہ "اے لوگو! ہم تمھارے اس ظلم وستم کو صبر وتحمل سے برداشت کریں گے حتّٰی کہ نبیِّ اُمّیؐ مکّہ سے ہجرت کرکے یہاں تشریف لائیں۔ اس وقت ہم ان پر ایمان لے آئیں گے

اور تم سے انتقام لیں گے۔ اہلِ مدینہ کے اتنی جلدی آنحضرتؐ پر ایمان لانے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی تھی، کیونکہ یہودیوں کی یہ باتیں سن کر وہ ذہنی طور پر قبولِ اسلام کے لیے آمادہ تھے۔ چنانچہ بالآخر وہ تو ایمان لے آئے لیکن یہودی سخت متعصّب ہونے کی بنا پر اس نعمت سے محروم رہے۔

نبوّت کی بشارتوں کی طرف قرآن کا اشارہ

خداوندِ متعال اپنے کلام میں کئی مقامات پر ان بشارتوں کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور بالخصوص اہلِ کتاب کے ایک گروہ کے ایمان کے متعلق ارشاد کرتا ہے کہ

"وہ اہلِ کتاب جو ہمارے رسولؐ (نبیِّ اُمّیّ) کی پیروی کرتے ہیں کہ جس کی بشارت وہ توریت اور انجیل میں پاتے ہیں، وہ انھیں اچھّے کاموں کا حکم دیتا ہے اور بُرے کاموں سے روکتا ہے، پاک چیزیں ان پر حلال کرتا ہے اور ناپاک اور گندی چیزیں ان پر حرام کرتا ہے اور جو بوجھ ان کی گردنوں پر تھا اور جن پھندوں میں وہ گرفتار تھے وہ انھیں ہٹا کر ان لوگوں کو آزادی بخشتا ہے۔"

(سورۂ اعراف - آیت ۱۵۷)

اور پھر فرماتا ہے:

"جب خدا کی کتاب یہودیوں تک پہنچائی گئی، حالانکہ یہ کتاب ان کی آسمانی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور وہ مدّت سے انتظار بھی کر رہے تھے کہ (رسولِ اکرمؐ کے وسیلے سے) عربوں پر فتح پائیں (اس کے باوجود) وہ ایمان نہ لائے۔"

(سورۂ بقرہ - آیت ۸۹)

بعثت سے ہجرت تک

جزیرۂ عرب کے تاریک ماحول میں۔ جسے بلا مبالغہ گرداب بلا اور ظلم و فساد کی آماجگاہ کہا جاسکتا ہے ۔ اور ظلم و زیادتی سے بھری ہوئی دُنیا میں خدا نے اپنی خاص رحمت کے طور پر اپنے گرامی قدر پیغمبرؐ کو مبعوث فرمایا اور انھیں حکم دیا کہ وہ لوگوں کو توحید اور خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دیں ۔ عدالت، نیکوکاری اور باہمی روابط مستحکم کرنے کی طرف راغب کریں ۔ ہر چیز میں بغیر تساہل کے حق و صداقت کا ساتھ دیں اور بنی نوع انسان کی نیک بختی کی بنیاد ایمان، تقویٰ، تعاون اور ایثار پر استوار کریں۔

سب سے پہلے آنحضرتؐ کو حکم دیا گیا کہ لوگوں کو بنیادی اصولوں کی دعوت دیں۔ چُونکہ معاشرے میں سرکشی، بے رحمی اور ظلم و ستم کا دور دورہ تھا اس لیے انھوں نے اپنا پیغام فقط ان لوگوں تک پہنچایا جن سے اس کو قبول کرنے کی تھوڑی بہت توقع ہوسکتی تھی۔ چُنانچہ چند اشخاص آپ پر ایمان لے آئے۔ روایات کے مطابق ایمان لانے والوں میں پہلے مرد آپ کے چچازاد بھائی اور خود آپ کے پروردہ حضرت علی ابن ابیطالبؑ تھے اور پہلی عورت آپ کی بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ تھیں۔

کچھ مُدّت گزرنے کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ اپنے اعزّہ و اقارب کو دینِ حق کی دعوت دیں۔ آپ نے وحی الٰہی کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے قریبی رشتہ داروں کو (جن کی تعداد تقریباً چالیس تھی)، اپنے دولت خانے پر کھانے کی دعوت دی اور اس دوران میں اپنی نبوّت کے بارے میں لوگوں کو بتایا۔ بعدازاں آپ نے خدا کے فرمان کے مطابق لوگوں کو علانیہ دینِ اسلام کی طرف بلایا اور یُوں

اِس روشن مشعل کا نور گھر سے باہر کی دُنیا میں بھی پھیلا دیا۔

عربوں اور خاص طور پر اہلِ مکّہ نے اِس دعوت اور بالخصوص علانیہ دعوت کے خلاف بے حد سخت ردِّ عمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے اس بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بجائے اس کا منفی جواب دیا جو سراسر وحشیانہ اور بے رحمانہ تھا۔

وہ لوگ آنحضرتؐ کو کبھی کاہن وساحر اور کبھی مجنون و شاعر کہتے اور آپ کا مذاق اُڑاتے۔ جب کبھی آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے یا خُدا کی عبادت کرتے تو وہ نابکار شور وغل مچا کر اس میں خلل ڈالتے۔ بعض اوقات آپ پر کوڑا کرکٹ پھینک دیتے، لاٹھیوں سے پیٹتے، بدکلامی کرتے اور پتّھر مارتے تھے۔ کبھی کبھی دولت اور حکومت کا لالچ بھی دیتے تاکہ آپ اس ارادے سے باز آجائیں اور دین اسلام کی تبلیغ ترک کردیں۔ تاہم آپ نے کسی کمزوری یا پسپائی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ بات ضرور تھی کہ بعض اوقات آپ کو اپنی قوم کی نادانی اور سرکشی پر بے حد دُکھ ہوتا اور آپ غمگین ہو جاتے۔ ایسے مواقع پر قرآنِ مجید کی آیات نازل ہوتیں جن میں خدا آپ کو تسلّی دیتا اور صبر واستقامت کی ہدایت کرتا۔ بعض اوقات ایسی آیات بھی نازل ہوئیں جن میں آپ کو ان لوگوں کی باتوں پر ذرّہ برابر توجّہ کرنے یا اپنی روش میں کسی قسم کی ڈھیل سے منع کیا گیا۔

جو لوگ آنحضرتؐ پر ایمان لائے تھے، کفّار انھیں بھی دق کرتے اور شدید تکلیفیں دیتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ لوگ تکلیفیں سہتے سہتے جان، جان آفریں کے سپرد کر دیتے۔ سختیوں سے تنگ آکر بعض اوقات وہ لوگ آنحضرتؐ سے لڑائی کے ذریعے کفّار سے فیصلہ کرلینے کی اجازت طلب کرتے لیکن آپؐ

فرماتے :
"مجھے اس بارے میں خدا کی جانب سے کوئی حکم نہیں ملا ۔
لہٰذا صبر کرنا چاہیے ۔"

کئی ایسے بھی تھے جو ان سختیوں اور تکلیفوں سے نجات پانے کے لیے گھر بار چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں ہجرت کر گئے۔

جب کُفّار کی زیادتیاں بہت بڑھ گئیں تو آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ کو حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت دی تاکہ وہ ان مصائب سے محفوظ رہ کر سُکھ کا سانس لے سکیں ۔چنانچہ صحابہ کی ایک جماعت جعفر بن ابی طالبؑ کی قیادت میں ہجرت کر کے اہل و عیال سمیت حبشہ چلی گئی ۔(حضرت جعفرؑ جو امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے بھائی تھے، آنحضرتؐ کے ممتاز ترین صحابہ میں سے تھے) ۔

جب مکّہ کے کفار کو مسلمانوں کی ہجرت کا پتہ چلا تو انھوں نے دو تجربہ کار اشخاص کو بہت سے تحائف دے کر حبشہ کے بادشاہ کے پاس بھیجا اور اس سے درخواست کی کہ وہ مہاجرین کو واپس مکہ بھیج دے ۔تاہم حضرت جعفرؑ نے بادشاہِ حبشہ، عیسائی مذہبی پیشواؤں اور دوسرے اعیانِ سلطنت کے سامنے ایک مؤثر تقریر کر کے رسول اکرمؐ کی سرتاپا نُورانی شخصیت ان پر واضح کر دی اور سورۂ مریم کی چند آیات کی تلاوت بھی کی ۔

حضرت جعفرؑ کی تقریر نے اتنا شدید اثر کیا کہ بادشاہِ حبشہ اور دُوسرے حاضرینِ مجلس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔بادشاہ نے اہلِ مکّہ کی درخواست قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ان کے بھیجے ہوئے تحائف بھی واپس کر دیے۔ اس نے یہ حکم بھی دیا کہ مسلمان مہاجرین کے لیے آرام اور آسائش کے

وسائل فراہم کیسے جائیں۔

اس واقعہ کے بعد کفّارِ مکّہ نے فیصلہ کیا کہ بنی ہاشم کے ساتھ جو آنحضرتؐ کے اہلِ خاندان اور حمایتی تھے قطع تعلّق کرلیا جائے یعنی ان سے میل جول، بات چیت اور لین دین بالکل ختم کردیا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک عہدنامہ تیار کیا، اس پر سب نے دستخط کیے اور پھر وہ خانہ کعبہ میں رکھ دیا گیا۔

بنی ہاشم کو جن میں رسولِ اکرمؐ بھی شامل تھے مجبوراً مکّہ سے نکلنا پڑا۔ وہ ایک وادی میں مقیم ہوئے جو شعبِ ابی طالب کے نام سے مشہور تھی اور وہاں ان کا وقت بڑی تکلیف میں کٹا۔ اس دوران کوئی بھی وادی سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ اُن کے دن جُھلسا دینے والی دھوپ میں گزرتے تھے اور رات کو عورتوں اور بچّوں کے رونے کی آوازیں آتی تھیں۔

تین سال کے بعد ایک تو عہدنامہ کی تحریر مٹ جانے کی وجہ سے اور دوسرے پڑوسی قبیلوں کی لعنت ملامت کی بنا پر قریش نے اپنا معاہدہ منسوخ کردیا اور بنی ہاشم کی جلاوطنی کا دور ختم ہوا۔ تاہم ابھی دونوں میں رسول اکرمؐ کے یگانہ حامی حضرت ابوطالبؑ نے اور وفا شعار اور جاں نثار بیوی حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ نے وفات پائی۔ ان دونوں بزرگوں کی رحلت کے نتیجے میں رسولِ اکرمؐ کے لیے حالات بے حد ناسازگار ہوگئے اور ان کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ لوگوں سے میل جول رکھیں یا کسی مخصوص جگہ پر قیام فرمائیں۔ بس یوں سمجھیے کہ ان کی زندگی شدید خطرے میں پڑگئی۔

طائف کی جانب سفر

جس سال رسولِ اکرمؐ اور باقی بنی ہاشم شعبِ ابی طالب سے باہر

آئے وہ آنحضرتؐ کی بعثت کا دسواں سال تھا۔ انھیں ایام میں آپ نے شہر طائف کی جانب (جو مکہ سے تقریباً سو کیلو میٹر دور ہے) ایک مختصر سفر کیا اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ تاہم شہر کے جاہل لوگ ہر طرف سے اُمنڈ آئے اور انھوں نے آنحضرتؐ سے بد کلامی کی اور آپ پر پتھر برسائے جس کے نتیجے میں آپؐ کو شہر چھوڑنا پڑا۔

رسولِ اکرمؐ طائف سے مکہ واپس تشریف لے آئے اور کچھ مدت تک وہیں قیام فرمایا لیکن آپ کی زندگی کسی طرح بھی محفوظ نہ تھی اس لیے آپؐ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ ادھر رؤسائے مکّہ نے محسوس کیا کہ اس وقت آپؐ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے حالات بڑے ساز گار ہیں۔ چنانچہ وہ دارالندوہ میں جمع ہوئے کہ جس کی حیثیت مجلسِ شوریٰ کی تھی، وہاں ایک مجلس میں انھوں نے آنحضرتؐ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ عرب قبائل میں سے ہر قبیلے کا ایک ایک شخص مل کر سب کے سب آنحضرتؐ کے مکان پر ہلّہ بول دیں اور آپ کا کام تمام کر دیں۔ سب قبیلوں کو اس منصوبے میں شریک کرنے کا مقصد بلا شبہ یہ تھا کہ آنحضرتؐ کے رشتہ دار یعنی بنی ہاشم اس قابل نہ ہوں کہ آپ کے قتل میں شریک سب لوگوں سے خون کا بدلہ لینے کے لیے جنگ کر سکیں۔ مزید یہ کہ بنی ہاشم کا ایک فرد بھی اس منصوبے میں شامل تھا اس لیے بنی ہاشم کی زبان بالکل ہی بند ہو جاتی تھی۔

اِس منصوبے پر عمل کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا گیا۔ مختلف قبیلوں کے تقریباً چالیس افراد نے جو آپؐ کو قتل کرنے کے لیے نامزد کیے گئے تھے رات کے گھُپ اندھیرے میں آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تاکہ صبح ہوتے ہی گھر میں گھس جائیں اور قوم کے فیصلے کو عملی جامہ پہنا دیں۔ تاہم خدا کا ارادہ قوم کے ارادے

سے قوی تھا کہ جس نے ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ خُدا نے وحی بھیج کر آنحضرتؐ کو کفار کے ناپاک ارادے سے آگاہ کر دیا اور حکم دیا کہ رات کو مکّہ چھوڑ کر مدینہ کی جانب ہجرت کر جائیں۔

رسولِ اکرمؐ نے امام علیؑ کو حقیقتِ حال سے مطلع کیا اور حکم دیا کہ رات کو آپؐ کے بستر پر سو جائیں۔ آپؐ نے انھیں کچھ وصیتیں بھی کیں، اور رات کے وقت آپؐ گھر سے باہر چلے گئے۔ راستے میں حضرت ابوبکر آپؐ سے ملے تو آپؐ نے انھیں بھی ساتھ لیا اور مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

ہجرت سے پہلے مدینہ کے کچھ سربرآوردہ اشخاص آنحضرتؐ سے ملاقات کر کے آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اگر آپ مدینہ تشریف لے آئیں تو ہم آپ کا ساتھ دیتے ہوئے آپ کا دفاع اسی طرح کریں گے جیسے اپنی جان اور آبرو کا کرتے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کی ہجرتِ مدینہ

رسولِ اکرمؐ رات کے وقت مکّہ کے قریب واقع غار ثور میں پہنچ گئے اور تین دن تک وہاں قیام فرمایا۔ تین دن بعد آپ غار سے نکل کر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے اور آپؐ کے وہاں پہنچنے پر اہل مدینہ نے آپؐ کا والہانہ استقبال کیا۔

اُدھر کفار مکّہ جنھوں نے رات سے ہی آپ کے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا صبح ہوتے ہی گھر میں داخل ہو گئے اور تلواریں سونتے ہوئے آپ کے بستر کی جانب بڑھے لیکن خلاف توقع وہاں امام علیؑ کو پایا۔ جب انھیں پتا

چل گیا کہ آنحضرتؐ مکّہ سے جا چکے ہیں تو انھوں نے آپؐ کو اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا لیکن بالآخر نااُمّید ہوکر واپس آگئے۔

رسولِ اکرمؐ نے مدینہ میں قیام فرمایا۔ اہلِ مدینہ نے بڑے ذوق وشوق سے اسلام قبول کیا، سچّے دل سے آپ کی حمایت پر کمربستہ ہوگئے اور مدینہ شہر کا ماحول اسلامی ہوگیا۔ اس وقت تک یہ شہر "یثرب" کہلاتا تھا لیکن اب مدینۃ الرسولؐ کہلانے لگا اور اسے پہلے اسلامی شہر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

شہر کی آبادی کی تقریباً ایک تہائی عرب اقلیّت کے افراد گو منافق تھے لیکن اکثریت کے خوف کے مارے وہ بھی بظاہر اسلام کا دم بھرتے تھے۔

اسلام کا سورج مدینہ کے صاف وشفاف آسمان پر چمکنے لگا اور اس نے اپنا نور پھیلانا شروع کردیا۔ سب سے پہلے وہ حالتِ جنگ کہ جو مدینہ کے دو بڑے قبیلوں یعنی اوس اور خزرج کے درمیان سالہا سال سے چلی آرہی تھی صُلح اور صفائی میں تبدیل ہوگئی۔ مدینہ کے مؤمنین پروانہ وار شمعِ رسالت کے گرد جمع ہوگئے۔ مدینہ کے علاقے میں موجود قبیلے رفتہ رفتہ ایمان لاتے گئے اور اسلام کے آسمانی احکام یکے بعد دیگرے نافذ ہونے لگے، ہر روز فتنہ وفساد اور بدکرداری کی ایک جڑ کٹ جاتی اور تقوٰی اور عدالت اس کی جگہ لے لیتی۔ اسلام کے جو پیرو مکّہ میں تھے اور کفّار کے ہاتھوں تکلیفیں سہہ رہے تھے وہ بھی بتدریج اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ منتقل ہوتے گئے جہاں ان کے دینی بھائیوں نے ان کا پُرجوش استقبال کیا۔

وہ مسلمان جو مکّہ میں رہتے تھے اور فتحِ مکّہ تک مدینہ میں جمع ہوگئے تھے انھیں مُہاجرین کہا جاتا ہے اور وہ اہلِ مدینہ جو ایمان لے

آئے تھے انھیں انصار کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مدینہ اور اس کے قرب و نواح میں نیز خیبر اور فدک میں یہودیوں کے بہت سے قبیلے آباد تھے جن کے ربّیین اور علماء انھیں ہمیشہ پیغمبر اسلام کی بعثت کی بشارت دیتے تھے لیکن جب ہجرت کے بعد ان قبیلوں کو اسلام کی دعوت دی گئی تو انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔ بالآخر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان خاص شرائط کے تحت عدم تعرض کا ایک معاہدہ طے پا گیا۔

اسلام کو تیزی سے پھیلتے ہوئے دیکھ کر کفّارِ مکہ پیچ و تاب کھانے لگے چنانچہ رسولِ اکرمؐ اور مسلمانوں کے خلاف ان کی عداوت بڑھتی گئی اور وہ مسلمانوں کی جمعیت کو تتر بتّر کرنے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں رہے۔ اُدھر اسلام کے پیروؤں اور مہاجرینِ مکّہ کے دلوں میں بھی کافروں کے خلاف کافی غبار تھا۔ وہ انھیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے اور اپنے بے گناہ بچّوں، عورتوں اور بوڑھوں کو جو ابھی تک مکّہ میں تکلیفیں اُٹھا رہے تھے اُن سے نجات دلانے کے لیے آسمانی حکم کے منتظر تھے۔

جنگِ بدر مسلمانوں اور کفارِ مکّہ کے درمیان پہلی جنگ تھی جو ہجرت کے دوسرے سال میں سرزمینِ بدر پر (جو مکّہ اور مدینہ کے درمیان ایک وادی ہے) لڑی گئی۔ اس جنگ میں کفار کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور وہ اسلحہ اور دُوسرے جنگی ساز و سامان سے مکمل طور پر لیس تھے جب کہ مسلمانوں کی تعداد ان کے مقابلے میں ایک تہائی تھی اور ان کے پاس جنگی ساز و سامان بھی نہ ہونے کے برابر تھا، اس کے باوجود خدا نے مسلمانوں کو نمایاں فتح عطا فرمائی اور کفّار شرمناک شکست سے دوچار ہوئے۔

اس جنگ میں کفّار کو بھاری جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ ان کے بہت سے آدمی قیدی بنا لیے گئے اور وہ کافی مقدار میں ساز و سامان چھوڑ کر مکّہ کی جانب فرار ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں ان کے ستر آدمی مارے گئے جن میں سے آدھے امام علیؑ کی تلوار کا شکار ہوئے۔ نیز ستّر آدمی گرفتار بھی کر لیے گئے۔

جنگِ اُحُد

ہجرت کے تیسرے سال میں کفارِ مکّہ نے ابوسفیان کی قیادت میں تین ہزار (اور ایک روایت کے مطابق پانچ ہزار) افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کی اور مدینہ سے باہر واقع اُحد کے بیابان میں ان کا مقابلہ مسلمانوں سے ہُوا۔

اِس جنگ میں آنحضرتؐ سات سو مسلمانوں کو لے کر دشمن کے مقابلے میں صف آراء ہُوئے۔ اس دفعہ بھی شروع شروع میں مسلمان غالب رہے لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد بعض مسلمانوں کی غلطی سے اسلامی لشکر کو شکست ہوئی اور کفار نے ہر طرف سے ہلّہ بول دیا۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ مسلمان چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھِر گئے۔

اِس جنگ میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہُوا۔ آنحضرت کے چچا حضرت حمزہؓ اور تقریباً ستر دوسرے صحابی کہ جن میں اکثریت انصار کی تھی شہید ہوئے۔ رسولِ اکرمؐ کی پیشانی پر زخم آیا اور آپؐ کا سامنے کا ایک دانت بھی شہید ہو گیا۔ ایک مشرک کہ جس نے آپؐ کے شانے پر وار کیا تھا زور سے چلّا کر بولا "میں نے محمّدؐ کو قتل کر دیا"۔ اس کے نتیجے

میں لشکرِ اسلام میں بھگدڑ مچ گئی۔ رسولِ اکرمؐ کے پاس فقط امام علیؑ اور چند صحابی رہ گئے لیکن بعد میں امام علیؑ کے علاوہ وہ سب بھی قتل ہو گئے فقط امام علیؑ جنگ کے خاتمے تک کفّار کا مقابلہ کرتے ہوئے آنحضرتؐ کا دفاع کرتے رہے۔

آخر کار لشکرِ اسلامی کے بھاگے ہوئے سپاہی ایک دفعہ پھر رسول اکرمؐ کے پاس جمع ہو کر جنگ کے لیے تیار ہو گئے تاہم ابو سفیان کے لشکر نے جو کامیابی حاصل کر لی تھی اسی کو غنیمت سمجھا اور مکّہ کی راہ لی۔

چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کفار اس بات پر سخت پشیمان ہوئے کہ انھوں نے مکمل فتح تک جنگ جاری نہ رکھی اور نہ تو مسلمانوں کے بیوی بچّوں کو قیدی بنایا اور نہ ہی ان کا مال واسباب لُوٹا۔ چنانچہ وہ آپس میں مشورہ کرنے بیٹھے کہ مدینہ پر دوبارہ حملہ کر دیں لیکن اس دوران انھیں خبر ملی کہ لشکرِ اسلام جنگ جاری رکھنے کے لیے ان کا تعاقب کر رہا ہے جب کفّار نے یہ خبر سُنی تو مرعوب ہو گئے اور مدینہ پر حملے کا منصوبہ ترک کر کے جس قدر جلد ہو سکا مکہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

بلاشبہ جو کچھ انھوں نے سُنا تھا وہ درست تھا کیونکہ رسولِ اکرمؐ نے خدا کے حکم کے مطابق ایک لشکر ترتیب دیا تھا جو ان لوگوں پر مشتمل تھا جنھوں نے جنگ میں زک اٹھائی تھی اور اسے شیرِ خدا امام علیؑ کی سرکردگی میں دشمن کے تعاقب میں روانہ کر دیا تھا۔

اس جنگ میں گو مسلمانوں کا بھاری نقصان ہوا لیکن درحقیقت اس کا نتیجہ مسلمانوں کے لیے سود مند ثابت ہوا۔ انھوں نے اس جنگ سے ایک بڑا اہم سبق سیکھا اور پیغمبرؐ کی نافرمانی کا نتیجہ عملی طور پر دیکھ لیا۔

آخر کار جب فریقین نے جنگ بند کر دی تو ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ اگلے سال انھی ایام میں میدانِ بدر میں ایک اور جنگ لڑیں گے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مقررہ وقت پر بدر میں پہنچ گئے لیکن کفار سامنے نہ آئے۔

اس جنگ کے بعد مسلمانوں نے اپنی حالت بہتر بنائی اور جزیرہ نمائے عرب میں مکّہ اور طائف کے علاقے کو چھوڑ کر ہر جانب پیش قدمی کی۔

جنگِ خندق

یہ تیسری جنگ تھی جو کفّارِ عرب اور رسولِ اکرمؐ کے درمیان لڑی گئی اور آخری جنگ تھی جو اہلِ مکہ کی سرکردگی میں وقوع پذیر ہوئی۔ یہ جنگ بے حد سخت تھی اور کفار نے اس کی خاطر اپنی تمام قوت جمع کر لی تھی۔ تاریخ میں یہ جنگ "جنگِ احزاب" اور "جنگِ خندق" دونوں ناموں سے مشہور ہے۔

جنگِ اُحد کے بعد رؤسائے مکّہ جن کی قیادت ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی، اس فکر میں تھے کہ رسول اکرمؐ پر کاری ضرب لگا کر اسلام کی روشنی کو مکمل طور پر گُل کر دیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ عرب قبائل کو اکسا کر ان سے مدد طلب کرتے تھے، یہودیوں کے قبیلوں نے گو مسلمانوں سے عدم تعرض کا معاہدہ کر رکھا تھا لیکن وہ درپردہ اسلام کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے تھے۔ بالآخر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ توڑ ڈالا اور کفّار کے ساتھ باہمی مدد کا عہد و پیمان کر لیا۔

ان سب ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں قریش اور مختلف عرب اور یہودی قبائل کے ایک بہت بڑے لشکر نے ہجرت کے پانچویں سال میں مدینے پر

چڑھائی کر دی۔

رسولِ اکرمؐ کو دشمن کے فیصلے کی اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی لہٰذا آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا، خاصی بحث و تمحیص کے بعد ایک جلیل القدر صحابی سلمان فارسیؓ کے مشورے کے مطابق مدینہ کے اردگرد ایک خندق کھودی گئی اور لوگ شہر کے اندر قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ دشمن کا لشکر جب مدینے پہنچا تو ان لوگوں کو شہر میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ چنانچہ انھوں نے مجبوراً شہر کا محاصرہ کرلیا اور یوں جنگ کی ابتدا ہوگئی۔ جنگ اور محاصرے کی یہ حالت بڑی مدّت تک جاری رہی۔

یہی جنگ تھی جس میں عرب کا ایک بے حد نامور شہسوار اور مشہور ترین پہلوان عمرو بن عبدود امام علیؑ کے ہاتھوں مارا گیا۔

بالآخر بت پرست عرب طویل محاصرے سے تھک گئے نیز ان کے اور یہودیوں کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہوگئے، علاوہ ازیں تیز آندھی چلی اور شدید سردی پڑنے لگی۔ چنانچہ محاصرے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور کفار کے لشکر کے سپاہیوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔

جنگِ خیبر

جنگِ خندق کے اصلی محرک یہودی تھے جو کفّارِ عرب سے سازباز رکھتے تھے اور انھوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ بھی علانیہ طور پر توڑ دیا تھا، چنانچہ اس جنگ کے بعد رسولِ اکرمؐ نے مدینے کے علاقے میں مقیم یہودیوں کی گوشمالی کا فیصلہ کیا۔ ان سے کئی ایک جنگیں لڑی گئیں، اور ہر جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی نصیب ہوئی۔ ان جنگوں میں سب سے

زیادہ اہم خیبر کی جنگ تھی۔ خیبر کے یہودیوں کے قلعے بڑے مضبوط تھے، ان کے پاس وافر سامانِ جنگ موجود تھا اور ان کی تعداد بھی بہت تھی جس میں بڑے بڑے بہادر جنگجو بھی شامل تھے۔

اس جنگ میں امام علیؑ نے خیبر کے مشہور پہلوان مرحب کو قتل کیا اور یہودیوں کے لشکر کو تتّر بتّر کردیا۔ بعدازاں آپ قلعے کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا دروازہ اکھاڑ پھینکا جس کے نتیجے میں اسلامی لشکر نے قلعے میں داخل ہوکر فتح کا جھنڈا گاڑ دیا۔ ان جنگوں کے نتیجے میں جو ہجرت کے ساتویں سال میں ختم ہوئیں حجاز کے یہودیوں کا زور ٹوٹ گیا۔

بادشاہوں اور فرماں رواؤں کو اسلام کی دعوت

رسولِ اکرمؐ نے مدینہ میں رہائش اختیار کرلی اور مکّہ کے بہت سے مسلمان بھی جو کفار کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آگئے۔ انصار نے بھی اپنا وعدہ نبھایا اور آنے والوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔

آنحضرتؐ نے مدینہ میں مسجدِ نبوی تعمیر کی اور رفتہ رفتہ دوسری مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں۔ اسلام کے مبلّغ مختلف مقامات پر بھیجے گئے، مدینہ اور اس کے گردونواح میں آباد یہودیوں سے معاہدے کیے گئے اور کئی ایک عرب قبیلوں سے بھی عہدوپیمان ہوئے۔ یوں اسلام نے رفتہ رفتہ اپنا نور اطراف و اکناف میں پھیلانا شروع کردیا۔

ہجرت کے چھٹے سال میں رسولِ اکرمؐ نے مختلف بادشاہوں اور فرمانرواؤں مثلاً شاہِ ایران، قیصرِ روم، خدیوِ مصر اور نجاشی شاہِ حبشہ کو خطوط لکھے اور

انھیں اسلام کی دعوت دی۔

اسی سال آنحضرتؐ عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مسلمانوں کی ایک جمعیّت کے ساتھ مکّہ روانہ ہوئے۔ گو اس سال مسلمان عمرہ ادا نہ کر سکے لیکن کفّارِ مکّہ کے ساتھ بڑی بحث و تمحیص کے بعد ایک معاہدہ طے پایا جسے صُلحِ حُدیبیہ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ عرب قبائل کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے حلیف بلنا چاہیں بن جائیں۔

کفارِ مکّہ نے کچھ مدّت کے بعد اس معاہدے کی خلاف ورزی کی اور اس کے نتیجے میں آنحضرتؐ نے مکّہ کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ہجرت کے آٹھویں سال میں آپؐ نے دس ہزار جاں نثاروں کے ہمراہ مکّہ کی طرف پیش قدمی کی اور بغیر کسی جنگ یا خوں ریزی کے اس شہر کو فتح کر لیا۔ اس وقت خانۂ کعبہ میں بہت سے بُت رکھے ہوئے تھے، آپؐ نے انھیں وہاں سے ہٹا کر توڑ دیا اور خانۂ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا۔ اہلِ مکہ نے بالعموم اسلام قبول کر لیا اور آپؐ نے ان رؤسا کو جو بیس سال سے آپ کی جان کے دشمن ہو رہے تھے بلوا بھیجا اور کسی سختی یا درشتی کا اظہار کیے بغیر سب کو معاف کر دیا۔

جنگِ حُنین

مکہ فتح ہو جانے کے بعد آنحضرتؐ نے شہر کے گرد و نواح میں واقع علاقے کی اصلاح کی طرف توجّہ دی اور بُت پرستوں سے کئی جنگیں لڑیں جن میں سے ایک "جنگِ حُنین" ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے جو جنگیں لڑیں ان میں جنگِ حنین بہت اہم ہے۔ یہ جنگ حُنین کی وادی میں ہوازن کے قبیلے کے خلاف لڑی گئی۔ اسلامی لشکر

کی تعداد بارہ ہزار تھی اور ان کے مقابلے میں ہوازن کے کئی ہزار سوار تھے۔ یہ جنگ بڑی شدید تھی۔ شروع شروع میں بنی ہوازن نے مسلمانوں کو شکست دے دی۔ چنانچہ امام علیؑ کہ جن کے ہاتھ میں پرچم تھا اور وہ رسولِ اکرمؐ کے آگے آگے دشمنوں سے نبرد آزما تھے اور چند دیگر مسلمانوں کے سوا باقی سب لوگ بھاگ نکلے۔ تاہم کچھ دیر بعد پہلے انصار اور پھر باقی مسلمان اپنی اپنی جگہوں پر واپس آگئے اور زوردار حملہ کر کے دشمنوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں پانچ ہزار افراد قیدی بنائے گئے لیکن رسولِ اکرمؐ کی سفارش پر مسلمانوں نے ان سب کو آزاد کر دیا۔ جن چند اشخاص نے اپنے حِصّے کے قیدیوں کو آزاد کرنے پر رضا مندی ظاہر نہیں کی، آنحضرتؐ نے خود قیمت ادا کر کے ان سے وہ قیدی خرید لیے اور پھر انھیں آزاد کر دیا۔

جنگ تبوک

ہجرت کے نویں سال میں آنحضرتؐ رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے ایک لشکر کے ہمراہ تبوک کی جانب روانہ ہوئے (تبوک حجاز اور شام کی سرحد پر واقع ایک جگہ کا نام ہے) کیونکہ خبر ملی تھی کہ قیصرِ روم، رومیوں اور عربوں پر مشتمل ایک لشکر وہاں جمع کر رہا ہے۔ اس سے پہلے جنگِ موتہ بھی اِسی علاقے میں لڑی گئی تھی جس میں جعفر بن ابی طالبؑ، زید بن حارثہؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ جیسے اسلامی لشکر کے سردار شہید ہو گئے تھے۔

آنحضرتؐ تیس ہزار افراد پر مشتمل لشکر لے کر تبوک پہنچے لیکن رومی لشکر جو وہاں جمع ہوا تھا وہ اس دوران میں منتشر ہو چکا تھا۔ آپ وہاں تین دن ٹھہرے، اس کے گرد و نواح کے معاملات طے کیے اور پھر واپس مدینہ

تشریف لے آئے۔

رسولِ اکرمؐ کی دُوسری جنگیں

رسولِ اکرمؐ نے مدینہ میں دس سال قیام کے دوران مذکورہ بالا جنگوں کے علاوہ تقریباً اسّی چھوٹی بڑی جنگیں لڑیں اور ان میں سے تقریباً ایک چوتھائی جنگوں میں آپ نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی۔

جب آنحضورؐ کسی جنگ میں شریک ہوتے تھے تو آپؐ کا طریقِ کار دُوسرے سپہ سالاروں کی مانند نہیں ہوتا تھا جو خود پناہ گاہوں میں بیٹھ کر سپاہیوں کو حملہ کرنے کے احکام دیتے ہیں بلکہ آپ دُوسرے جنگجوؤں کے ساتھ شانہ بشانہ لڑتے تھے لیکن ایسا اتفاق ہرگز نہیں ہوا کہ آپؐ نے کسی کے قتل کی نگرانی کی ہو۔

غدیرِ خم اور جانشینی کا مسئلہ

وہ آخری شہر کہ جس کی فتح کے بعد پُورے جزیرہ نمائے عرب پر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی، مکّہ تھا جو خدا کا حرم اور کعبہ کا محلِ وقوع ہے۔ اس شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ۸ھ میں ہوا اور اس کے بعد جلد ہی شہر طائف بھی فتح ہوگیا۔

ہجرت کے دسویں سال میں رسولِ اکرمؐ حجۃُ الوداع کے لیے مکّہ تشریف لے گئے جو آپ کا آخری حج تھا۔ مناسکِ حج ادا کرنے اور لوگوں کو ضروری تعلیمات دینے کے بعد آپ واپس مدینہ روانہ ہوئے۔ راستے میں غدیرِ خم کے مقام پر آپ نے قافلے کو رکنے کا حکم دیا اور ایک لاکھ بیس ہزار حاجیوں

کے سامنے جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف مقامات سے آئے ہوئے تھے، امام علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور ان کی ولایت اور جانشینی کا اعلان فرمایا۔

اِس اقدام سے اسلامی معاشرے میں ایک ایسے والی کے تقرر کا مسئلہ حل ہوگیا جسے مسلمانوں کے امور پر اقتدار حاصل ہو اور جو دینی تعلیمات اور قوانین کی حفاظت کرے۔ یوں قرآن مجید کی مندرجۂ ذیل آیت پر عمل درآمد ہوگیا:

"اے رسولؐ! جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم یہ کام انجام نہ دوگے تو یوں سمجھ لو کہ تم نے اس کی رسالت کی تکمیل نہیں کی۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۶۷)

مدینہ واپس پہنچنے کے تھوڑے عرصے بعد ۱۱ھ میں آنحضرتؐ کا وصال ہوگیا۔

رسولِ اکرمؐ کا مدینہ میں قیام، اسلام کی ترقی

پیغمبر اسلامؐ کی دعوت مدینہ میں اس طرح گونجی کہ ہر گھر، کوچے، محلّے اور بستی پر چھا گئی، لوگ گروہ در گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے، یہاں تک کہ مکّہ، مدینہ اور مختلف اطراف میں سکونت پذیر قبائل نے اطاعت قبول کرلی اور دس سال کے عرصے میں جو آنحضرتؐ کے مدینہ میں قیام کی مدّت تھی پورے جزیرہ نمائے عرب پر اسلام کا مکمل تسلّط قائم ہوگیا۔

ان دس سالوں میں رسولِ اکرمؐ اپنا فرضِ منصبی انجام دینے میں مشغول رہے اور ایک لحظہ کے لیے بھی آرام سے نہ بیٹھے۔ جو احکام اور قوانین آسمانی وحی

کے ذریعے آپ پر نازل ہوتے، آپ ان کو لوگوں تک پہنچاتے، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور ان کے سوالوں کے جواب دیتے۔ علاوہ ازیں آپ مخالفین اور دوسری قوموں بالخصوص یہودیوں کے علماء سے مناظرہ کرتے اور مُلک کا انتظام بھی چلاتے تھے۔

اس کے باوجود آپ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ خُدا کی عبادت میں گزارتے اور سال کے بہت سے دن روزے کی حالت میں رہا کرتے یعنی رجب، شعبان اور رمضان تین مہینوں کے مسلسل روزے رکھتے، ان کے علاوہ ایک مہینے کے برابر متفرق دنوں کے روزے بھی رکھتے۔ بعض اوقات روزۂ وصال بھی رکھتے جو آپ ہی سے مخصوص ہے اور وہ یوں کہ مُسلسل چند دن اور چند راتیں کچھ کھائے پیئے بغیر گزار دیتے۔ آپ اپنا کچھ وقت گھر کے کام کاج میں بھی صرف کرتے اور روزی کمانے کے لیے محنت مزدوری بھی کرتے تھے۔ خدا قرآنِ مجید میں مختصر طور پر ان دس سالوں کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ

"کُفّار اپنے مُنہ سے (پھونک مار کر) خدا کے نور کو بُجھانا چاہتے ہیں حالانکہ خدا اپنے نور کو کمال تک پہنچائے گا اگرچہ کفّار اسے پسند نہ کریں۔ وہ وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول ص کو ہدایت اور سچّے دین کے ساتھ لوگوں کی طرف بھیجا تاکہ اسے تمام مذاہب پر غالب کر دے۔ اگرچہ مشرکوں کو یہ بات ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔

(سورۂ صف۔ آیت ۸)

(جیسا کہ واضح ہے خدا کا یہ وعدہ آنحضرت ص کی زندگی میں بھی پورا ہُوا اور ان کی رحلت کے بعد بھی آج تک پورا ہو رہا ہے اس وقت دنیا میں نوّے کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں جو مختلف

خطّوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یوں یہ وعدہ روز بروز بہتر طور پر عملی صورت اختیار کر رہا ہے۔)

ایک اور مقام پر خدا فرماتا ہے:

"تم (مسلمان) بہترین امّت ہو جو لوگوں کے درمیان پیدا کیے گئے ہو۔ تم ان لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو، بُرے کاموں سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔"

(سورۂ آل عمران۔ آیت ۱۱۰)

رسولِ اکرمؐ کی معنوی اور روحانی شخصیّت پر ایک نظر

قطعی تاریخی شہادتوں کے مطابق رسول اکرمؐ نے ایک ایسے معاشرے میں پرورش پائی تھی جو ایک پست ترین معاشرہ تھا اور جہالت، فساد اور بُرے اخلاق کا گڑھ تھا۔ انھوں نے کوئی علمی تربیت حاصل کیے بغیر اپنے لڑکپن اور جوانی کے دن اسی معاشرے میں گزارے تھے۔ اگرچہ آنحضرتؐ نے کبھی بتوں کی پرستش نہیں کی اور نہ ہی کوئی غیر انسانی طور طریقے اختیار کیے تاہم وہ اسی قسم کے لوگوں کے درمیان رہتے تھے اور ان کی عام زندگی سے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کا مستقبل کتنا ہنگامہ خیز ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک نادار اور اَن پڑھ یتیم سے کسی ایسی چیز کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

رسول اکرمؐ اسی طرح زندگی بسر کرتے رہے، حتّٰی کہ ایک رات کو جب کہ وہ پُرسکون دل اور خالی ذہن کے ساتھ عبادت میں مصروف تھے، انھیں اچانک ایک نئی شخصیت حاصل ہو گئی۔

ان کی خاموش اندرونی شخصیت، ایک آسمانی شخصیت میں تبدیل ہوگئی وہ انسانی معاشرے کے ہزاروں سال پرانے خیالات اور عقائد کو خرافات سمجھنے لگے۔ انھوں نے اپنی حقیقت پسندی کی روشنی میں دیکھا کہ دنیا والوں کے طور طریقے اور قوانین ظالمانہ ہیں۔ انھوں نے دنیا کے ماضی اور مستقبل کو باہم مربوط کر کے بنی نوع انسان کی خوش بختی کے راستے کی مکمل نشان دہی کردی آنحضرتؐ کی آنکھیں اور کان بالکل بدل گئے۔ وہ حق اور حقیقت کے علاوہ نہ کچھ دیکھتے اور نہ سنتے، اُن کی زبان اللہ کے کلام، آسمانی باتوں نیز حکمت اور وعظ و نصیحت کے لیے کھل گئی۔ ان کی اندرونی افتادِ طبع نے جو پہلے سوداگری اور لین دین کے معمولی ماحول میں روزمرّہ کے کاروبار میں مصروف تھی، اب اپنے بال و پر پھیلائے اور دنیا اور اہلِ دنیا کی اصلاح کرنے اور ہزاروں سال پرانے ظالمانہ اور گمراہانہ نظام کو تہ و بالا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

آنحضرتؐ حق و صداقت کو دوبارہ رواج دینے کے لیے تن تنہا اُٹھ کھڑے ہُوئے اور طاقت ور اور ہولناک مخالف قوتوں کی رتّی برابر پروا نہ کی۔ آپ علوم خداوندی کی باتیں کرتے تھے اور ہستی کے تمام حقائق کو پروردگارِ عالم کی وحدانیت سے اخذ کرتے تھے۔ آپ نے بلند انسانی اخلاق کی بہترین طریقے سے تشریح فرمائی اور ان کا باہمی تعلق واضح کیا۔ آپ جو کچھ فرماتے تھے اس پر سب سے زیادہ خود یقین رکھتے تھے اور جس چیز کی دعوت لوگوں کو دیتے تھے، اس پر سب سے پہلے خود عمل کرتے تھے۔

جو شریعت اور احکام آپ لائے وہ بہترین شکل میں خداوند تعالیٰ کی عبادات پر مشتمل ہیں۔ ان کے علاوہ آپ دیوانی اور فوجداری قوانین بھی لائے جو ایک دوسرے سے مکمل ہم آہنگی رکھتے ہیں اور توحید اور اعلیٰ انسانی اخلاق کے احترام

پر مبنی ہیں۔

جو قوانین آنحضرتؐ لائے —— خواہ ان کا تعلّق عبادات سے ہو یا معاملات سے —— وہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام مسائل اور ان گوناگوں ضروریات کا احاطہ کرتے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے لاحق ہوتی ہیں اور ان کا حل پیش کرتے ہیں۔

آنحضرتؐ اپنے دین کے قوانین کو آفاقی اور اَبدی سمجھتے تھے یعنی ان کا اعتقاد تھا کہ ان کا دین انسان کے تمام معاشروں کی دنیاوی اور اُخروی ضرورتوں کو ہمیشہ کے لیے رفع کر سکتا ہے اور لوگوں کو چاہیے کہ اپنی نیک بختی کی خاطر یہی دین اختیار کریں۔

آپ نے خود بارہا فرمایا ہے کہ

"لَقَدْ جِئْتُکُمْ بِخَیْرِ الدُّنیَا وَالْاٰخِرَۃِ"

"جو دین ہم لائے ہیں وہ تمھاری دُنیاوی اور اُخروی نیک بختی کا ضامن ہے۔"

بلاشبہ آپ نے یہ کوئی بے مقصد بات نہیں کہی بلکہ آپ کائنات کے مطالعے کے بعد اور عالمِ انسانیت کے مستقبل کو پیش نظر رکھ کر اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں پہلے تو آپ نے اپنے قوانین اور انسان کی جسمانی اور رُوحانی ساخت کے مابین مکمل ہم آہنگی کو پہچانا اور پھر جو انقلابات آئندہ رونما ہونے والے تھے ان کا مکمل جائزہ لیا اور اس کے بعد اپنے دین کے احکام کے ابدی ہونے کا اعلان فرمایا۔

آنحضرتؐ کی جو پیشین گوئیاں قطعی اسناد کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں ان

میں آپ کی رحلت کے بعد بہت دور تک کے زمانے کے عام حالات کی تشریح کی گئی ہے۔

رسول اکرمؐ نے یہ کام ۲۳ سال کی مدّت میں انجام دیا۔ ان میں سے پہلے تیرہ سال تو کفار مکّہ کے ہاتھوں تکالیف اٹھانے میں گزرے اور باقی دس سالوں میں بھی آپ کو خارجی دشمنوں اور داخلی منافقین کے خلاف متعدد لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق کی اصلاح کی اور ہزاروں دوسری مشکلات کا مقابلہ بھی کیا۔

آنحضرتؐ نے یہ تمام راستہ سچائی کی پیروی اور اسے زندہ کرنے کے راسخ ارادے کے ساتھ طے کیا۔ ان کی حقیقت پسند نظر فقط سچائی سے آشنا تھی اور جو چیز سچائی کے خلاف ہوتی اسے وہ کوئی وقعت نہ دیتے تھے، خواہ اس میں ان کا فائدہ ہی ہوتا یا وہ عام لوگوں کی خواہشات اور احساسات کے مطابق ہوتی۔ پس جس بات کو وہ صحیح سمجھتے اسے دل وجان سے قبول کر لیتے اور اس سے مُنہ نہ موڑتے اور جو چیز غلط ہوتی اسے رد کر دیتے اور ہرگز قبول نہ کرتے۔

آنحضرتؐ کی رُوحانی شخصیّت غیر معمولی تھی

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اگر ہم اس پر انصاف کی نظر سے غور کریں تو ہمیں اس بارے میں کوئی شک نہیں رہے گا کہ ان حالات میں ایسی شخصیت کا پیدا ہونا واقعی ایک معجزہ ہے اور اس کا سبب تائیدِ الٰہی کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا اپنے کلام میں آنحضرتؐ کے اُمّی اور یتیم ہونے اور زندگی کے پہلے دور میں نادار ہونے کا بار بار ذکر کرتا ہے، پھر جو شخصیت اس خُدائے متعال نے انھیں بخشی اسے ایک آسمانی معجزہ شمار کرتے ہوئے اسے ان کی دعوت کی

سچائی کی دلیل گردانتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے :

"کیا تم یتیم نہیں تھے جب کہ خدا نے تمھیں جگہ اور پناہ دی ؟ اور کیا تم حاجت مند نہیں تھے جب کہ خُدا نے تمھیں بے نیاز کر دیا ؟ اور کیا تم گمنام نہیں تھے جب کہ خدا نے تمھیں نام و نشان بخشا ؟" (سورۂ ضحیٰ - آیات ۶ تا ۸)

پھر فرماتا ہے :

"تم پیغمبری پر مبعوث ہونے اور نزولِ قرآن سے پہلے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے ۔" (سورۂ عنکبوت - آیت ۴۸)

پھر فرماتا ہے :

"جو کچھ ہم نے اپنے بندے (یعنی محمدؐ کہ جو جہالت کے ماحول میں رہ کر جوان ہوئے ہیں اور پڑھے لکھے بھی نہیں) پر نازل کیا ہے اس کے بارے میں تمھیں کچھ شک ہے تو کسی ایسے شخص کی طرف سے ایک سُورہ لے آؤ کہ جو محمدؐ جیسا ہو"

(سورۂ بقرہ - آیت ۲۳)

رسُولِ اکرمؐ کی سیرت

وہ واحد چیز جس پر رسول اکرمؐ نے اپنے دین کی بنیاد رکھی اور اسے عالمِ انسانیت کے لیے نیک بختی کا موجب قرار دیا **توحید** ہے۔

توحید کے مطابق وہ ہستی جو کائنات کی پیدا کرنے والی اور قابلِ پرستش ہے، فقط خدائے واحد کی ہے اور اس کے علاوہ کسی کے آگے سر تسلیم خم کرنا اور کورنش بجا لانا درست نہیں۔

لہذا انسانی معاشرے میں جو طریقہ رائج ہونا چاہیے، وہ یہ ہے کہ سب انسان آپس میں برابر اور بھائی بھائی ہیں اور خُدا کے سوا کسی کو غیر مشروط طور پر اپنا فرماں روا قرار نہ دیں۔ جیسا کہ خُدائے تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"(اے رسولؐ!) کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب! آؤ تاکہ ہم ایک بات پر باہم اتفاق کرلیں اور وہ یہ ہے کہ پروردگارِ عالم کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور یہ کہ ہم میں سے بعض لوگ بعض دوسروں کے آقا اور غیر مشروط طور پر فرمانروا نہ بن بیٹھیں۔" (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۶۴)

دینِ توحید کو پھیلانے کے علاوہ آنحضرتؐ کا کوئی اور ہدف نہ تھا۔ آپ بہترین اخلاق، بے حد خندہ پیشانی اور واضح دلائل کے ساتھ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے تھے اور صحابہ کو بھی یہی طرزِ عمل اپنانے کی ہدایت فرماتے تھے جیسا کہ خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"اے رسولؐ! کہہ دو کہ میرا طریقہ یہ ہے کہ کامل بصیرت کے ساتھ خدا کی طرف دعوت دوں اور میرے پیرو بھی ایسے ہی ہیں۔"

(سورۂ یوسفؑ۔ آیت ۱۰۸)

آنحضرتؐ اپنی سیرت کے مطابق سب کو برابر اور ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتے تھے اور خداوندی احکام اور حدود پر عملدرآمد کے بارے میں ہرگز کسی امتیاز اور استثنا کے قائل نہ تھے۔ آپ اپنے اور بیگانے، طاقتور اور کمزور، امیر اور غریب، مرد اور عورت اور سیاہ فام اور سفید فام میں کوئی فرق روا نہ رکھتے تھے بلکہ ہر ایک کو دینی احکام اور قوانین کے مطابق اس کا حق دیتے تھے اور فرماتے تھے:

"گو میری بیٹی فاطمہ (علیہا السلام) میرے نزدیک سب لوگوں کے مقابلے میں عزیز ترین ہے لیکن اگر وہ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں گا۔"

کسی کو کسی پر رُعب جمانے یا حکم چلانے کا حق نہیں تھا اور قانون کی حد سے باہر لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل تھی۔ (بلاشبہ قانون کے مقابلے میں آزادی نہ صرف اسلام میں بلکہ سماجی قوانین میں سے کسی بھی قانون میں کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔)

یہی اجتماعی آزادی اور عدالت کی روش ہے جس کا ذکر خداوند تعالیٰ اپنے گرامی قدر پیغمبر کا تعارف کراتے ہوئے ان الفاظ میں فرماتا ہے:

"وہ اہلِ کتاب جو اُمّی پیغمبرؐ کی پیروی کرتے ہیں، اس کے اوصاف انجیل اور تورات (اپنی آسمانی کتابوں) میں پاتے ہیں۔ یہ وہ پیغمبرؐ ہے جو اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور بُرے کاموں سے روکتا ہے۔ وہ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور پلید چیزوں کو حرام کرتا ہے۔ یہ وہ پیغمبرؐ ہے جو ہر قسم کے سخت احکام اور آزادی کو سلب کرنے والی زنجیروں کو ان سے ہٹا دیتا ہے۔ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کا احترام کیا، اسکی حمایت کی اور وہ نُور (قُرآن) جو اس پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کی وہ نجات پائیں گے۔ (اے نبیؐ!) لوگوں سے کہہ دو کہ میں خدا کی طرف سے تم سب کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں یعنی جس روش کو اپنانے کا خُدا نے مجھے حکم دیا ہے وہ میں تمھارے درمیان بھی رائج کروں گا۔"

(سُورۂ اعراف۔ آیات ۱۵۷-۱۵۸)

پس یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنی زندگی میں اپنے لیے کوئی امتیاز اختیار نہیں کیا اور جو شخص پہلے ہی آپ سے واقف نہیں ہوتا تھا وہ آپ کو دوسرے لوگوں میں سے نہیں پہچان سکتا تھا۔ آپ اپنے گھر کا کام خود کرتے آنے والے لوگوں کو خوش آمدید کہتے اور حاجت مندوں کی باتیں توجّہ سے سُنتے تھے۔

آپ تخت پر یا کسی خاص جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے۔ اگر آپ کہیں جاتے تھے تو نہ آپ کے ساتھ کوئی باڈی گارڈ ہوتا تھا اور نہ ہی کوئی تکلفات برتے جاتے تھے۔ اگر آپ کو کہیں سے کوئی مال دستیاب ہوتا تھا تو اپنے ضروری اخراجات کا بیشتر حصہ فقراء کو دے دیتے تھے اور بعض اوقات اپنی ضروری اشیائے خورد و نوش بھی ضرورت مندوں کو دے دیتے تھے اور خود بھوکے رہتے تھے۔ آپ ہمیشہ فقراء کی سی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ لوگوں کے حقوق ادا کرنے میں قطعاً سُستی نہیں کرتے تھے۔ فتح مکّہ کے دن جب مسلمانوں کو مکمل تسلّط حاصل ہو گیا تو سردارانِ قریش کو آپ کے پاس لایا گیا۔ اس کے باوجود کہ ہجرت سے پیشتر انھوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم کیے تھے اور ہجرت کے بعد بھی فتنے کھڑے کیے تھے آپؐ نے کسی سخت گیری کا مظاہرہ نہیں کیا اور سب کو معاف کر دیا۔

رسولِ اکرمؐ کے اخلاق اور انسانی فضیلتوں کا دوست دشمن سبھی اعتراف کرتے تھے۔ اچھّے طور طریقوں، خوش مزاجی، بردباری اور تواضع کے معاملے میں حضورؐ اپنی مثال آپ تھے۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے آپ کے اخلاقِ کریمہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" (سورۂ قلم - آیت ۴)

آپ جس کسی سے ملتے تھے اسے حتیٰ کہ عورتوں، بچوں اور غلاموں کو بھی سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔ جب آپ کے صحابہ میں سے ایک شخص نے آپ کے سامنے خاک پر گرنے یعنی سجدہ کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:

"تم کیا کہہ رہے ہو، یہ قیصر اور کسریٰ کا طریقہ ہے۔ میری شان یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔"

جب سے آپ لوگوں کی ہدایت اور دین کی تبلیغ پر مامور کیے گئے آپ نے ایک لحظہ بھی اس کام کو سرانجام دینے میں غفلت نہ برتی اور اپنی انتھک کوششیں جاری رکھیں۔ ہجرت سے قبل جو تیرہ سال آپ نے مکہ میں گزارے وہ مشرکین عرب کی جانب سے انتہائی تشدد اور سخت گیری کے تھے لیکن اس کے باوجود آپ ہمیشہ عبادت اور دینِ حق کی تبلیغ میں مشغول رہتے۔

ہجرت کے بعد کے دس سال میں بھی آپ کو دشمنانِ دین کی مخالفت اور یہودیوں اور مسلمان نما منافقوں کی بدعہدیوں اور چالبازیوں کا مقابلہ کرنا پڑا، اس کے باوجود آپ نے اسلام کے علوم اور قوانین کو جو حیرت انگیز وسعت کے حامل ہیں لوگوں تک پہنچایا اور اسلام کے دشمنوں سے اسّی سے زیادہ جنگیں بھی لڑیں۔

اگرچہ اسلامی معاشرے کا انتظام چلانا جو اس وقت پورے جزیرہ نمائے عرب پر پھیلا ہوا تھا آپ کی ذمّے داری تھی مگر اس کے باوجود آپ بنفسِ نفیس لوگوں کی شکایتیں اور ضرورتیں مفصّل طور پر سُنتے اور پُوری کرتے تھے اور آپ کا کوئی حاجب یا دربان نہ تھا جس کی معرفت یہ شکایات وغیرہ آپ تک پہنچتیں۔

رسولِ اکرمؐ کی شجاعت اور دلاوری کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ انھوں

نے اس وقت کے ظالم اور سرکش معاشرے کے مقابلے میں تن تنہا دینِ حق کی تبلیغ شروع کی اور کفّار کی تمام سختیوں اور مظالم کے باوجود آپ کے استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور کسی جنگ میں آپ پیچھے نہیں ہٹے۔

آنحضرتؐ بے حد پاک صاف رہتے تھے۔ صفائی اور پاکیزگی کو آپ نے ایمان کی ایک نشانی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

اَلنَّظَافَۃُ مِنَ الْاِیْمَانِ ۔

لباس اور بدن پاک و پاکیزہ رکھنے کے علاوہ آپ خوش لباس اور خندہ پیشانی سے ملنے والے تھے۔جب بھی آپ باہر نکلتے بہترین وضع کے ساتھ نکلتے تھے اور عطر کو بالخصوص پسند فرماتے تھے۔زندگی بھر آپ کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور ہمیشہ متواضع اور خلیق رہے۔گو آپ بڑی اعلیٰ حیثیت کے مالک تھے لیکن آپ نے ایسا کوئی امتیاز نہیں اپنایا جس سے آپ کی سماجی برتری ظاہر ہو۔

رسول اکرمؐ نے ساری زندگی میں کسی کو گالی نہیں دی اور کبھی کوئی ناشائستہ بات نہیں کہی۔آپ کبھی بھی قہقہہ لگا کر نہیں ہنسے اور کوئی گھٹیا کام انجام نہیں دیا۔آپ زیادہ تر غور و فکر فرماتے اور ہر دُکھی شخص کی بات اور اعتراض کرنے والے کا اعتراض سنتے اور پھر اسے جواب دیتے۔آپ نے کبھی کسی کی قطع کلامی نہیں کی۔آپ کسی کی آزادانہ سوچ بچار پر پابندی نہیں لگاتے تھے لیکن لوگوں کی غلطیوں کو واضح کر کے ان کے اندرونی زخموں پر مرہم رکھتے تھے۔

آپ بے حد مہربان اور رقیق القلب تھے۔آپ دُوسروں کے تکلیف اٹھانے سے بہت متاثر ہوتے تھے لیکن بدکردار لوگوں کو سزا دینے میں ہرگز تامّل نہ کرتے اور احکامِ خداوندی جاری کرنے میں لوگوں کے درمیان کوئی فرق روا

نہیں رکھتے تھے۔

انصار میں سے ایک شخص کے ہاں چوری ہو گئی۔ چوری کا الزام ایک یہودی اور ایک مسلمان پر تھا۔ انصار کے بہت سے لوگ جمع ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مسلمانوں اور بالخصوص انصار کی آبرو محفوظ رکھنے کے لیے اور یہودیوں کی مسلمانوں کے خلاف اعلانیہ دشمنی کے پیش نظر صرف یہودی ملزم کو ہی سزا دی جائے۔ تاہم آنحضرتؐ اس نتیجے پر پہنچے کہ جو کچھ وہ لوگ چاہتے تھے حقیقت اس کے خلاف ہے لہذا آپ نے کھل کر یہودی کا ساتھ دیا اور مسلمان کو سزا دی۔

جنگ بدر کے موقع پر جب آپ لشکر کی صفیں دُرست کر رہے تھے، آپ چلتے چلتے ایک ایسے سپاہی کے پاس پہنچے جو دوسروں کے مقابلے میں قدرے آگے کھڑا تھا۔ آپ نے اپنی چھڑی اس کے پیٹ میں چبھوئی تاکہ وہ ذرا پیچھے ہٹ جائے اور صف درست ہو جائے۔ اس سپاہی نے کہا: ”یا رسول اللہؐ! آپ کے چھڑی چبھونے سے میرے پیٹ میں درد ہوا ہے اور میں اس کا قصاص لینا چاہتا ہوں۔“ حضورؐ نے چھڑی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اپنے پیٹ پر سے کپڑا ہٹا دیا اور اسے قصاص لینے کو کہا۔ اس شخص نے دوڑ کر آنحضرتؐ کا شکم مبارک چُوم لیا اور عرض کیا:

”میں جانتا ہوں کہ آج میں قتل ہو جاؤں گا لہذا میں نے سوچا اسی بہانے آپ کے مقدّس بدن کو چُھو لوں۔“

اس کے بعد دشمن پر ٹوٹ پڑا اور لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔

رسولِ اکرمؐ ہمیشہ کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت کرتے تھے۔ آپ اپنے صحابہ کو ہدایت کرتے تھے کہ وہ حاجت مندوں کی ضروریات اور کمزوروں کی

شکایات کے بارے میں آپ کو اطلاع دیں اور اس بارے میں تساہل نہ برتیں۔
کہتے ہیں کہ آخری باتیں جو آپ نے کہیں ان میں سے ایک غلاموں اور عورتوں کے بارے میں لوگوں کو سفارش تھی۔ اس کے بعد آپ نے خاموشی اختیار فرمائی اور اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

لاکھوں سلام ہوں آپ پر اور آپ کے گرامی قدر اہلبیت پر۔

رسولِ اکرمؐ کی مسلمانوں کو وصیّت

کائنات کے دوسرے اجزاء کی مانند جہانِ بشریت میں بھی تبدیلیاں رُونما ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ افراد کی ساخت میں جو شدید اختلافات دیکھنے میں آتے ہیں ان سے مختلف مذاق وجود میں آتے ہیں اور ان کے نتیجے میں لوگوں کے اندر تندی اور نرمی، سوچ سمجھ اور نگہداشت اور بھُول چوک کا مادّہ بھی مختلف ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک معاشرے میں جو عقائد، رسوم اور قواعد وضوابط رائج ہوتے ہیں اگر ان کی بنیاد مضبوط اور ان کے نگہبان باایمان اور قابلِ اعتماد افراد نہ ہوں تو بہت تھوڑے عرصے میں ان میں تبدیلی اور تحریف واقع ہو جاتی ہے اور وہ مٹ جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو مشاہدہ اور تجربہ واضح طور پر ثابت کرتا ہے۔

اس خطرے کی پیش بندی کے طور پر رسول اکرمؐ نے اپنے آفاقی اور دائمی دین کے لیے ایک مضبوط اور مستحکم دستاویز اور باصلاحیت نگہبانوں کا تعارف کرایا ہے اور اللہ کی کتاب اور اپنے اہلبیتؑ کے بارے میں لوگوں کو وصیّت کی ہے جیسا کہ عام اور خاص تمام اسلامی فرقوں نے بطورِ تواتر نقل کیا ہے۔ آنحضرتؐ نے بارہا فرمایا کہ

"میں جا رہا ہوں اور تمھارے درمیان دو گراں بہا امانتیں چھوڑ رہا ہوں : ان میں سے ایک اللہ کی کتاب (قرآن) اور دُوسرے میرے اہلبیت (عترت) ہیں۔ یہ ہرگز ایک دُوسرے سے جُدا نہ ہوں گے اور تم جب تک انھیں تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔"

قرآنِ کریم

قرآنِ کریم اسلامی حقائق اور معارف کا سرچشمہ ہے جو آسمانی کتاب اور رسولِ اکرمؐ کی نبوّت کی سَنَد ہے۔ قرآنِ مجید اللہ کا کلام ہے جو آنحضرتؐ پر نازل ہوا اور ان کے مبارک وسیلے سے بنی نوعِ انسان تک پہنچا۔

قرآنِ کریم عالمِ انسانیت کو علمی اور عملی مواد مہیّا کرتا ہے جس پر عمل کر کے انسان دنیا اور آخرت کی بھلائی اور نیکی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم آنحضرتؐ کی دعوت کی ۲۳ سالہ مدّت میں بتدریج نازل ہوا اور یہ لوگوں کی ضروریات کا حل پیش کرتا ہے۔

قرآنِ کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کا مقصد نیک بختی کی جانب لوگوں کی رہنمائی کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ انسان کو بڑے دِلکش انداز میں دُرست اعتقادات، پسندیدہ اخلاق اور نیک اعمال کی تعلیم دیتا ہے جو کہ فرد اور انسانی معاشرے کی خوش نصیبی کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے :

"ہم نے تمھاری طرف وہ کتاب بھیجی ہے جو ہر چیز کو واضح کرتی ہے۔"
(سورۂ نحل - آیت ۸۹)

قرآنِ مجید نے معارفِ اسلامی مختصراً بیان فرمائے ہیں اور ان کی تفصیل اور

بالخصوص فقہی مسائل کی توضیح کے لیے لوگوں کو نبیِ اکرمؐ کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے :

"ہم نے قرآن پاک نازل کیا ہے تاکہ جو کچھ خدا کی جانب سے لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہے وہ تم ان پر واضح کر دو۔"

(سورۂ نحل - آیت ۴۴)

ایک اور آیت میں کہا گیا ہے :

"یہ کتاب ہم نے تمھارے پاس اِس لیے بھیجی ہے تاکہ تم لوگوں کے اختلافات حل کرو اور سچّائی ان پر واضح کر دو۔"

(سورۂ نحل - آیت ۶۴)

قرآنِ کریم لوگوں کو اندھی تقلید کی دعوت دیے بغیر ان سے عام زبان میں اور ان کی خداداد عقل کے مطابق بات کرتا ہے۔ وہ انھیں بہت سی ایسی معلومات کی یاد دلاتا ہے جو انسان لازماً اپنی فطرت کی بدولت سیکھتا ہے۔ وہ ان سے ہرگز بے نیاز نہیں ہو سکتا اور ان کے اعتراف سے پہلوتہی نہیں کر سکتا۔

خُدا فرماتا ہے :

"قرآن ایک ایسا کلام ہے جو حق کو باطل سے جُدا کرتا ہے یہ ایک ایسا کلام نہیں جو بیکار اور سرسری طور پر بیان کیا گیا ہو یہ مطلب کو یوں بیان کرتا ہے کہ اس کی دلیل کی روشنی آگے بڑھتی رہتی ہے اور یہ ہمیشہ کے لیے سب اشخاص کے لیے زندہ اور پائندہ ہے۔ یہ لوگوں کے عام کلام کی مانند بھی نہیں ہے جو جہاں تک ان کی سمجھ اور عقل کام کرتی ہے معاملہ فہمی پر مبنی

ہوتا ہے اور اس کا بقیہ حصّہ غفلت اور لاپروائی کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ خُدا کا کلام ہے جو کھلی اور چھپی ہوئی ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر مصلحت اور خرابی سے باخبر ہے۔ (سورۂ طارق۔ آیت ۱۳۔۱۴)

لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی حقیقت بین آنکھ کو کھولے اور ہمیشہ اس آیتِ شریفہ کو یاد رکھے۔ اسے چاہیے کہ خدا کے کلام کو زندہ اور پائندہ سمجھے اور جو کچھ دُوسروں نے سمجھا اور کہا ہو اس پر قناعت نہ کرے، بلکہ آزادانہ غور و فکر کو اپنائے کہ جو انسان کی بے مثال خصوصیّت ہے اور جس کی قرآن مجید نے بھی تاکید کی ہے۔ کیونکہ خدا کی کتاب ہمیشہ کے لیے ہر شخص کے لیے قولِ فصل اور زندہ دلیل ہے اور ایسی کتاب ایک مخصوص طبقے کے سمجھنے تک محدود نہیں ہو سکتی۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"مُسلمانوں کو اہلِ کتاب کی مانند نہیں ہونا چاہیے کہ جنھیں کتاب دی گئی اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کے دِل سخت ہوتے گئے اور انھوں نے معارفِ الٰہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"

(سورۂ حدید۔ آیت ۱۶)

قرآن مجید چاہتا ہے کہ لوگ اپنی فطرت کی طرف لوٹیں اور حق کو قبول کریں اور وہ ان معنوں میں کہ پہلے اپنے آپ کو حق کو غیر مشروط طور پر قبول کرنے کے لیے آمادہ کریں۔ پھر جس چیز کو سچّا پائیں اور اس میں اپنا دُنیا اور آخرت کا نفع دیکھیں، اُسے شیطانی وسوسوں اور ہوا و ہوس کی آواز پر کان دھرے بغیر قبول کر لیں۔

اس کے بعد انھیں چاہیے کہ معارفِ اسلامی کو اپنے زندہ شعور کے سامنے

پیش کریں۔اگر وہ دیکھیں کہ اس دین کے احکام حق وصداقت پر مبنی ہیں اور ان کی حقیقی بھلائی اور آسودگی انھیں قبول کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے میں ہے تو وہ انھیں قبول کرلیں۔پس دین پر عمل کرنے کی صورت میں انسان کی زندگی کا طریقہ اور وہ قانون جو معاشرے میں رائج ہوگا وہ وہی قانون ہوگا جسے انسان فطری طور پر چاہتا ہے۔

اور بالآخر انسان کے طور طریقے یکساں ہوں گے، جن کے تمام اجزا اور مواد انسان کی مخصوص ساخت سے مکمّل طور ہم آہنگ ہوں گے اور ان میں کوئی تضاد اور تناقض نہ ہوگا۔یہ طور طریقے متضاد نہیں ہوں گے کہ کہیں تو ان کا سرچشمہ روحانیت ہو اور کہیں مادّیت نیز کہیں تو یہ عقلِ سلیم کے مطابق ہوں اور کہیں ہوا وہوس کے تابع ہوں۔

خدا قرآنِ مجید کا وصف بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"قرآن لوگوں کی رہنمائی حق وحقیقت کی طرف کرتا ہے۔یعنی ایک ایسے سیدھے راستے کی طرف کہ جس میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں ہے۔" (سورۂ احقاف۔آیت ۳۰)

پھر فرماتا ہے :

"یہ قرآن لوگوں کی رہنمائی ایک ایسے دین اور قانون کی طرف کرتا ہے جو تمام قوانین اور طریقوں سے زیادہ قوی اور زیادہ درست ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل۔آیت ۹)

ایک اور آیت میں اسلام کی اس قوّت اور راستی کی وجہ اس کی فطرتِ انسانی سے ہم آہنگی بتائی گئی ہے کیونکہ یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ جو راستہ اور طریقہ انسان کی فطری ضرورتوں کو پورا کرے وہ اسے بہترین طور

پر کامیاب اور خوش نصیب بناتا ہے۔ ارشاد ہوا ہے :

"باطل سے ہٹ کر اپنا رُخ دین کی طرف کیے رہو۔ یہ وہ دین ہے جو انسان کی ناقابلِ تغیّر فطرت کے ساتھ مکمل ہم آہنگی رکھتا ہے۔ یہی وہ دین ہے جو انسانی معاشرے کا انتظام چلا سکتا ہے اور اسے نیک بختی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔"

(سورۂ روم۔ آیت ۳۰)

پھر فرماتا ہے :

"یہ کتاب تم پر اس لیے نازل کی گئی ہے تاکہ تم لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے آؤ۔" (سورۂ ابراہیمؑ۔ آیت ۱)

قرآن مجید لوگوں کو روشن راستے کی طرف دعوت دیتا ہے تاکہ اس روشنی کے ذریعے انھیں نشانِ منزل دکھلائے۔ لازماً یہ راستہ وہی ہو سکتا ہے جو انسان کی فطری خواہشات یعنی اس کی حقیقی ضروریات کو پورا کرے اور انسان کی عقلِ سلیم جو نظریہ رکھتی ہو اس سے ہم آہنگ ہو۔ پس یہ راستہ وہی دینِ فطرت ہے جسے اسلام کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن وہ طریقہ جس کی بنیاد ہَوا و ہَوس اور مُعاشَرے کے با اثر افراد کی شہوت اور غصّے کی جبلّت کی تسکین پر ہو۔ اسی طرح وہ طریقہ جو آبا و اجداد کی اندھی تقلید کے طور پر اپنایا گیا ہو یا وہ طور طریقے جو ایک پس ماندہ اور کمزور قوم، طاقتور قوموں کی نقّالی کر کے اختیار کرتی ہے اور جو کچھ وہ قومیں کر رہی ہوں اسے عقلِ سلیم کی کسوٹی پر پرَکھے بغیر محض اس لیے اپنا لیتی ہے تاکہ وہ بھی ان قوموں کے مشابہ دکھائی دے۔ ایسے تمام طریقوں کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں نکلتا کہ انسان تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے اور

درحقیقت ایک ایسے راستے پر چل کر انسان ہرگز منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"کیا وہ شخص جو مردہ تھا اور ہم نے اُسے (دین کے ذریعے) زندہ کردیا اور اسے روشنی دی جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان اپنی زندگی گزارتا ہے، اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو گوناگوں اندھیروں میں پھنسا ہوا ہے اور ان میں سے کسی طرح نہیں نکل سکتا" (سورۂ انعام - آیت ۱۲۲)

بالآخر اسی بات سے اسلام اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے مطابق اس کتابِ مقدس کی اہمیت اور عظمت واضح ہوجاتی ہے۔ علاوہ ازیں قرآنِ مجید کو نازل ہُوئے اب چودہ صدیاں ہوگئی ہیں، اس عرصے میں مختلف وجوہ کی بنا پر یہ ہمیشہ مختلف معاشروں میں بڑے بلند مقام کا حامل رہا ہے اور ہمیشہ اہلِ عالم کی توجّہ اپنی جانب مبذول کراتا رہا ہے۔

بلاشبہ قرآنِ مجید ایک آسمانی کتاب ہے جو اسلام کے آفاقی اور اَبدی مذہب کی بنیاد ہے اور اس میں اسلام کے تمام اعلیٰ مطالب بڑے دِلکش انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے اس کی وقعت خُدا کے دین کی وقعت کے برابر ہے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید خُدا کا کلام اور رسولِ اکرمؐ کا جاودانی معجزہ ہے۔

قرآن معجزہ ہے

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ عربی زبان ایک بڑی وسیع زبان ہے جو انسان کے دلی مقاصد کو واضح ترین اور دقیق ترین انداز سے ادا کرسکتی ہے اور

اس خصوصیّت کے بارے میں کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ دورِ جاہلیت (یعنی قبل از اسلام) کے عرب جو عموماً خانہ بدوش لوگ تھے، مدنی زندگی کے طور طریقوں سے اگرچہ بے بہرہ اور زندگی کی بیشتر نعمتوں سے قطعاً محروم تھے لیکن قدرتِ بیان اور فصاحت و بلاغت میں ایک بلند مقام رکھتے تھے اور تاریخ کے صفحات ان کا ثانی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

ادبیاتِ عرب کے بازار میں اچھّا کلام سب سے قیمتی چیز تھی اور خوبصورت اور ادیبانہ تقاریر کو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جس طرح ان لوگوں نے خانۂ کعبہ میں اپنے دیوتاؤں کے بُت نصب کر رکھے تھے، اسی طرح وہ درجۂ اوّل کے شعراء کے دلکش اشعار کے طغرے کعبہ کی دیواروں پر لٹکاتے تھے۔ وہ بڑے بڑے دقیق مطالب کو رتّی بھر غلطی کے بغیر ادا کرتے تھے اور اپنے کلام کے حُسن میں پُورا زور لگاتے تھے۔

شروع شروع میں جب قرآنِ مجید کی آیات رسولِ اکرمؐ پر نازل ہوئیں اور آپ نے لوگوں کے سامنے ان کی تلاوت کی تو عربوں، ان کے شعراء اور مقرّرین میں تہلکہ مچ گیا۔ کیونکہ قرآن مجید کے دِلکش، شِیریں اور پُرمعنیٰ الفاظ نے دلوں پر اتنا اثر کیا اور باذوق لوگ اس کے اِس قدر گرویدہ ہوئے کہ ہر خوبصورت کلام کو بھلا بیٹھے اور استاذانِ سخن کے جو آبدار اشعار "معلّقات" کے نام سے کعبہ میں لٹکا رکھے تھے وہ اُتار لیے۔ خدا کے اِس خوبصورت اور دِل رُبا کلام نے دلوں پر بے پناہ اثر کیا اور اس کی شیرینی کے سامنے سب شیریں زبانوں کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔

لیکن دُوسرے پہلو سے یہ کلام مُشرک اور بُت پرست لوگوں کے لیے

بے حد تلخ اور ناگوار تھا کیونکہ یہ اپنے مؤثر بیان اور محکم منطق کے ذریعے عقیدۂ توحید کی اشاعت کرتا تھا اور شرک اور بُت پرستی پر بڑی شدّت سے تنقید کرتا تھا۔ جن بُتوں کو وہ لوگ اپنے خُدا کہتے تھے، ان سے حاجتیں طلب کرتے تھے، ان کے نام پر قربانیاں کرتے تھے اور بالآخر انھیں خُدا کی بجائے پُوجتے تھے یہ کلام ان کی تحقیر کرتا تھا اور انھیں اثر اور خاصیت سے عاری محض پتّھر اور لکڑی کے بے جان مجسّمے قرار دیتا تھا۔ یہ ان وحشی عربوں کو حق پرستی، عدالت اور انسانیت کے احترام کی دعوت دیتا تھا جو سرتاپا غرُور اور نخوت کے پتلے تھے اور جنھوں نے اپنی زندگی کی بنیاد قتل و غارت اور رہزنی پر رکھی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ بُت پرست عرب لڑائی جھگڑے پر اُتر آئے اور اس شمعِ ہدایت کو بجھانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے لگے لیکن ان مذموم کوششوں سے انھیں مایوسی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ع

وہ شمع کیا بُجھے جسے روشن خُدا کرے

رسولِ اکرمؐ کی بعثت کے ابتدائی دَور میں وہ لوگ آپ کو فُصحاء کے طبقے سے تعلق رکھنے والے ولید نامی شخص کے پاس لے گئے جس کا شمار عرب کے معروف سخن شناسوں میں ہوتا تھا۔ آنحضرتؐ نے سورۂ حٰمٓ سجدہ کی چند ابتدائی آیتوں کی تلاوت فرمائی۔ ولید اپنے تمام کبر و غرور کے باوجود بڑے غور سے سُن رہا تھا حتّیٰ کہ آنحضرتؐ اس آیت پر پہنچے:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً
مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ

جُوں ہی آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی ولید کی حالت غیر ہوگئی، اس کا تمام بدن کانپنے لگا اور اس پر بے خُودی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ یہ

صورت دیکھ کر لوگوں نے اپنی اپنی راہ لی۔
بعد میں کچھ لوگ ولید کے پاس آئے اور اس سے گلہ کرنے لگے کہ تو نے ہمیں محمدؐ کے سامنے ذلیل اور رسوا کیا۔
اس نے جواب دیا کہ نہیں یہ بات نہیں۔ خدا کی قسم! جیسا کہ تم جانتے ہو میں کسی سے نہیں ڈرتا اور نہ ہی کوئی طمع رکھتا ہوں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں ادیب اور سخن شناس ہوں۔ جو کلام میں نے محمدؐ سے سنا ہے وہ لوگوں کے کلام سے قطعاً مشابہ نہیں۔ یہ کلام ایسا پرکشش اور دلفریب ہے کہ اسے نہ نظم کہا جا سکتا ہے نہ نثر۔ بلکہ یہ بڑا ہی پرمعنیٰ اور محکم کلام ہے۔ اگر یہ ضروری ہے کہ میں اس کے بارے میں ضرور کوئی فیصلہ دوں تو مجھے تین دن کی مہلت دو تاکہ میں اس کے متعلق غور کروں۔ جب تین دن بعد لوگ اس کے پاس آئے تو ولید نے کہا: "محمدؐ کا کلام سحر اور جادو ہے جو دلوں کو فریفتہ کر لیتا ہے۔"
مشرکین ولید کے کہنے کے مطابق قرآن مجید کو سحر اور جادو قرار دے کر اسے سننے سے پرہیز کرتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی اسے سننے سے منع کرتے تھے۔ پھر جب کبھی رسول اکرمؐ مسجد الحرام میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے تو وہ لوگ غل مچاتے اور تالیاں بجاتے تھے تاکہ آپ کی آواز دوسروں تک نہ پہنچ سکے۔
ان سب باتوں کے باوجود چونکہ وہ قرآن مجید کے پرکشش اور دلربا بیان کے دلدادہ تھے اس لیے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آنحضرتؐ کے گھر کی دیوار کے پاس جمع ہو جاتے تھے اور تلاوت قرآن سنتے تھے۔ اس وقت وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اس کلام کو مخلوق کا کلام

نہیں کہا جاسکتا۔ خُدا اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرماتا ہے :

"ہم خوب جانتے ہیں کہ جب یہ لوگ تمھیں تلاوت کرتے ہوئے سُنتے ہیں تو قرآن کو کن کن کانوں سے سنتے ہیں اور ہم خوُب جانتے ہیں کہ یہ ظالم لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص پر جادو کا اثر ہے۔ مگر وہاں سے واپس لوٹ کر وہ ایک دُوسرے سے کانا پھوسی کرتے ہیں۔" (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۴۷)

جب رسول اکرمؐ کعبہ کے نزدیک تلاوتِ قرآن میں یا لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے میں مشغول ہوتے اور عرب کے سخن ور آپ کے سامنے سے گزر جانا چاہتے تو وہ جُھک جاتے تاکہ دیکھے اور پہچانے نہ جائیں۔ چنانچہ خُدا فرماتا ہے :

"وہ جُھک جاتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو رسولِ اکرمؐ سے اوجھل رکھیں۔" (سورۂ ہودعٓ۔ آیت ۵)

رسُولِ اکرمؐ پر اتّہام بازی

کُفّار اور مشرکین فقط قرآنِ مجید کو ہی جادو نہیں کہتے تھے بلکہ وہ آنحضرتؐ کی پوری دعوت کو جادُو کا نام دیتے تھے۔ جب کبھی آپ عام لوگوں کو راہِ خُدا کی دعوت دیتے، انھیں حقائق بتاتے یا وعظ و نصیحت کرتے تو مُشرکین کہتے کہ یہ جادو کا وار کر رہے ہیں جب کہ آپ ان کے سامنے ہر حالت میں ایسے مسائل کی وضاحت کرتے تھے کہ جن کی صحّت کو وہ لوگ اپنے انسانی شعور اور خدا داد فطرت کی بدولت سمجھ لیتے تھے۔ آپ ان کے لیے ایسے واضح راستے کی نشان دہی کرتے تھے جس میں وہ انسانی معاشرے کی نیک بختی اور کامیابی کا

مشاہدہ مکمل طور پر کر سکتے تھے اور اسے قبول نہ کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی بہانہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتوں کو جادو کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

کیا یہ کہنا جادو ہے کہ ؟

"جن پتھروں اور لکڑیوں کو تم اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو ان کی پرستش نہ کرو۔ تم ان کے لیے اپنے فرزندوں کی قربانی دیتے ہو اور خرافات کے پیچھے دوڑتے ہو۔"

اور کیا پسندیدہ اخلاق مثلاً سچّائی، راست بازی، خیر خواہی، انسان دوستی، صُلح صفائی، عدالت اور انسانی حقوق کے احترام کو جادو کا نام دیا جاسکتا ہے ؟

خُدا اپنے کلام میں اس مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوُئے فرماتا ہے :

"جب تم کفّار سے کہتے ہو کہ تم موت کے بعد زندہ کیے جاؤ گے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ جادو کر رہا ہے۔" (سورۂ ہودؑ۔ آیت ۷)

قرآن کا مشرکین کو مقابلے کے لیے للکارنا

کُفّار اور مشرکین جن کے دلوں میں بُت پرستی کا توہّم پر مبنی مسلک رچا بسا ہُوا تھا، وہ دعوتِ اسلامی کو قبول کرنے اور حق و صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر قطعاً آمادہ نہ تھے لہذا وہ رسولِ کریمؐ کو جھٹلاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور جس کلام کو یہ خُدا سے منسوب کرتا ہے وہ دراصل اس کا اپنا کلام ہے۔

اِس تہمت کو رفع کرنے کے لیے قرآنِ مجید نے فصاحت اور بلاغت کے میدان کے شہسواروں کو مقابلے کی دعوت دی اور کہا کہ اگر وہ رسولِ اکرمؐ کو

جھٹلانے میں حق بجانب ہیں تو اس جیسا کلام پیش کریں اور یوں اس دعوت کے بے بُنیاد ہونے کا ثبوت فراہم کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن کو خُود گھڑ لیا ہے۔ اگر یہ سچ کہتے ہیں تو یہ بھی اس کی مانند کلام تیار کر کے لے آئیں"

(سورۂ طور۔ آیت ۳۴)

پھر فرماتا ہے :

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن ایک جھُوٹ ہے جو خُدا سے منسوب کیا گیا ہے (یعنی یہ خُدا کا کلام نہیں محمدؐ کا کلام ہے) ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو تم بھی قرآن کی سورتوں جیسی ایک سورت بنا کر لاؤ۔"

(سورۂ یونس ؑ۔ آیت ۳۸)

عرب کے کفّار اور مشرکین اپنی تمام فصاحت و بلاغت اور سخن وری کے غرور کے باوجود اس چیلنج کو قبول کرنے سے قاصر رہے، وہ مقابلے پر نہ آئے اور انھوں نے مجبوراً ادبی مقابلے کو خونی مقابلے میں تبدیل کر دیا کیوں کہ ان کے لیے ادبی مقابلے میں شکست اور رسوائی کی بہ نسبت قتل ہو جانا زیادہ آسان تھا۔ یوں عرب کے سخن ور قرآن مجید کے مقابلے سے عاجز ہو گئے، نہ صرف وہ کہ جو نزُولِ قرآن کے وقت موجود تھے بلکہ وہ بھی جو بعد میں پیدا ہوئے اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکے اور پُوری زور آزمائی کے بعد بالآخر میدان سے بھاگ نکلے۔

چُونکہ انسان کی طبیعت ہمیشہ اس بات کی طرف راغب رہتی ہے کہ جب کوئی دُوسرا شخص کسی فن یا ہنر کا مظاہرہ کرے تو وہ اس کی طرف متوجّہ ہو جاتے خواہ وہ ہنر مکّہ بازی اور رسّی پر ناچنا ہی کیوں نہ ہو کہ جس کا

معاشرے کی زندگی پر براہِ راست کوئی اثر نہیں لیکن کچھ لوگ ایسے پیدا ہوجاتے ہیں جو اسی چیز میں اس سے بہتر کارکردگی دکھانا چاہتے ہیں اور مقابلے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ قرآنِ مجید کی گھات میں رہتے ہیں اور اگر اس آسمانی کتاب سے مقابلے کا کوئی راستہ انھیں مل جائے تو ایک لحظہ کے لیے بھی اس پر چلنے سے باز نہ رہیں۔

لیکن یہ لوگ مقابلے میں ناکام رہے اور جادو کے نام کا بہانہ بنا کر یہ نہ کہہ سکے کہ قرآن جادو ہے کیونکہ جادو ایک ایسا عمل ہے جو اپنی خاصیّت کے مطابق سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر کے دکھاتا ہے۔ پھر اگر قرآنِ مجید اپنے پرکشش لہجے اور بے نظیر فصاحت و بلاغت سے لوگوں کے دل جیتتا ہے تو یہ اس کی فطری خاصیّت ہے اور اس کا جادو سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اگر وہ اپنے الفاظ میں لوگوں کو کسی ایک مقاصد کی جانب دعوت دیتا ہے، انھیں ایسے حقائق کی یاد دلاتا ہے کہ جنھیں وہ اپنے انسانی شعور اور خداداد فطرت کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں اور وہ انھیں حق شناسی، خیر خواہی، عدالت اور انسان دوستی کی جانب راغب کرتا ہے کہ جن کی اچھّائی سے عقلِ سلیم انکار نہیں کرسکتی تو یہ حقیقت کے بیان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ مگر وہ بے بس ہوگئے اور یہ نہ کہہ سکے کہ قرآن ایک ایسا کلام ہے جو انسان کے کلام کی انتہائی بلندی پر ہے اور خوبصورتی، دِلکشی اور بلاغت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ لیکن ان کا یہ کہنا اِس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ خُدا کا کلام ہے۔

دُوسرے الفاظ میں ہر صفت یا فن مثلاً جرأت، دلاوری، لکھنا، پڑھنا، وغیرہ کہ جس میں ترقّی ہوسکتی ہے اس کا انسانی تاریخ میں قُدرتی طور پر ایک نابغہ ہوتا ہے جو مقابلے میں اوّل آنے والے کے رُتبے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس چیز

میں کیا امر مانع ہے کہ رسولِ اکرمؐ اپنے مخصوص انداز میں عربی بولنے میں بلاغت کے بلند ترین رُتبے پر ہوں۔ چُونکہ ہر وہ صفت اور ہنر جو ایک نابغہ کے ہاتھوں ترقی کی بلندی پر پہنچے وہ خواہ کچھ بھی ہو، بالآخر اس کا سرچشمہ انسانی قابلیت اور استعداد ہے اور وہ انسانی فطرت سے جنم لیتا ہے، لہٰذا دُوسروں کے لیے بھی ممکن ہے کہ جو راستہ اس نابغہ کے ذریعہ کھلا ہو وہ اس پر چل پڑیں اور ضروری محنت اور کوشش کے ذریعے ایسا کام انجام دیں جو اسی نابغہ جیسا ہو اور اسی اُسلوب سے بلکہ اس سے بہتر اُسلوب سے کیا جائے اگرچہ وہ ہر لحاظ سے اس جیسا نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ نابغہ کہ جو راستہ کھولتا ہے اسے فقط پیشوا اور رہنما کی حیثیت حاصل رہتی ہے، مثلاً سخاوت میں حاتم طائی سے بلند رتبہ حاصل کرنا ممکن نہیں لیکن اس جیسے کام کیے جاسکتے ہیں۔ خوش نویسی میں میؔر پر اور نقّاشی میں مانؔی پر سبقت حاصل نہیں کی جاسکتی لیکن صحیح کوشش کرنے پر میؔر جیسے الفاظ لکھنا اور مانؔی جیسی چھوٹی سی تصویر بنانا ممکن ہے۔

اِسی قاعدے کی بنا پر اگر قرآنِ مجید انسان کا بلند ترین کلام ہوتا (نہ کہ کلامِ خُدا) تو دُوسروں کے لیے اور بالخصوص دُنیا کے نام ور سخن وروں کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے تجربے کی بنا پر اسی اُسلوب میں ایک کتاب یا کم از کم قرآنِ مجید کی ایک سورت جیسی سورت لکھتے کیونکہ قرآنِ مجید نے ان لوگوں کو چیلنج دیتے ہوئے اپنے سے بہتر کلام کا نہیں بلکہ اپنے جیسے کلام کا مطالبہ کیا ہے:

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۳)

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ ۔ (سورۂ یونسؑ۔ آیت ۳۸)

فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيٰتٍ ۔
(سورۂ ہود ۱۱- آیت ۱۳)

لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۔ (سورۂ بنی اسرائیل-آیت ۸۸)

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ ۔ (سورۂ طور-آیت ۳۴)

بحث کے آخر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآنِ مجید نے فقط اپنی فصاحت و بلاغت اور بے نظیر ترتیب کی وجہ سے ہی دوسروں کو بے بس نہیں کیا بلکہ اس جہت سے بھی کہ یہ انسان کے تمام مسائل کے حقیقی حل پر مشتمل ہے، اس نے غیب کی خبریں دی ہیں اور حقائق بیان کیے ہیں۔ نیز ان دوسری خوبیوں کی بنا پر کہ جو اس آسمانی صحیفے میں جلوہ گر ہیں، یہ چیلنج کرتا ہے اور تمام بنی نوعِ انسان کے سامنے اعلان کرتا ہے کہ وہ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتے۔

اہلِ بیتِ رسولؐ

عُرف اور لُغت میں ایک شخص کے "اہلِ بیت" اور "خاندان" اُن اشخاص کو کہا جاتا ہے جو اُس کے گھر کے چھوٹے سے معاشرے کے ارکان ہوتے ہیں مثلاً بیوی، بیٹا، بیٹی اور ملازم جو اس گھر کے سرپرست کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

بعض اوقات "اہلِ بیت" کے معانی کو وسعت دے کر اس لفظ کو قریبی رشتے داروں مثلاً باپ، ماں، بہن اور اس کے بچّوں، چچا، پھوپھی، خالہ اور ان کے بچّوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

تاہم کتاب وسُنّت میں رسولِ اکرمؐ کے "اہلِ بیت" سے ان دوؔ عام معنیٰ میں سے کوئی بھی معنیٰ مراد نہیں ہیں کیونکہ متواتر روایات کے مطابق جو عام اور خاص دونوں ذرائع سے وارد ہوئی ہیں۔ "اہلِ بیت" ایک باشرف نام و نشان ہے جو رسول اکرم، علی، فاطمہ، حَسَن اور حُسین علیہم السلام سے مخصوص ہے۔

اِس بنا پر رسولِ اکرمؐ کے اہلِ خانہ اور دُوسرے رشتہ دار (حالانکہ عُرف اور لُغت کے مطابق وہ اہلِ بیت شمار ہوتے ہیں) اس معنیٰ میں "اہلِ بیت" نہیں ہیں، حتّیٰ کہ خدیجۃ الکبریٰؑ بھی جو آنحضرتؐ کی ازواج میں بلند ترین مقام رکھتی ہیں اور حضرت فاطمہ زہراؑ کی والدہ ہیں، نیز اسی طرح ابراہیم کہ جو رسولِ اکرمؐ کے صُلبی فرزند اور بڑے رُتبے کے مالک ہیں، "اہل بیت" میں شامل نہیں ہیں۔

انھیں روایات اور ان کے علاوہ کئی ایک دوسری روایات کے مطابق بارہ اماموں میں سے وہ نو امام بھی جو امام حسینؑ کے فرزند اور ان کی نسل میں سے ہیں، اہلِ بیت میں شامل ہیں۔ لہذا "اہلِ بیتؑ" چودہ معصوم ہی ہیں اور عام طور پر جب "اہلبیتِ پیغمبرؐ" کہا جاتا ہے تو اس سے مُراد آنحضرتؐ کے علاوہ تیرہ اشخاص ہوتے ہیں جو آپ کی عترت ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کے اہلِ بیت اسلام میں کثیر فضائل ومناقب اور بے نظیر مقامات کے مالک ہیں جن میں سے دوؔ مقام سب سے زیادہ اہم ہیں:

۱۔ حدیثِ کساء

ایک دن جب کہ اُمّ المومنین ام سلمہؓ کی باری تھی اور رسولِ اکرمؐ اُن کے

گھر میں تھے، آپ نے یہ دیکھ کر کہ خُدا کی رحمت نازل ہو رہی ہے، فرمایا:

"میرے پاس بُلاؤ، میرے پاس بلاؤ۔"

جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ کِسے بُلایا جائے؟ تو آپ نے فرمایا:

"میرے اہلبیت کو۔ علیؑ کو اور فاطمہؑ، حسنؑ اور حُسینؑ کو۔"

پس وہ رسولؐ کے اردگرد ایک فرش پر جمع ہو گئے۔ پھر آنحضرتؐ نے خود اپنے آپ کو اور انھیں ایک خیبری چادر میں لپیٹ لیا اور فرمایا:

"اے پروردگار! یہ میری آل ہیں، یہ میرے اہلبیت ہیں۔

پس درود بھیج محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر۔

اور خُدا نے یہ آیت نازل فرمائی:

اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ

وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ۔ (سُورۂ احزاب۔ آیت ۳۳)

اُمِّ سلمہؓ پردے کی اوٹ میں تھیں، وہ کہتی ہیں:

"میں گھر کے دروازے پر بیٹھی تھی اور گھر کے اندر سات افراد تھے یعنی رسول اکرمؐ، جبرئیلؑ، میکائیلؑ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ میں نے گھر کے اندر جھانکا اور کہا: یا رسول اللہؐ! کیا میں بھی آپ کے اہلِ بیت میں سے ہوں؟ پھر وہ کہتی ہیں کہ خُدا کی قسم! انھوں نے ہاں میں جواب نہیں دیا۔ لیکن فرمایا: تم خیر پر ہو، تم رسولؐ کی بیویوں میں سے ہو۔" لے

لے ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ بی بی ام سلمہؓ نے سوال کیا: کیا میں اہلِ بیت میں سے نہیں ہوں؟ آنحضرتؐ نے جواب دیا: تم خیر پر ہو اور فقط یہ ہیں میرے اہل بیت۔

رسولِ اکرمؐ نے اس "داستان" میں اپنے "اہلِ بیت" کو پوری امت سے ممیّز کیا ہے اور اپنے قول و فعل سے "آیتِ تطہیر" کی تشریح بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ انھوں نے پھر فرمایا کہ: میں اور میرے اہلِ بیت گناہوں سے پاک اور پاکیزہ ہیں اور اسی بات کا مسجد میں مسلمانوں کے سامنے اعلان کیا کیونکہ ہر نماز کے وقت آپ علیؑ و فاطمہؑ کے گھر کے دروازے پر آتے تھے اور فرماتے تھے کہ "اے اہلِ بیتِ رسولؐ! تم پر خدا کا درود اور رحمت و برکت ہو۔"

بعض صحابہ کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ عمل (امام علیؑ کے گھر کے دروازے پر آنا) مُسلسل چھ مہینے تک انجام دیا۔ بعض دوسروں نے یہ مدّت سات مہینے اور بعض نے آٹھ مہینے اور بعض نے نو مہینے بتائی ہے۔ بعض نے ان ہندسوں میں کمی بیشی کی ہے اور جس کے ذہن میں جو ہندسہ تھا وہی اس نے نقل کر دیا ہے۔

آنحضرتؐ نے یہ طریقہ اس لیے اختیار فرمایا کہ وہ چاہتے تھے کہ اپنے قول اور فعل سے امّتِ اسلامیہ کو ذہن نشین کرا دیں کہ جن اشخاص کے بارے میں آیتِ تطہیر نازل ہوئی ہے وہ کون کون ہیں اور اس آیت کے کیا معنیٰ ہیں۔

اِس سلسلے میں آنحضرتؐ نے جو کوشش فرمائی وہ اس بنا پر تھی کہ آپ پر یہ لازم تھا کہ مندرجہ ذیل آیت کے مضمون پر عمل فرمائیں:

"ہم نے آپ پر ذکر (یعنی قرآن مجید) اتارا ہے تاکہ جو احکام لوگوں کیلئے نازل کیے گئے ہیں آپ ان سے صاف صاف بیان کر دیں شاید کہ وہ لوگ غور و فکر کریں۔" (سورۂ نحل۔ آیت ۴۴)

اہلِ بیتؑ کے بارے میں آیتِ تطہیر کے نزول کی داستان اس زمانے میں اِس قدر مشہو

رکھتے ہیں اور اس مقام کے تقاضے کے مطابق ان سے ہرگز کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔

تھی کہ کئی ایک حضرات کی گفتگو میں اسے شہادت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک امام حسن علیہ السلام ہیں جو خود اصحابِ کساء میں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے پدر بزرگوار کی وفات کے بعد ایک خطبہ میں فرمایا :

"میں ان اہلِ بیت میں سے ہوں جن سے اللہ تعالیٰ نے نجاست کو دُور رکھا ہے اور انھیں پاک اور پاکیزہ کر دیا ہے۔"

اسی طرح بی بی ام سلمہؓ نے عمرہ ہمدانی کو آیتِ تطہیر پڑھ کر سُنائی۔ عمرہ نے حضرت امام علیؑ کی شہادت کے بعد ان کے بارے میں بی بی ام سلمہؓ سے سوال کیا تھا جس کے جواب میں اُمّ المؤمنین نے اِس آیت کی تلاوت کی۔

جب معاویہ نے سعد بن ابی وقاص کو کہا کہ وہ امام علیؑ کو بُرا بھلا کہے تو اس نے بھی امیر المؤمنینؑ کی فضیلت کے بارے میں اس آیت سے استدلال کیا اور جب ایک گروہ نے ابن عباس کے سامنے امام علیؑ کو برا بھلا کہا تو انھوں نے بھی اسی آیتِ تطہیر کو جنابِ امیرؑ کے دس فضائل میں شمار کیا۔

واثلہ نے بھی جو صحابیٔ رسولؐ ہیں آیتِ تطہیر کو ان لوگوں کو جھٹلانے کے لیے بطورِ شہادت پیش کیا جو امام علیؑ کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

جب بی بی ام سلمہؓ کو امام حسینؑ کی شہادت کی خبر ملی اور انھوں نے یہ سُنا کہ اہلِ عراق نے امامؑ پر لعنت کی ہے تو انھوں نے بھی یہ "داستان" اور آیت نقل کی۔

امام زین العابدینؑ نے بھی اس شامی مرد کو جو یزید کی تعریف کر رہا تھا اور اہلِ بیتؑ کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا یہی آیت پڑھ کر سنائی۔

(دیکھیے) صحیح مسلم جلد ۷ صفحہ ۱۳۵۔ صحیح ترمذی جلد ۱۲ صفحہ ۸۵۔ مسند طیالسی جلد ۸ صفحہ ۲۷۴۔ مجمع

۲۔ حدیثِ ثقلین

حدیثِ ثقلین کی رُو سے کہ جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، رسولُ اللہؐ کی عترت ہمیشہ قرآن کے ساتھ رہے گی اور ان میں اور خُدا کے کلام میں کبھی جدائی نہیں ہوگی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے معانی اور دینِ اسلام کے مقاصد کو سمجھنے میں وہ کسی لغزش سے دوچار نہیں ہو سکتے۔

اِن دُو مقامات کی بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کا قول اور فعل خود رسولِ اکرمؐ کی مانند حجّت ہو۔ چنانچہ اہلِ تشیُّع کا عقیدہ یہی ہے

اہلِ بیتؑ کے فضائلِ منصوصہ

عام اور خاص اشخاص نے رسولِ اکرمؐ کی بہت سی احادیث امام علیؑ اور دیگر افرادِ اہل بیت کی منقبت میں نقل کی ہیں۔ ہم یہاں اہلِ بیتِ رسولؐ کے مناقب میں سے تین منقبتوں کا ذکر کرتے ہیں:۔

۱ ٭ ہجرت کے چھٹے سال میں شہر نجران کے عیسائیوں نے اپنے بزرگوں اور عالموں کا انتخاب کر کے انھیں مدینہ بھیجا۔ ان نمائندوں نے پہلے رسولِ اکرمؐ سے مناظرہ کیا لیکن شکست کھا گئے۔ تب خُدا کی طرف سے آیتِ مباہلہ نازل ہوئی کہ

الزوائد جلد ۹ صفحہ ۱۶۹۔ مستدرک علی الصحیحین جلد ۳ صفحہ ۷۲۔ مستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۱۴۷۔ سُننِ بیہقی جلد ۲ صفحہ ۱۴۹۔ مشکل الآثار جلد ۱ صفحہ ۳۳۶۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۲۹۸۔ تفسیر طبری جلد ۲۲ صفحہ ۶۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۴۸۵۔ تفسیر درمنثور جلد ۵ صفحہ ۱۹۸۔ خصائصِ نسائی صفحہ ۴۔

"جو واضح دلیلیں تمھارے پاس ہیں، اگر ان کے باوجود کوئی تم سے مباحثہ کرے تو کہو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں اور تم اپنے بیٹوں کو۔ ہم اپنی عورتوں کو لائیں اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے آپ کو لائیں اور تم اپنے آپ کو اور اس کے بعد ہم جھوٹوں پر نفرین کریں اور خُدا سے ان پر لعنت اور عذاب مانگیں۔"

اہلِ نجران کے نمائندوں نے مباہلہ کی تجویز قبول کر لی اور اس پر عملدرآمد کے لیے دوسرا دن مقرر ہو گیا۔ دُوسرے دن مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور نجرانی نمائندے رسولِ اکرمؐ کے گھر سے باہر آنے کے منتظر تھے تاکہ دیکھیں کہ آپ کس انداز سے آتے ہیں اور مباہلہ کے لیے کن لوگوں کو ساتھ لاتے ہیں۔ بالآخر جب آپ باہر آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ آپ نے حسینؑ کو گود میں اُٹھا رکھا ہے اور حسنؑ کا بازو پکڑ رکھا ہے، آپ کی بیٹی فاطمہؑ آپ کے پیچھے پیچھے چل رہی ہیں اور ان کے پیچھے علیؑ آ رہے ہیں۔ ۵۱

رسولِ اکرمؐ نے اپنے گرامی قدر ساتھیوں کو ہدایت کی کہ جب ہم دُعا مانگیں تو آپ لوگ آمین کہیں۔

اِس نورانی گروہ کو دیکھ کر جو سرتاپا حق و صداقت کا مظہر تھا اور جس کی پناہ گاہ خُدائے بزرگ و برتر کے سوا اور کوئی نہ تھی، نجران کے نمائندوں کے

---

۵۱ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۶۰ مطبوعہ عیسٰی حلبی اور جلد ۱۵ صفحہ ۱۷۶ مطبوعہ مصر۔ صحیح ترمذی جلد ۴ صفحہ ۲۹۳ مطبوعہ دارالفکر بیروت۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۸۵ مطبوعہ المیمنیہ، مصر۔ مطالب السئول، ابن طلحہ الشافعی جلد ۱ صفحہ ۱۸ مطبوعہ نجف اور صفحہ ۸ مطبوعہ تہران۔ وغیرہ

دل ہل گئے۔ ان کے سردار نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا:

"خُدا کی قسم! میں ایسی صورتیں دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ خُدا سے دُعا مانگیں تو روئے زمین کے تمام عیسائی ہلاک ہو جائیں۔"

چنانچہ وہ رسولِ اکرمؐ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ انھیں مباہلہ سے معذور رکھا جائے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"پھر تم اسلام قبول کر لو۔"

انھوں نے جواب دیا:

"ہم مسلمانوں سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے لہذا ہم جزیہ دیں گے اور اسلام کی پناہ میں زندگی بسر کریں گے۔"

یوں باہمی اختلاف کا خاتمہ ہوگیا۔

مندرجہ بالا واقعے کا نتیجہ

مُباھلہ کے موقع پر علی، فاطمہ، حسن اور حسین علیہم السلام کے رسول اکرمؐ کے ہمراہ آنے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آیتِ مباہلہ میں اَبْنَآئَنَا - وَنِسَآئَنَا وَاَنْفُسَنَا کا مصداق آنحضرتؐ اور امام علی، بی بی فاطمہ اور حسنین علیہم السلام کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ دُوسرے الفاظ میں جب رسولِ اکرمؐ نے فرمایا "ہم خُود" تو اس سے مراد خود آنحضرتؐ اور امام علیؑ ہیں۔ اور جب فرمایا "ہماری عورتیں" تو اس سے مراد بی بی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہیں اور جب فرمایا "ہمارے بیٹے" تو اس سے مراد حسنین علیہما السلام ہیں۔

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امام علیؑ نفسِ رسولؐ ہیں اور یہ کہ آنحضرتؐ کے اہلِ بیتؑ چار ہی اشخاص

تھے کیونکہ کسی شخص کے اہلِ بیت وہی ہوتے ہیں جن کا تعارف "ہم خود اور ہماری عورتیں اور بیٹے" کہہ کر کرایا جاتا ہے۔ اگر کوئی بھی اہلِ بیت میں شامل ہوتا تو آنحضرتؐ اُسے بھی مباہلہ کے لیے ساتھ لاتے۔

اسی بنا پر ان چار اشخاص کی عصمت کا اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کیونکہ خُدا رسولِ اکرمؐ کے اہلِ بیت کی طہارت اور عصمت کی شہادت دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"اے خاندانِ نبوّت! خدا یقیناً یہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر نجاست کو دُور رکھے اور تمھیں پاک اور پاکیزہ رکھے۔ (سورۂ احزاب۔ آیت ۳۳)

۲ ٭ جیساکہ عام اور خاص سبھی نے نقل کیا ہے، رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ:

"ہمارے اہلِ بیت کشتیٔ نوحؑ کی طرح ہیں جو شخص اس میں سوار ہوگیا اس نے نجات پائی اور جس نے انحراف کیا وہ غرق ہوگیا[1]

۳ ٭ دیگر متواتر احادیث میں عام و خاص سبھی نے رسولِ اکرمؐ سے روایت کی ہیں، آنحضرتؐ نے فرمایا:

"میں تمھارے درمیان دو گراں بہا چیزیں بطور یادگار چھوڑ رہا ہوں وہ دو چیزیں خُدا کی کتاب اور میرے اہلِ بیت ہیں،

---

[1] مُستدرک، حاکم نیشاپوری جلد ۳ صفحہ ۱۵۱ مطبوعہ حیدر آباد۔ ینابیعُ المودّۃ، سلیمان قندوزی حنفی صفحہ ۳۰ اور ۳۷۰ مطبوعہ الحیدریہ اور صفحہ ۲۷ اور ۳۰۸ مطبوعہ استنبول۔ صواعقِ محرقہ، ابن حجر عسقلانی شافعی صفحہ ۱۳۵۔ ۱۸۴ اور ۲۳۴ مطبوعہ المحمدیہ مصر۔ تاریخ الخلفاء جلال الدین سیوطی شافعی۔ اسعافُ الراغبین، صبان شافعی صفحہ ۱۰۹ مطبوعہ السعیدیہ۔

جب تک تم ان دُو اہم یادگاروں سے وابستہ رہو گے اور ان میں پناہ لو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔"[1]

اِمامت

ایک مُلک میں جو حُکومتی نظام تشکیل دیا جاتا ہے اور وہ لوگوں کے عام معاملات کا انتظام کرتا ہے وہ خود کار نہیں ہوتا۔ یعنی جب تک کچھ قابل اور مہارت رکھنے والے لوگ اسے نہ چلائیں اور اس کی نگرانی نہ کریں وہ قائم نہیں رہ سکتا اور لوگوں کو اس سے خاطر خواہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے۔

ہر دُوسرے نظام پر بھی جو انسانی معاشرے میں وجود میں آتا ہے (مثلاً تعلیمی نظام اور مختلف اقتصادی نظام) اسی حکم کا اطلاق ہوتا ہے اور وہ قابل اور دیانتدار کارکنوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ورنہ وہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے معمولی توجّہ سے سمجھا جا سکتا ہے اور تجربہ بھی اس کی صحّت کی تصدیق کرتا ہے۔

---

[1] صحیح ترمذی جلد ۵ صفحہ ۳۲۸ حدیث ۳۸۷۴ مطبوعہ دار الفکر بیروت جلد ۱۳ صفحہ ۱۹۹ مطبوعہ مکتبۃ الصاوی مصر۔ ینابیع المودۃ، قندوزی صفحہ ۳۰ مطبوعہ استنبول۔ کنز العمال جلد ۱ صفحہ ۴۴۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ دار الاحیاء الکتب العربیۃ مصر۔ جامعُ الاصول، ابن اثیر جلد ۱ صفحہ ۱۸۷ حدیث ۶۵ مطبوعہ مصر۔ مشکوٰۃ المصابیح جلد ۳ صفحہ ۲۵۸ مطبوعہ دمشق۔ السیف الیمانی المسلول صفحہ ۱۰ مطبوعہ الترقی دمشق۔ عبقاتُ الانوار جلد ۱ صفحہ ۲۵ مطبوعہ اصفہان۔ ارجح المطالب، عبیداللہ امرتسری صفحہ ۳۳۶ مطبوعہ لاہور۔ وغیرہ

اِس میں کوئی شک نہیں کہ دین اسلام کے نظام پر بھی جسے وسیع ترین آفاقی نظام کہا جاسکتا ہے اسی حکم کا اطلاق ہوتا ہے اور اسے بھی قائم اور جاری رہنے کے لیے نگہداشت کرنے والوں اور چلانے والوں کی ضرورت ہے لہذا ضروری ہے کہ ہمیشہ کچھ ایسے قابل افراد موجود ہوں جو اس کے قوانین اور مَعارف لوگوں تک پہنچائیں، اس کے دقیق قواعد وضوابط کو اسلامی مُعاشرے میں نافذ کریں اور ان پر قرار واقعی عملدرآمد میں کوئی غفلت نہ برتیں۔

اسلامی معاشرے کے دینی اور دُنیاوی اُمور کی نگہداشت اور سرپرستی کو **امامت** کہا جاتا ہے اور سرپرست اور پیشوا کو **امام** کا نام دیا جاتا ہے۔

اہلِ تشیُّع کا عقیدہ ہے کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد ضروری ہے کہ خدا کی جانب سے لوگوں کے لیے ایک امام مقرر کیا جائے جو دین کے احکام اور معارف کی حفاظت اور نگہبانی کرے اور لوگوں کی رہنمائی راہِ حق کی طرف کرے۔

جو شخص اسلامی معارف پر تحقیقی نظر ڈالے اور انصاف پر مبنی فیصلہ کرے وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ امامت اسلام کا ایک مسلمہ اصول ہے اور خدُا نے جن آیات میں اپنے دین کے نظام کا تعارُف کرایا ہے، ان میں اس حقیقت کی وضاحت کردی ہے۔

امامت کی دلیل

جیسا کہ نبوّت کی بحث میں واضح ہوگیا ہے کہ پروردگارِ عالم مخلوقات پر جو عنایت کرتا ہے اور جو توجّہ فرماتا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر پیدا کی گئی چیز کی رہنمائی ایک مقررہ مقصد کی جانب کرے (یہ مقصد کمال کے درجے تک پہنچنا ہے) مثلاً ایک میوہ دار درخت کی رہنمائی نشو نما اور پھُول آنے اور

میوہ دینے کی جانب ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا راستہ ایک پرندے کی زندگی کے راستے سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک پرندہ بھی اپنے مخصوص راستے پر چلتا ہے اور اپنا مقررہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہر پیدا کی گئی چیز کی رہنمائی اس کے لیے مقرر کردہ مقصد اور مخصوص راستا طے کرنے کے علاوہ کسی اور جانب نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ ایک واضح امر ہے کہ انسان بھی خدا کی مخلوقات میں سے ہے اور اس پر بھی ہدایت کے اسی قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ انسان کو باسعادت زندگی اختیار اور ارادے کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خُدا کی جانب سے جو ہدایت انسان کے لیے مخصوص ہے وہ دین اور قانون کی صورت میں پیغمبروں کی دعوت اور تبلیغ کے ذریعے پہنچائی جائے تاکہ پروردگارِ عالم پر انسان کی کوئی حجّت باقی نہ رہے۔ جیسا کہ آیت شریفہ:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ
عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۔ (سورۂ نساء - آیت ۱۶۵)

دلالت کرتی ہے کہ پیغمبروں کی بعثت اور دینی دعوت کے اہتمام کی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جیسے پیغمبر اپنی عصمت کی بدولت دین کی نگہبانی اور لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے، ویسے ہی اس کی رحلت کے بعد خدا ایک ایسے شخص کو اس کی جگہ مقرّر کرے جو (وحی اور نبوّت کے بغیر) بدرجۂ اتم اسی جیسے اوصاف رکھتا ہو تاکہ وہ لوگوں کی رہنمائی کرے اور دین کے احکام اور معارف کی یوں نگہداشت کرے کہ ان میں کسی تحریف کا امکان نہ رہے، ورنہ عام ہدایت کے پروگرام میں خلل پڑ جائے گا اور خدا پر لوگوں کی حجّت تمام ہو جائے گی۔

چونکہ عقل خطا اور لغزش کی مُرتکب ہو سکتی ہے اِس لیے وہ لوگوں کو خُدا

کے فرستادہ پیغمبروں سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ اسی طرح امّت میں علمائے دین کی موجودگی اور ان کی تبلیغات لوگوں کو "امام" سے مستغنی نہیں کرتیں، کیوں کہ جیسا کہ واضح ہوگیا ہے کہ سوال یہ نہیں کہ لوگ دین کی پیروی کرتے ہیں یا نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ خُدا کا دین کسی تبدیلی کے بغیر یا تباہ ہوئے بغیر لوگوں تک پہنچے۔

یہ امر مسلّم ہے کہ امّت کے علماء خواہ کتنے ہی صالح اور پرہیزگار کیوں نہ ہوں وہ غلطی اور گناہ سے پاک نہیں ہیں اور بعض دینی مَعارف اور قوانین کا ان کے ہاتھوں تباہ یا تبدیل ہونا محال نہیں، اگرچہ وہ ایسا جان بُوجھ کر نہ بھی کریں۔ اس بات کا ثبوت وہ مختلف مذاہب اور اختلافات ہیں جو اسلام میں پیدا ہوگئے ہیں۔

پس ہر حالت میں امام کا وجود ضروری ہے تاکہ وہ خُدا کے دین کے حقیقی قوانین اور معارف کی حفاظت کرے اور جب بھی لوگوں میں قابلیت پیدا ہو وہ اس کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

ولایت کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کے اِرشادات

خُداوندِ عالم اسلام کے گرامی قدر پیغمبرؐ کی تعریف میں فرماتا ہے:

"(اے لوگو!) ایک رسولؐ تمھارے پاس آچکا ہے جو تمھیں میں سے ہے، تمھارا تکلیف اٹھانا اس پر شاق ہے، اسے تمھاری بہبود کا خاص خیال ہے وہ مؤمنوں پر حد درجہ شفیق اور مہربان ہے۔" (سورۂ توبہ - آیت ۱۲۸)

یہ بات ہرگز باور نہیں کی جا سکتی کہ رسولِ اکرمؐ جو کتابِ الٰہی کی شہادت

کے مطابق اپنی امّت پر حد درجہ شفیق اور مہربان تھے ، ایک اہم ترین مسئلے پر کہ جس کے واجب ہونے کی عقلِ سلیم بھی گواہی دیتی ہو خاموش بیٹھے رہیں اور اس کے متعلق کچھ نہ کہیں۔

رسولِ اکرمؐ ہر ایک سے زیادہ بہتر جانتے تھے کہ اسلام کا منظّم اور وسیع ادارہ فقط دس بیس سال کے لیے نہیں ہے تاکہ آپ خود ہی اس کی سرپرستی کا فریضہ انجام دیں بلکہ یہ ہمیشہ قائم رہنے والی چیز ہے اور اسے اَبد تک عالمِ انسانیت کا نظام چلانا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی رحلت کے ہزارہا سال بعد تک کے حالات کی پیش بینی کرتے ہوئے وہ ان کے متعلق دینی احکام صادر کرتے تھے۔

آپ جانتے تھے کہ دین ایک اجتماعی ادارہ ہے اور کوئی اجتماعی ادارہ ایک ساعت کے لیے بھی سرپرست کے بغیر نہیں چل سکتا۔ لہذا اس کے لیے ایک ایسے سرپرست کی ضرورت ہے جو اس کے قوانین اور معارف کی نگہبانی کرے، معاشرے کے پہیّے کو گردش میں لائے اور لوگوں کی رہنمائی دنیا اور آخرت کی نیک بختی کی جانب کرے۔ لہذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ اپنی وفات کے بعد کے ایّام کو بھول جائیں اور ان میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کریں ؟

آنحضرتؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جب بھی جنگ یا حج کے سلسلے میں مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے اپنا ایک نمائندہ مقرر کر دیتے تھے، جو شہر مسلمانوں کے قبضے میں آتا اس کا گورنر مقرر کرتے تھے اور جس لشکر کو جنگ کے لیے بھیجتے اس کے سپہ سالار کا تعیّن کر دیتے تھے۔ حتّٰی کہ بعض اوقات فرماتے تھے کہ تمھارا سردار فلاں شخص ہے اور اگر وہ مارا جائے تو فلاں ہے اور اگر وہ بھی مارا جائے تو فلاں ہے۔ آپ کے اس طریقے کو مدِّنظر

رکھتے ہوئے یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ سفرِ آخرت پر روانہ ہونے سے پہلے آپ نے اپنے کسی جانشین کا اعلان نہیں کیا؟

المختصر جو شخص اسلام کے بلند مقاصد اور اس دین کے عالی مرتبت داعی کے پاک ہدف پر غور سے نگاہ ڈالے گا وہ بلاشبہ اس بات کی تصدیق کرے گا کہ مسلمانوں کے امور پر امامت اور ولایت ایک طے شدہ اور واضح چیز ہے۔

پیغمبرؐ کی طرف سے اپنے جانشین کا تقرّر

رسولِ اکرمؐ نے اپنے بعد مسلمانوں کی ولایت اور ان کے اُمور کی سرپرستی کے بارے میں فقط عام بیانات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی دعوت کے پہلے دن سے ہی توحید اور نبوّت کے ساتھ ساتھ ولایت کا مسئلہ بھی واضح طور پر بیان فرمایا اور مسلمانوں کے تمام دینی اور دنیاوی اُمور کے بارے میں امام علیؑ کی ولایت اور جانشینی کا اعلان فرمایا۔

ایک روایت کے مطابق جسے خاص و عام سبھی نے نقل کیا ہے جب پہلے دن آنحضرتؐ کو کھلّم کھلّا دعوت کا حکم دیا گیا تو آپ نے اپنے اعزّہ کو دعوت دی، انھیں ایک مجلس میں جمع کیا اور اس مجلس میں امیرالمؤمنین علیؑ علیہ السلام کی وزارت، وصایت اور خلافت کا واضح طور پہ اعلان کیا اور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی غدیرِ خم کے مقام پر ایک لاکھ بیس ہزار افراد کے سامنے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا:

"مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ۔"[1]

---

[1] صواعقِ محرقہ، ابن حجر عسقلانی شافعی صفحہ ۲۵ مطبوعہ المیمنیہ مصر۔ کنز العمال علی متقی

"جس کا میں ولی اور سرپرست ہوں علیؑ بھی اس کا ولی اور سرپرست ہے"۔

علاوہ ازیں جن اماموں اور پیشواؤں کو امام علیؑ کا جانشین ہونا تھا، آنحضرتؐ نے ان کی تعداد، نام اور دوسری خصوصیات واضح طور پر بیان فرمائیں۔

ایک مشہور روایت کے مطابق جو شیعہ اور سُنّی دونوں نے نقل کی ہے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ

"امام بارہ[12] ہیں اور سب کے سب قریش میں سے ہیں"۔

نیز ایک اور مشہور روایت کے مطابق آپ نے جابر بن عبداللہ انصاری سے فرمایا کہ "امام بارہ اشخاص ہیں"۔ اس کے بعد آپ نے ان میں سے ایک ایک کا نام بتایا اور پھر جابر سے کہا کہ "تم پانچویں امام سے ملو گے، انھیں ہمارا سلام کہنا"۔

ان کے علاوہ رسولِ اکرمؐ نے اپنے جانشین یعنی امیرالمومنین امام علیؑ کو بالخصوص معیّن فرمایا۔ امام علیؑ نے بھی اپنے بعد ہونے والے امام کا تعارف کرایا اور اسی طرح ہر امام نے اپنے جانشین کو متعارف کرایا۔

امام کی عصمت

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پیغمبرؐ کی

ہندی جلد ۱ صفحہ ۱۶۸ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ حیدرآباد ۔ الغدیر، علامہ امینی جلد ۱ صفحہ ۲۶ مطبوعہ بیروت ۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۸۱ مطبوعہ المیمنیہ مصر ۔ انساب الاشراف، احمد بن یحییٰ بلاذری جلد ۲ صفحہ ۲۱۵ مطبوعہ بیروت وغیرہ ۔

طرح امام کا بھی خطا اور گناہ سے پاک ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دینی دعوت ناقص رہ جائے گی اور ہدایتِ الٰہی اپنا اثر کھو بیٹھے گی۔

امام کی اخلاقی فضیلتیں

امام کے لیے ضروری ہے کہ شجاعت، پاکدامنی، سخاوت اور عدالت جیسی اخلاقی خوبیوں کا مالک ہو۔ کیونکہ جو شخص گناہوں سے پاک ہو وہ تمام دینی قوانین پر عمل پیرا ہوگا اور اچھّے اخلاق دین کے لوازمات میں سے ہیں۔

علاوہ ازیں امام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اخلاقی خوبیوں کے معاملے میں وہ باقی سب لوگوں سے بلند تر مقام پر فائز ہو کیونکہ کسی شخص کا اپنے سے بہتر اور برتر شخص کا پیشوا بننا بے معنیٰ بات ہے اور بلاشبہ عدلِ الٰہی کے منافی ہے۔

اِمام کا عِلم

چُونکہ امام، دین کا سرپرست اور اہلِ عالم کا پیشوا ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام مسائل کا علم رکھتا ہو جن سے لوگوں کو دُنیا اور آخرت میں واسطہ پڑتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں جن سے انسان کی نیک بختی وابستہ ہے کیونکہ کسی جاہل کا عقلمندوں کا پیشوا بننا جائز نہیں اور عام خداوندی ہدایت کے نقطہ نگاہ سے اس کے کوئی معنیٰ نہیں۔

۱۴ چودہ معصومؑ

رسولِ اکرمؐ، آنحضرتؐ کی جلیل القدر بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ اور بارہ ۱۲ اماموں

کو چودہ معصوم کہا جاتا ہے اور ان چودہ بزرگواروں میں سے پہلے پانچ یعنی رسولِ اکرمؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ آلِ عبا اور اصحابِ کساء کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں کیونکہ رسولِ اکرمؐ نے ایک دن اپنے سر پر ایک چادر اوڑھی اور باقی چار حضرات کو اپنے ساتھ چادر کے نیچے جمع کیا اور دُعا مانگی تب خُدا نے ان کے حق میں آیتِ تطہیر نازل کی۔

ائمۂ ھدیٰ علیہم السّلام

ائمۂ ہدیٰ جو رسولِ اکرمؐ کے بعد آنحضرت کے جانشین اور لوگوں کے دین اور دنیا کے پیشوا ہیں، وہ یہ بارہ بزرگوار ہیں :

۱	حضرت امام علی	مرتضیٰ	علیہ السلام
۲	حضرت امام حسن	مجتبیٰ	علیہ السلام
۳	حضرت امام حسین	سیّد الشہداء	علیہ السلام
۴	حضرت امام علی	سجّاد	علیہ السلام
۵	حضرت امام محمد	باقر	علیہ السلام
۶	حضرت امام جعفر	صادق	علیہ السلام
۷	حضرت امام موسیٰ	کاظم	علیہ السلام
۸	حضرت امام علی	رضا	علیہ السلام
۹	حضرت امام محمد	تقی	علیہ السلام
۱۰	حضرت امام علی	نقی	علیہ السلام
۱۱	حضرت امام حسن	عسکری	علیہ السلام
۱۲	حضرت امام محمد	مہدی	علیہ السلام

اہلِ بیت علیہم السلام کی عام سیرت

اہلِ بیت علیہم السلام رسولِ اکرمؐ کی تعلیم و تربیت کا کامل نمونہ تھے۔ اور ان کی سیرت ایسی ہی تھی جیسی آنحضرتؐ کی تھی۔

بلاشبہ ۱۱ھ ہجری یعنی رسولِ اکرمؐ کی رحلت کے سال سے لے کر ۲۶۰ھ ہجری یعنی حضرت حجتؑ کی غیبت کے سال تک کی ۲۵۰ سال کی مدّت میں جب کہ ائمۂ ہدیٰ کا میل جول لوگوں کے ساتھ قائم تھا انھیں مختلف حالات سے سابقہ پڑا اور انھوں نے اپنی زندگیاں مختلف شکلوں میں گزاریں۔ لیکن ان کا اصلی ہدف یہ تھا کہ رسولِ اکرمؐ کی روش کو اپناتے ہوئے دین کے اصول اور فروع کو ہر قسم کی تبدیلی سے بچایا جائے اور لوگوں کو تعلیم و تربیت سے بہرور کیا جائے۔ چنانچہ تا حدِّ امکان انھوں نے اس روش کو ترک نہیں کیا۔

رسولِ اکرمؐ نے اپنی دعوت کے ۲۳ سالوں میں زندگی کے تین مرحلے طے کیے کیونکہ آپ بعثت کی ابتدا سے تین سال کی مدت تک لوگوں کو خفیہ طور پر دعوت دیتے رہے۔ اس کے بعد دس سال آپ نے علانیہ دعوت دی لیکن اس دوران میں آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو معاشرے کے ہاتھوں سخت ترین تکالیف اٹھانی پڑیں اس لیے انھیں عمل کی ایسی آزادی نصیب نہیں ہوئی جو معاشرے کی اصلاح میں واضح طور پر موثر ہوتی۔ اس کے بعد کے دس سالوں کے درمیان میں (ہجرت کے بعد) آنحضرتؐ ایک ایسے ماحول میں رہے جس کا تقاضا سچّائی اور حقیقت کو زندہ کرنا تھا۔ اس زمانے میں اسلام روز بروز قابلِ توجّہ ترقی کرتا رہا اور ہر لحظہ علم و دانش اور کمال کے نئے نئے دروازے لوگوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔

یہ بات بلاشبہ واضح ہے کہ اِن تین ادوار میں سے ہرایک کے تقاضے مختلف تھے اور رسولِ اکرمؐ کی سیرت جس کا مقصد حق اور حقیقت کو زندہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوئی۔

وہ مختلف ماحول جو ائمۂ ہدیٰ کے دَور کے ہم زمان تھے، بالعموم رسول اکرمؐ کی ہجرت سے پہلے کی دعوت کے زمانے سے غیر مشابہ نہیں تھے۔ کبھی ان کا زمانہ بعثت کے پہلے تین سالوں سے ملتا جُلتا تھا جب کہ حق کا اظہار ممکن نہ تھا، اور امام اپنا فریضہ نہایت احتیاط سے ادا کرتے تھے مثلاً چوتھے امامؑ کے زمانے میں اور چھٹے امام کے زمانے کے آخری حصے میں حالات کا تقاضا یہی تھا اور بعض اوقات صورتِ حال رسولِ اکرمؐ کی ہجرت سے پیشتر دس سالوں کی دعوت سے مشابہ ہوتی تھی جب آپ لوگوں کو اسلام کی علانیہ دعوت دیتے تھے لیکن کفّار کی سختیوں کی وجہ سے آپ اور آپ کے پیرو آزادی سے کچھ نہیں کرسکتے تھے، امام بھی علوم دین کی تعلیم دیتے تھے اور اسلام کا پیغام پھیلانے کی کوشش کرتے تھے لیکن وقت کے بااختیار لوگ جہاں تک ہوسکتا تھا ان پر سختی کرتے تھے اور نت نئی مشکلات پیدا کرتے تھے۔

بلاشبہ وہ ماحول جو کسی حد تک رسولِ اکرمؐ کی ہجرت کے بعد کے دس سالوں سے مشابہت رکھتا تھا وہ امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام کی خلافت کا پنجسالہ دَور اور حضرت فاطمہؑ اور امام حسنؑ کی زندگی کا تھوڑا سا حصّہ اور امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا بہت ہی مختصر اور چند روزہ زمانہ تھا، جب حق وحقیقت کا جلوہ بغیر کسی حجاب کے نظر آتا تھا اور اس میں ایک آئینے کی طرح آنحضرتؐ کے زمانے کے عام حالات کی جھلک نظر آتی تھی۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ بجز اس دَور کے جس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے

ائمۂ اہلِ بیتؑ کو ہرگز یہ طاقت حاصل نہیں تھی کہ وہ مقتدر حکمرانوں کی علانیہ مخالفت کریں لہٰذا وہ مجبور تھے کہ اپنی گفتار و کردار میں تقیّہ کو اپنائیں اور حکّام کو کوئی بہانہ فراہم نہ کریں، تاہم ان کے دشمن جس طرح بھی بن پڑتا ان کا نام ونشان مٹانے کے لیے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے۔

حکّام سے ائمہؑ کے اختلاف کے اسباب

رسولِ اکرمؐ کی رحلت کے بعد جو حکومتیں وجود میں آئیں اور جنھوں نے اپنا نام "اسلامی حکومت" رکھا، وہ سب کی سب اہلبیتِؑ رسولؐ کے ساتھ عداوت رکھتی تھیں اور اس عداوت کی جڑیں کبھی خشک نہیں ہونے پاتی تھیں۔

یہ درست ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنے اہلِ بیتؑ کے فضائل و مناقب بیان فرمائے تھے جن میں سب سے اہم قرآنی معارف اور حلال و حرام کے بارے میں ان کا علمی امتیاز تھا جس کے نتیجے میں ساری امّت کے لیے ان کی تعظیم و تکریم لازم تھی لیکن امّت نے رسولِ اکرمؐ کی اس وصیّت کا حق ادا نہ کیا۔

یہ بھی درست ہے کہ جب رسولِ اکرمؐ نے پہلے دن علانیہ دعوت دی اور اپنے اعزّا و اقربا کو اسلام کی جانب بلایا تو امام علیؑ کا تعارف اپنے جانشین کے طور پر کرایا، علاوہ ازیں آپ نے مختلف مواقع پر اور خاص طور سے غدیرِخم کے مقام پر واضح طور پر ان کی جانشینی کا ذکر فرمایا تھا لیکن آپ کی رحلت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو آپ کا جانشین چُن لیا اور اہلِ بیتؑ کے مسلمہ حق کو نظرانداز کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر دور کی حکومت اہلِ بیتؑ کو اپنا نمبر ایک رقیب گردانتی رہی، ان سے خوف کھاتی رہی اور انھیں نابود کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتی رہی۔

تاہم اہلبیتؑ اور حکاّم کے درمیان سب سے بڑی وجہ اختلاف یہ تھی کہ اہلبیتؑ حکومت کے لیے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ وہ اسلام کے احکام کے مطابق عمل کرے اور ان کی حفاظت اور اجراء کے لیے اقدام کرے، لیکن آنحضرتؐ کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں وہ ـــ جیساکہ ان کے اقدامات سے ظاہر ہے ـــ اسلام کے احکام کو مکمل طور پر نافذ کرنے اور رسولِ اکرمؐ کی سیرت کی پیروی کرنے کی پابند نہیں تھیں۔

خداوند تعالیٰ اپنے پاک کلام میں کئی جگہ خود رسولِ اکرمؐ کو اور اسی طرح آپؐ کی امّت کو آسمانی احکام میں ردّ و بدل کرنے سے منع کرتا ہے حتّٰی کہ دینی احکام میں سے کسی ایک کی رتّی بھر مخالفت سے بھی خبردار کرتا ہے اور رسولِ اکرمؐ کی سیرت بھی اس بات کی شاہد ہے کہ آپؐ دینی قوانین پر عملدرآمد میں وقت، جگہ اور اشخاص کے لحاظ سے کوئی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔

آسمانی احکام کے مطابق عمل کرنا ہر شخص کے لیے حتّٰی کہ خود رسول اکرمؐ کے لیے بھی واجب تھا یا یوں کہیے کہ احکام شریعت کا اطلاق ہر حالت میں اور ہر ایک پر ہوتا تھا۔

اِسی مساوات اور عدالت کے نتیجے میں لوگوں میں سے ہر قسم کا امتیاز مِٹ گیا تھا۔ خود آنحضرتؐ بھی جو خدا کے حکم سے لوگوں کے فرماں روا تھے اپنی نجی اور قومی زندگی میں دوسروں کے مقابلے میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتے تھے، آپؐ کوئی نمود و نمائش نہیں کرتے تھے اور بحیثیتِ حاکم کسی قسم کے تکلّفات نہیں برتتے تھے۔ آپ دوسروں پر اپنے رُتبے کا رُعب ہرگز نہیں جماتے تھے اور آپؐ کی محفل میں کوئی نووارد آپ کو دُوسروں میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا تھا۔

لوگوں کے مختلف طبقوں میں سے کوئی طبقہ اپنی امتیازی حیثیت کی بنا پر دُوسروں پر فوقیت نہیں جتاتا تھا۔ عورتیں اور مرد، اشراف اور عوام، دولتمند اور غریب، طاقت ور اور کمزور، شہری اور دیہاتی، غلام اور آزاد، سیاہ فام اور سفید فام سب برابر تھے۔ کوئی شخص اپنے دینی فرائض سے بڑھ کر کسی چیز کے لیے ذمّہ دار نہ تھا۔ وہ رئیسوں کے سامنے سرِ تعظیم خم کرنے اور ظالموں کے ظلم کا نشانہ بننے سے محفوظ تھا۔

تھوڑے سے غور و فکر کے بعد یہ چیز ہم پر واضح ہو جاتی ہے (بالخصوص ان طویل تجربوں کے بعد جو رسولِ اکرمؐ کی رحلت کے وقت سے اب تک ہمیں ہوئے ہیں) کہ رسول اکرمؐ اپنی پاک سیرت سے جو واحد مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے وہ یہ تھا کہ اسلامی قوانین عادلانہ طور پر نافذ ہوں اور ہر قسم کی تبدیلی سے محفوظ رہیں لیکن حکّام نے اپنی روش کو آنحضرتؐ کی سیرت سے ہم آہنگ نہ کیا اور ان کی سیرت کے بالکل برعکس طور طریقے اختیار کیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

(۱) تھوڑی سی مدّت میں اسلامی معاشرے میں شدید طبقاتی اختلافات پیدا ہو گئے۔ مسلمان ۲ دو حصّوں یعنی طاقتور گروہ اور کمزور گروہ میں تقسیم ہو گئے۔ پھر ایک گروہ کی جان و مال اور آبرو پر دوسرے گروہ نے دست درازی شروع کر دی۔

(۲) حکومتیں بتدریج اسلامی قوانین کو تبدیل کرنے میں لگ گئیں چنانچہ کبھی مفادِ عامّہ کے نام سے اور کبھی حکومت اور ملکی سیاست کے تحفظ کے بہانے انھوں نے اسلامی احکام پر عمل کرنے اور اسلامی قواعد و ضوابط کو نافذ کرنے سے پہلوتہی کی۔ یہ روش روز بروز وسیع ہوتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حکومت کے اداروں کو

اِسلامی قوانین نافذ کرنے کے بارے میں اپنی ذمّے داری کا کوئی احساس ہی نہ رہا- ظاہر ہے کہ جب سماجی قوانین وضوابط پر صحیح طور پر عملدرآمد نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے!

المختصر اہلبیتؑ کی معاصر حکومتوں نے وقت کی مصلحت کے مطابق اسلام کے احکام اور قوانین میں تصرّف کیا اور اس تصرّف کے نتیجے میں ان کے طور طریقے رسولِ اکرمؐ کی سیرت کے بالکل برعکس ہو گئے لیکن اہلبیتؑ نے قرآن کے حکم کے مطابق آنحضرتؐ کی سیرت کی پیروی کو ہمیشہ لازم سمجھا-

اِسی تضاد اور اختلاف کی بنا پر اہلبیتؑ کی معاصر حکومتوں کو ان پر سختی کرنے اور ظلم ڈھانے میں کوئی باک نہ تھا اور وہ جس طرح بھی ممکن ہوتا تھا، ان کے وجود کو مٹانے میں لگی رہتی تھیں-

گو اہلبیتؑ پر مسلسل سختیاں کی جاتی تھیں لیکن وہ خدا کی طرف سے تفویض کردہ فرض کی ادائیگی میں لگے رہتے تھے اور اسلام کے حقائق ومعارف کی دعوت دینے اور صالح افراد کی تربیت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے-

اِس مطلب کو سمجھنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ہم تاریخ کی طرف رجوع کریں اور امیرالمؤمنینؑ کے پنجسالہ دورِ خلافت میں اہلِ تشیّع کی کثرتِ تعداد کو دیکھیں- بلاشبہ یہ جماعت آپ کی ۲۵ سالہ گوشہ نشینی کے دَور میں تیّار ہوئی تھی اِسی طرح شیعوں کی جو کثیر تعداد امام محمد باقر علیہ السلام کے درِ دولت پر حاضری دیتی تھی، وہ وہی لوگ تھے جنھیں امام سجّاد علیہ السلام نے خاموشی سے تربیت دی تھی اور اسی طرح وہ لاکھوں شیعہ اور دوستدارانِ اہلبیتؑ جو امام رضا علیہ السلام کے گرویدہ تھے وہ ان حقائق کے خوشہ چیں تھے جنھیں امام موسیٰ کاظمؑ

علیہ السلام نے قید خانوں کی تاریک کوٹھڑیوں میں سے بھی دُنیا میں پھیلا دیا تھا۔

آخر کار اہلبیتؑ کی مسلسل تعلیم و تربیت کے نتیجے میں شیعوں کی تعداد جو رسولِ اکرمؐ کی رحلت کے وقت بالکل معمولی تھی ائمہ علیہم السلام کے دَور کے آخری ایّام میں حیرت انگیز حد تک بڑھ گئی۔

اہلِ بیتؑ کی روش میں اِستثناء

جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے، اہلبیتِ رسولؐ نے اپنی زندگی مظلومیت اور محکومیت کے عالم میں گزاری اور اپنی ذمّے داریاں تقیّہ کے ماحول اور سخت مشکل حالات میں پُوری کیں۔ ان بزرگوں میں سے ہم فقط چار کے متعلق دیکھتے ہیں کہ انھوں نے بہت تھوڑا سا وقت آزادانہ اور تقیّہ کے بغیر گزارا۔

ہم یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ **اہلبیتؑ کے حالاتِ زندگی** درج کرتے ہیں:

امام علی علیہ السلام

اِمام علی بن ابیطالب علیہ السلام رسولِ اکرمؐ کی تعلیم و تربیت کا پہلا کامل نمونہ ہیں۔

امام علیؑ نے بچپن سے ہی رسولِ اکرمؐ کے دامنِ عاطفت میں پرورش پائی تھی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری لمحوں تک وہ سائے کی طرح ان کے پیچھے پیچھے رہے اور ان کے وجود کی شمع کے گرد پروانے کی طرح چکر کاٹتے رہے۔ آخری لحظہ کہ جب امام علیؑ آنحضرتؐ سے بچھڑے وہ تھا جب انھوں نے آپؐ

کے پاک جسم کو اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا۔

امام علیؑ کی آفاقی شخصیت کے متعلق یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جتنی بحث اور گفتگو آپ کے بارے میں ہوئی ہے اتنی دنیا کی کسی اور عظیم شخصیت کے بارے میں نہیں کی گئی۔ شیعہ اور سُنّی مسلمانوں اور غیر مسلم اسکالروں اور دانش وروں نے آپ کی شخصیت کے بارے میں ایک ہزار سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔

گو آپ کے دشمنوں نے بھی اور دوستوں نے بھی آپ کے متعلق بہت بحث اور تحقیق کی ہے تاہم کوئی شخص بھی آپ کے ایمان میں کوئی ضعیف نکتہ دریافت نہیں کر پایا اور نہ ہی کسی نے آپ کے علم، تقویٰ، عدالت، شجاعت اور دُوسرے پسندیدہ اخلاق میں کوئی خامی دیکھی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ فضیلت اور کمال کے علاوہ کسی اور چیز سے واقف ہی نہیں تھے اور فضیلت و کمال کے سوا آپ کے کردار میں کوئی اور چیز موجود ہی نہیں تھی۔

تاریخ اِس امر کی گواہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی رحلت سے لے کر اب تک جتنے فرماں روا گزرے ہیں ان میں صرف امام علیؑ ہی وہ شخص ہیں کہ جنھوں نے اسلامی مُعاشرے میں اپنی حکومت کا زمانہ رسولِ اکرمؐ کی سیرت کے مطابق گزارا اور آپؐ کی روش سے سرمو انحراف نہ کیا۔ اسلام کے قوانین پر جس طرح رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں عملدرآمد ہوتا تھا آپ نے بھی ان پر اسی طرح عملدرآمد کیا اور ان میں رتی بھر تصرّف یا مداخلت نہیں کی۔

خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھ افراد پر مشتمل اس مجلسِ شوریٰ میں جو حضرت عمر کے انتقال کے بعد ان کے حکم کے مطابق منعقد کی گئی تھی، طویل بحث کے بعد یہ سوال پیدا ہُوا کہ حضرت علیؑ اور حضرت عثمان میں سے کِسے خلیفہ قرار دیا جائے،

پھر پہلے مرحلے پر خلافت حضرت علیؑ کو پیش کی گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ لوگوں کے ساتھ سابقہ دو خلفاء کی سیرت کے مطابق سلوک کریں گے۔ انھوں نے سیرتِ شیخین پر چلنے کی شرط قبول نہ کی اور فرمایا :

"میں اپنے علم سے آگے قدم نہیں رکھوں گا۔"

اِس کے بعد اسی شرط کے ساتھ خلافت حضرت عثمان کو پیش کی گئی تو انھوں نے یہ شرط قبول کر لی اور خلافت کے حقدار ٹھہرائے گئے حالانکہ خلیفہ بننے کے بعد انھوں نے ایک نئی سیرت اختیار کر لی تھی۔

امام علیؑ نے راہِ حق میں جس جانبازی اور جاں نثاری کا مظاہرہ کیا وہ بے نظیر ہے اور آنحضرتؐ کے صحابہ میں سے کوئی بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اسلام کا یہ سرفروش مجاہد نہ ہوتا تو کُفّار و مشرکین ہجرت کی رات میں اور اس کے بعد بدر، اُحد، خندق، خیبر اور حُنین کی جنگوں میں سے کسی بھی جنگ میں شمعِ رسالت کو آسانی سے بجھا سکتے تھے اور حق کے پرچم کو سرنگوں کر سکتے تھے۔

جب امام علیؑ نے پہلے دن معاشرے کے ماحول میں قدم رکھا تو آپ کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ پھر رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں، ان کی رحلت کے بعد اور اپنی پر عظمت خلافت کے دوران میں بھی آپ غریبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کا مکان، لباس اور کھانا مفلس ترین اشخاص سے بہتر نہیں ہوتا تھا۔ آپ فرماتے تھے :

"ایک مُعاشرے کے حاکم کو اِس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے کہ مفلوکُ الحال لوگوں کی تسلّی کا مُوجب بنے نہ یہ کہ ان کی حسرت اور نااُمیدی میں اِضافے کا سبب بنے۔"

اِس امر کے باوجود کہ آپ پوری اسلامی مملکت کے فرماں روا تھے شہادت کے وقت آپ کے پاس صِرف سات سو درہم تھے جن سے آپ اپنے گھر کے لیے ایک خدمتگار حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اِمام علیؑ اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے خود کام کرتے تھے، کھیتی باڑی آپ کا محبوب مشغلہ تھا، آپ شجرکاری کرتے اور کاریز کھودتے تھے لیکن ان ذرائع سے جو آمدنی ہوتی تھی یا مالِ غنیمت سے جو حصّہ آپ کو مِلتا تھا وہ فقرا، و مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ نیز جس زمین کو آپ آباد کرتے تھے اسے رفاہِ عامّہ کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ اپنی خلافت کے دوران میں ایک سال آپ نے حکم دیا کہ اوقاف کی آمدنی پہلے آپ کے پاس لائی جائے اور پھر خرچ کی جائے۔ جب ساری رقم جمع کی گئی تو وہ چوبیس ہزار طلائی دینار تھی۔

اِمام علیؑ نے جتنی جنگوں میں شرکت کی ان میں، کوئی ایسا شخص آپ کے مقابلے پر نہیں آیا جسے آپ نے زیر نہ کیا ہو۔ آپ نے کسی جنگ میں کبھی کسی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھائی۔ آپ فرماتے تھے :

"اگر سارا عرب میرا مُخالف ہو جائے اور مجھ سے جنگ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو، تب بھی میں اپنے آپ پر بھروسہ کروں گا اور مجھے کوئی خوف نہ ہو گا۔"

اپنی اس شجاعت کے باوجود کہ جس کی قہرمانوں کی تاریخ میں مثال نہیں مِلتی امام علیؑ انتہائی کریم النفس اور سخی تھے۔ جنگوں میں عورتوں، بچّوں اور کمزوروں کو نہ تو قتل کرتے تھے اور نہ ہی قیدی بناتے تھے۔ آپ میدانِ جنگ سے بھاگنے والے دشمنوں کا پیچھا بھی نہیں کرتے تھے۔ جنگِ صفین میں جب معاویہ کی فوج نے سبقت حاصل کر کے فرات کے گھاٹ پر قبضہ کر لیا اور امام

علیؑ کی فوج پر پانی بند کر دیا تو آپ نے ایک بھرپُور حملے کے بعد گھاٹ ان سے چھین لیا اور پھر حکم دیا کہ پانی دشمن کی فوج کے لیے بھی کھول دیا جائے۔

اپنی خلافت کے زمانے میں آپ کسی حاجب یا دربان کے بغیر ہر ایک کو شرفِ باریابی بخشتے تھے۔ تنہا اور پاپیادہ راستا طے کرتے تھے۔ کوچہ و بازار میں گھومتے تھے اور لوگوں کو پرہیزگاری اختیار کرنے کی ہدایت کرتے اور ایک دُوسرے پر ظلم کرنے سے منع کرتے تھے۔

آپ مہربانی اور تواضع کے ساتھ بیکسوں اور بیوہ عورتوں کی مدد فرماتے اور اکثر یتیموں کو اپنے گھر میں رکھ کر ان کی کفالت اور تربیت کرتے تھے۔

امام علیؑ علم و دانش کو خاص اہمیّت دیتے تھے، آپ عُلوم کو نشر کرنے میں بے حد دلچسپی لیتے اور فرمایا کرتے تھے:

"عِلم جیسی کوئی دولت نہیں اور
جہالت جیسی کوئی فلاکت نہیں۔"

جنگِ جمل کے موقع پر جب آپ لشکر کی صفیں دُرست کرنے میں مصروف تھے، ایک اعرابی سامنے آیا اور اس نے توحید کے معنی دریافت کیے۔ سبھی لوگوں نے اُس پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ اس قسم کے سوال کرنے کا کونسا موقع ہے۔ تاہم امامؑ نے لوگوں کو اس کے پاس سے ہٹا دیا اور فرمایا:

"ہم اِنھیں حقائق کو زندہ کرنے کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔"

پھر آپ نے اعرابی کو اپنے پاس بلایا اور صفیں درست کرتے کرتے ایک دلکش بیان کے ذریعے اسے مسئلہ بھی سمجھا دیا۔

ایک ایسا ہی واقعہ جس سے آپ کے دینی نظم وضبط اور آپ کی خُداداد اور حیرت انگیز قوّت کا پتا چلتا ہے، جنگِ صفین کے سِلسلے میں بھی نقل کیا گیا

ہے، ایک ایسے موقع پر جب کہ جنگ زوروں پر تھی آپ اپنے ایک سپاہی کے پاس پہنچے اور اس سے پینے کے لیے پانی طلب فرمایا۔ سپاہی نے لکڑی کا ایک پیالہ نکالا اور پانی سے بھر کر آپ کو پیش کیا۔ آپ نے دیکھا کہ پیالے میں دراڑ آئی ہوئی ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا: "اس قسم کے برتن میں پانی پینا مکروہ ہے۔"

سپاہی نے عرض کیا: "اس وقت جب کہ ہمیں تیروں اور تلواروں کا سامنا ہے اس قدر جانچ پڑتال کا موقع نہیں ہے۔"

اس پر امام علیؑ نے اسے جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

"ہم انھیں دینی قواعد و ضوابط کو جاری کرنے کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں، قواعد و ضوابط کے چھوٹے یا بڑے ہونے کا کوئی سوال نہیں۔"

رسولِ اکرمؐ کے بعد امام علیؑ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے علمی حقائق کے بارے میں فلسفیانہ طرزِ فکر یعنی آزاد استدلال اختیار کیا، بہت سی علمی اصطلاحات وضع کیں اور قرآن مجید کے متن کی حفاظت کے لیے عربی گرامر وضع کی۔ آپ نے جو دقیق علمی و دینی معارف اور اخلاقی، سماجی اور سیاسی، حتّیٰ کہ ریاضی کے مسائل اپنے خطبات، خطوط اور دوسرے فصیح ارشادات میں بیان فرمائے کہ جو دست بدست ہم تک پہنچے ہیں وہ بے حد حیرت انگیز ہیں۔

بلاشبہ امام علیؑ اپنے خطبات، خطوط، کلماتِ قصار اور گراں بہا ارشادات کی بدولت جو انھوں نے بطور یادگار چھوڑے ہیں مسلمانوں میں سب سے زیادہ جانی پہچانی ایک ایسی شخصیت ہیں جنھوں نے قرآن مجید کے بلند مقاصد اور اسلام کے اعتقادی اور عملی معارف کو کماحقّہٗ سمجھا اور رسولِ اکرمؐ کی حدیث:

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں"

کی صحّت کا ثبوت فراہم کیا اور اس علم کو عملی جامہ پہنایا۔

مختصر یہ کہ امام علیؑ جیسی پہلودار شخصیت کی کماحقہ تعریف کرنا ہم انسانوں کے لیے ممکن نہیں۔ ان کے فضائل حدِ شمار سے باہر ہیں۔ تاریخ میں ایسی کوئی اور شخصیت ہرگز نظر نہیں آتی جس کے خیالات و نظریات کی جانب دُنیا کے دانشوروں اور مفکّروں نے اتنی توجّہ دی ہو جتنی آپ کے خیالات و نظریات کی طرف دی ہے۔

بی بی فاطمہ علیہا السّلام

صدیقۂ کبریٰ بی بی فاطمہ زہرا علیہا السلام رسولِ اکرمؐ کی واحد گرامی قدر بیٹی تھیں جنھوں نے اپنی معرفت، ایمان، تقویٰ، ستودہ صفات اور پسندیدہ اخلاق کی بدولت اپنے پدرِ بزرگوار کے پاک دل کو اپنے لیے مہر و محبّت سے لبریز کر دیا تھا۔

اپنی معرفت اور زہد و عبادت کے نتیجے میں بی بی فاطمہ زہرا علیہا السلام نے اپنے عالی مقام والد سے سَیِّدۃُ النِّسَاءِ الْعَالَمِین (دُنیا کی تمام عورتوں کی سردار) کا لقب پایا تھا۔

آنحضرتؐ فرمایا کرتے تھے :

"فاطمہؑ کی خوشنودی میری خوشنودی اور میری خوشنودی خُدا کی خوشنودی ہے۔ فاطمہؑ کا غضب میرا غضب اور میرا غضب خدا کا غضب ہے۔"

بی بی فاطمہ زہرا علیہا السلام بعثت کے چھٹے سال میں بی بی خدیجۃُ الکبریٰ رضی اللہ تعالی عنہا کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ ہجرت کے دُوسرے سال میں آپ کا نکاح امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام سے ہوا۔ آپ اپنے پدرِ بزرگوار کی رحلت کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکیں اور صرف تین ماہ اور چند دن بعد دنیا سے سفر کر گئیں۔

آپ نے اپنی تمام تر زندگی میں خُدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دی اور گھر میں رہ کر بچّوں کی تربیت میں مشغول رہیں۔ آپ نے گھر کا کام اپنی خادمہ کے ساتھ بانٹ رکھا تھا۔ ایک دن خود کام کرتیں اور ایک دن یہ ذمّےداری خادمہ کی ہوتی۔ آپ عورتوں کے مسائل حل کرتیں اور جس وقت فرصت ملتی خُدا کی عبادت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ خود اپنا مال اور بالخصوص فدک (خیبر کے نزدیک واقع چند دیہات) سے جو غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی وہ راہِ خُدا میں خرچ کر دیتی تھیں اور اپنی ضرورت کے اندازے سے زیادہ اپنے پاس کچھ نہیں رکھتی تھیں۔ بعض اوقات اپنے حصّے کا کھانا فقیروں اور محتاجوں کو دے دیتی تھیں اور خود بھُوکی رہتی تھیں۔ اصحابِ رسولؐ کے سامنے دیا گیا مسجدِ نبوی میں آپ کا مفصّل خطبہ، فَدَک کی ضبطی کے موضوع پر خلیفہ ابُوبکر سے بحث اور دُوسرے بیانات جو آپ کی یادگار کے طور پر باقی ہیں وہ آپ کے بلند مقام اور شجاعت و استقامت سے لبریز رُوح کی واضح دلیل ہیں۔

بی بی فاطمہ زَہْرا علیہا السلام رسولِ اکرمؐ کی چہیتی بیٹی، امیر المومنینؑ کی بیوی اور اسلام کے گیارہ اماموں کی ماں ہیں۔ مزید یہ کہ رسولِ اکرمؐ کی اولاد فقط انھیں کی نسل سے ہے۔۵

مریمؑ از یک نسبتِ عیسیٰؑ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز
اقبالؒ

بی بی فاطمہ زہرا علیہا السلام آیتِ تطہیر کی رُو سے مقامِ عصمت پر فائز ہیں۔

امام حسن اور امام حسین علیہما السلام

یہ دونوں بھائی امام علی علیہ السلام اور بی بی فاطمہ زہرا علیہا السلام کے بیٹے ہیں۔ رسولِ اکرمؐ اپنے ان دونوں نواسوں کو اپنے بیٹے کہتے تھے۔ آپؐ نے ان کے متعلق فرمایا ہے:

"میرے یہ دونوں بیٹے امام ہیں خواہ یہ اُٹھ کھڑے ہوں، خواہ بیٹھ جائیں۔"

(کھڑے ہونے سے مراد امام حسینؑ کا جہاد اور بیٹھنے سے مراد امام حسنؑ کی صُلح ہے۔)

رسولِ اکرمؐ نے حسنین علیہما السلام کی شان میں یہ بھی فرمایا ہے:

"حسنؑ اور حسینؑ جوانانِ جنّت کے سردار ہیں۔"

امام حسنؑ کو ان کے والد بزرگوار کی وصیت کے مطابق خلیفہ چُن لیا گیا اور لوگوں نے بھی ان کی بیعت کر لی۔ چھ ماہ تک شام اور مصر کو چھوڑ کر (جن پر معاویہ کا قبضہ تھا) اسلامی ممالک کا انتظام ان کے ہاتھوں میں رہا اور وہ اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔

اِس مدّت میں امام حسنؑ نے معاویہ کا قبضہ ختم کرنے کے لیے فوج تیّار

کی لیکن بالآخر ان پر یہ امر واضح ہوگیا کہ لوگوں کے دِل معاویہ پر فریفتہ ہوگئے ہیں اور خود ان کی فوج کے سردار اس کے ساتھ خط و کتابت کرتے ہیں اور خود انھیں قتل کرنے یا گرفتار کر کے دشمن کے حوالے کرنے کے لیے حاکم شام کے حکم کے منتظر ہیں لہذا مجبوراً آپ نے صلح کی پیشکش قبول کرلی۔

امام حسنؑ نے چند شرائط کے ساتھ معاویہ سے صلح کرلی، لیکن معاویہ اپنے عہد پر قائم نہ رہا۔ معاہدۂ صلح طے پا جانے کے بعد وہ عراق آیا، مسلمانوں کے سامنے منبر پر بیٹھا اور کہنے لگا :

"میں تمھارے خلاف دین کی خاطر نہیں لڑ رہا تھا تاکہ تم نماز پڑھو اور روزے رکھو بلکہ میں تم پر حکومت کرنا چاہتا تھا اور میں نے اپنا مقصد پالیا ہے۔"

پھر اس نے کہا :

"میں نے جو وعدے حسنؑ سے کیے ہیں، انھیں میں اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں۔"

امام حسنؑ نے صُلح کے بعد اپنی زندگی کے تقریباً ساڑھے نو سال بڑے ناگوار حالات میں بسر کیے، ان کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی تھی یہاں تک کہ وہ خود اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ تھے۔ بالآخر معاویہ کی تحریک پر ان کی بیوی (جعدہ بنت اشعث) نے انھیں زہر دے کر شہید کر دیا۔

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد ان کے بھائی امام حسینؑ نے خُدا کے حُکم اور بھائی کی وصیّت کے مطابق امامت کی ذمّہ داریاں سنبھالیں اور لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کا فریضہ انجام دینے لگے۔ تاہم حالات امام حسنؑ کے زمانے جیسے ہی تھے اور معاویہ کا اقتدار اتنا بڑھ گیا تھا کہ امام حسینؑ کے لیے تمام راہیں مسدود

ہوگئی تھیں۔ تقریباً ساڑھے نو سال بعد معاویہ کا انتقال ہوا اور خلافت جو اس وقت ملوکیت میں تبدیل ہو چکی تھی، اس کے بیٹے یزید کو منتقل ہو گئی یزید، معاویہ کے برعکس ایک مغرور نوجوان تھا جو کھلّم کھلّا عیاش اور بدکار تھا۔ اس خودسر نوجوان نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی والیٔ مدینہ کو حکم بھیجا کہ "حسینؑ ابن علیؑ سے ہمارے لیے بیعت طلب کرو یا ان کا سر کاٹ کر ہمارے پاس بھیج دو"۔ جب والیٔ مدینہ ولید نے امام حسینؑ سے بیعت کے لیے کہا تو انھوں نے مہلت مانگی اور پھر رات کو اپنے لوگوں کو ساتھ لے کر مکّہ روانہ ہو گئے۔ وہاں آپ نے حرم کعبہ میں پناہ لے لی جو اسلام میں باضابطہ پناہ گاہ ہے لیکن وہاں چند ماہ قیام کرنے کے بعد آپ سمجھ گئے کہ یزید کسی صورت میں بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور اگر آپ نے بیعت نہ کی تو آپ کا قتل ہو جانا لازمی ہے۔ دُوسری جانب اس دوران میں آپ کو کئی ہزار خطوط عراق سے موصول ہُوئے جن میں آپ کی حمایت کا وعدہ کیا گیا تھا اور آپ کو دعوت دی گئی تھی کہ "آپ بنی امیہّ کے ظالم حکّام کے مقابلے میں اپنی تحریک کا آغاز کریں"۔

عام حالات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے امام حسینؑ جانتے تھے کہ ان کی تحریک ظاہرا طور پر کوئی ترقی نہ کر سکے گی تاہم انھوں نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کرتے ہوئے قتل ہو جانے کا فیصلہ کیا اور اپنے لوگوں کو ساتھ لے کر ظُلم کے خلاف اُٹھے اور مکّہ سے کوفہ روانہ ہُوئے۔ تاہم راستے میں سرزمینِ کربلا میں (جو کوفہ سے تقریباً ۷۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے) اُن کا آمنا سامنا دشمن کے لشکر سے ہُوا۔

امام حسینؑ نے سفر کے دوران لوگوں سے مدد طلب نہ کی اور جو لوگ

آپ کے ہمراہ تھے انھیں بھی اپنے قتل ہوجانے کے قطعی فیصلے سے آگاہ کیا اور انھیں اختیار دے دیا کہ اگر چاہیں تو آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں لہذا جب آپ کا سامنا دشمن کے لشکر سے ہُوا اس وقت مٹھی بھر جاں نثار آپ کے ہمراہ رہ گئے تھے چنانچہ دشمنوں نے بڑی آسانی سے آپ کے گرد گھیرا تنگ کر کے آپ پر اور آپ کے آل و اصحاب پر پانی بھی بند کر دیا۔ اِن حالات میں انھوں نے آپ کو اختیار دیا کہ اگر چاہیں تو یزید کی بیعت کر لیں ورنہ قتل ہونے کو تیار ہو جائیں۔

امام حسین ؑ نے بیعت کرنا منظور نہ کیا اور قتل ہوجانے پر تیار ہو گئے چنانچہ ۱۰ محرم ۶۱ھ ہجری کو آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر صبح سے عصر تک دشمنوں کے خلاف جنگ لڑی اور اس جنگ میں آپ خود، آپ کے بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے اور دُوسرے ساتھی جن کی مجموعی تعداد تقریباً بہتّر تھی، شہید ہو گئے فقط امام سجّاد علیہ السلام زندہ رہے جو بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ کرنے کے قابل نہ تھے۔

دشمن کے لشکر نے آپ کی شہادت کے بعد آپ کا مال و اسباب لوٹ لیا، آپ کے حرم کو قیدی بنا لیا اور انھیں شُہداء کے بُریدہ سروں کے ساتھ کوفہ اور پھر شام لے گئے۔

اس اسیری کے دوران امام سجّاد علیہ السلام نے شام میں ایک خطبہ دیا اور اسی طرح حضرت زینب کبریٰ ؑ نے کوفہ کے بازار میں، ابن زیاد کے دربار میں اور پھر یزید کے دربار میں خطبے دیئے جن کے ذریعے انھوں نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا اور بنی امیہ کی دھاندلی اور زیادتی دُنیا پر واضح کر دی۔

بہرحال ظلم وستم کے مقابلے میں امام حسینؑ کی تحریک جو آپ کا اور آپ کے فرزندوں، قرابت داروں اور ساتھیوں کا خون بہائے جانے، آپ کا مال لوٹے جانے اور آپ کے بچوں اور عورتوں کو قیدی بنائے جانے پر اختتام پذیر ہوئی، اپنی خصوصیات کی بنا پر ایک ایسا منفرد واقعہ ہے جس کی نظیر دنیا کی تحریکوں میں کہیں نہیں ملتی۔ پس بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اس واقعے کی بدولت زندہ ہے اور اگر یہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو بنی امیہ اسلام کا نام ونشان مٹا دیتے ؎

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
(اقبالؒ)

کیا حسنینؑ کی روش ایک دوسرے سے مختلف تھی؟

رسولِ اکرمؐ کی حدیث کے مطابق اگرچہ یہ دونوں بھائی برحق امام ہیں لیکن بظاہر ان کی روش ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتی ہے، حتیٰ کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان دونوں بھائیوں کے نظریات میں اتنا شدید اختلاف تھا کہ ایک نے تو چالیس ہزار سپاہیوں کے ہوتے ہوئے صلح کر لی اور دوسرے نے چالیس ساتھیوں (اقربا کے علاوہ) کے ہمراہ جنگ کی اور اپنے شیر خوار بچے تک کو اس راہ میں قربان کر دیا۔

تاہم اگر غور سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ یہ رائے درست نہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسنؑ نے تقریباً ساڑھے نو سال معاویہ کی حکومت کے دوران بسر کیے اور اس کی علانیہ مخالفت نہیں کی۔ اسی طرح امام حسینؑ نے بھی

اپنے بھائی کی شہادت کے بعد تقریباً ساڑھے نو سال معاویہ کی حکومت میں گزارے اور انھوں نے بھی کوئی تحریک چلانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ لہذا ان دو اماموں کی روش میں ظاہری اختلاف کی وجہ ان کے نظریات میں اختلاف نہیں بلکہ معاویہ اور یزید کی روش کے اختلاف میں ڈھونڈنی چاہیے۔

معاویہ کی روش کی بنیاد بے احتیاطی پر نہیں تھی۔ وہ احکام دین کی کھلم کھلا مخالفت کر کے اُن کا مذاق نہیں اُڑاتا تھا، وہ اپنا تعارُف ایک صحابی، اور کاتبِ وحی کی حیثیت سے کراتا تھا اور اپنی بہن کے واسطے سے (جو کہ رسولِ اکرمؐ کی زوجہ اور امّ المؤمنین تھیں) خالُ المؤمنین کہلاتا تھا، اس پر حضرت عمر کی خاص توجّہ اور عنایت تھی اور عام لوگ دوسرے خلیفہ کے بارے میں کامل اعتماد اور خاص ارادت رکھتے تھے۔

علاوہ ازیں اس نے رسولِ اکرمؐ کے بہت سے صحابہ کو جو لوگوں کی نظروں میں قابلِ تعظیم تھے (مثلاً ابوُہریرہ، عمرو بن عاص، سمرہ بن جندب، بُسر بن ارطات، مغیرہ بن شعبہ، وغیرہ کو) صوبوں کی حکومتوں اور مملکت کے دُوسرے اہم کام سونپ رکھے تھے، یہ لوگ عوام کی رائے اس کے حق میں ہموار کرتے رہتے تھے، لوگوں کے درمیان صحابہ کے فضائل کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی جاتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ وہ جو کام بھی کریں قابلِ معافی ہیں۔ لہذا معاویہ جو کام بھی کرتا تھا اگر وہ تصحیح اور توجیہ کے قابل ہوتا تو وہ تصحیح اور توجیہ انھیں ان صحابہ کے ذریعے حاصل ہو جاتی تھی جو اس کے دست راست تھے۔ بصورتِ دیگر بڑی بڑی رقوم دے کر معترض کا مُنہ بند کر دیا جاتا تھا۔ پھر جہاں یہ ذرائع کارآمد ثابت نہ ہوتے وہاں معاویہ کے انھیں ساتھیوں کے ہاتھوں لاکھوں بے گناہ شیعیانِ علیؑ اور دُوسرے مسلمان حتّٰی کہ رسولِ اکرمؐ کے بہت سے

صحابی بھی قتل ہو گئے۔

مُعاویہ سب کاموں میں اپنے آپ کو حق بجانب ظاہر کرتا تھا۔ وہ بُردباری اور مخصوص ٹھیراؤ کے ساتھ آگے بڑھتا تھا اور خاص نرمی اور ملائمت کے ساتھ لوگوں کی محبّت اور اطاعت حاصل کرتا تھا، جب کبھی کوئی شخص اسے گالی دیتا تھا یا جھگڑا کرتا تھا تب بھی وہ خندہ پیشانی اور کشادہ رُوئی سے پیش آتا تھا اور اس بُنیاد پر اپنی سیاست پر عملدرآمد کرتا تھا۔

ظاہری طور پر امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا احترام کرتا تھا اور انھیں گرانبہا تحفے تحائف بھیجتا تھا۔ دُوسری جانب سے اس نے عام اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص اہلبیتؑ کی منقبت میں کوئی حدیث نقل کرے گا، اُس کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہیں ہوگی اور جو شخص صحابہ کی منقبت میں حدیث نقل کرے گا اُسے اِنعام دیا جائے گا۔

اس نے یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ خطیب منبروں سے امام علیؑ پر سب وشتم کریں اور اس طرح ثوابِ دارین حاصل کریں۔

علاوہ ازیں اس کے حکم کے مطابق جہاں کہیں امام علیؑ کے ہواخواہ ملتے تھے قتل کر دیئے جاتے تھے۔ اس معاملے میں اس قدر زیادتی کی گئی کہ بہت سے لوگ جو درحقیقت امیرالمؤمنینؑ کے دشمن تھے ان سے دوستی کے شبہے میں قتل کر دیے گئے۔

جو کچھ اُوپر کہا گیا، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر امام حسنؑ، معاویہ کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوتے تو اس کا نتیجہ اسلام کو نقصان پہنچنے اور خُود ان کا اور ان کے ساتھیوں کا خون رائیگاں جانے کے علاوہ اور کچھ نہ نکلتا۔ اس صورت میں یہ بات بھی بعید نہیں تھی کہ مُعاویہ امام حسنؑ کو خود ان کے اپنے

ساتھیوں کے ہاتھوں قتل کروا دیتا اور پھر لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنا دامن ان کی عزاداری میں چاک کرتا اور ان کے خُون کا قِصاص اور انتقام شیعوں سے لیتا جیسا کہ ایک دفعہ پہلے بھی حضرت عثمان کے معاملے میں ہو چکا تھا۔

تاہم یزید کی سیاسی روش، اس کے باپ کی روش سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی تھی، وہ ایک خود پسند اور لااُبالی جوان تھا، اس کی منطق زور کے علاوہ اور کچھ نہ تھی اور وہ عوام کے خیالات کو رتّی بھر اہمیت نہیں دیتا تھا اسلام کو پردے کے پیچھے سے جو ضربیں لگائی جا رہی تھیں، یزید نے اپنے مختصر دَورِ حکومت میں انھیں یکایک ظاہر کر دیا اور پردے کو پھاڑ دیا۔

اس نے اپنی حکومت کے پہلے سال میں خاندانِ پیغمبرؐ کو تہ تیغ کیا، دوسرے سال میں مدینہ کو تاراج کیا اور تین دن کے لیے اہلِ مدینہ کی جان و مال اور آبرو کو اپنے سپاہیوں کے لیے مباح قرار دیا اور تیسرے سال میں خانۂ کعبہ کو برباد کیا۔

اِسی بنا پر حسینی تحریک لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئی اور روز بروز اس کا اثر گہرا اور واضح ہوتا گیا۔ یہ تحریک ابتدا میں خونی انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوئی اور آخر کار اس کی بدولت حق کے پرستاروں اور اہلِ بیتؑ کے دوستوں کی ایک بہت بڑی جماعت وجود میں آگئی۔

اِسی بنا پر معاویہ نے یزید کو وصیّت کرتے ہوئے تاکید کی تھی کہ امام حسینؑ کو ان کے حال پر چھوڑ دینا اور ان سے کوئی تعرض نہ کرنا مگر کیا یزید کی سرمستی اور خود پسندی اسے اس بات کی اجازت دے سکتی تھی کہ وہ اپنے نفع نقصان کے درمیان اِمتیاز کر سکے ؟

امام سجاد علیہ السلام

اپنے دورِ امامت میں امام سجّاد علیہ السلام کی روش کو دو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ دونوں حصّے مِل کر دُوسرے اماموں کی عام روش سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

امام سجاد علیہ السلام کربلا کے جانکاہ واقعہ میں اپنے والدِ بزرگوار کے ہمراہ تھے اور حسینی تحریک میں شریک تھے۔ شہادتِ عظمیٰ کے بعد آپ کو قیدی بنا کر کوفہ اور شام لے جایا گیا۔ اسیری کی مدّت میں آپ نے ہرگز تقیّہ نہیں کیا اور بلا خوف و خطر حق و صداقت کا اظہار کیا اور مختلف مواقع کے مناسبِ حال تقاریر اور بیانات کے ذریعے سب خاص و عام پر خاندانِ رسالت کی حقّانیت اور عظمت واضح کی۔ آپ نے امام حسینؑ کی مظلومیت اور بنی امیّہ کے مظالم کو آشکارا کر کے لوگوں کے دلوں میں جذبات و احساسات کا طوفان برپا کر دیا۔ تاہم جب آپ کو قید سے رہائی نصیب ہوئی تو آپ مدینہ واپس تشریف لائے جہاں آپ عبادتِ الٰہی اور حق و حقیقت کے پیروؤں کی تربیت میں مشغول ہو گئے۔

آپ نے عبادت کے دوران جو دعائیں مانگیں وہ اسلامی معارف کا ایک انمول خزانہ ہیں۔ آپ نے اِن دُعاؤں کے ذریعے پروردگارِ عالم سے راز و نیاز کیا ہے۔ آپ کی دعاؤں کا یہ مجموعہ "صحیفۂ سجّادیہ" کے نام سے مشہور ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام

امام محمد باقر علیہ السلام کی امامت کے زمانے میں دینی علوم کی نشر و اشاعت

کے لیے بُنیاد کسی حد تک فراہم ہوگئی تھی کیونکہ بنی اُمیّہ کے دباؤ کے نتیجے میں فقہ اہلِ بیتؑ کے بارے میں احادیث تلف ہوگئی تھیں، درآں حالیکہ احکام کے لیے ہزارہا احادیث ضروری ہیں، لیکن جو احادیث آنحضرتؐ کے صحابہ سے نقل ہوئی تھیں وہ بھی پانچسو سے زیادہ باقی نہیں بچی تھیں۔

اِس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ان ایّام میں کربلا کے جانگداز واقعے کے نتیجے میں اور امام سجّاد علیہ السلام کی ۳۵ سال کی کوششوں کے بعد اہلِ تشیّع کا ایک بڑا گروہ وجود میں آگیا تھا لیکن فقہِ اسلامی کے بارے میں ان لوگوں کے پاس کوئی مواد نہ تھا۔

چُونکہ بنی اُمیّہ کی حکومت داخلی اختلافات اور حکام کی عشرت پسندی اور نالائقی کی وجہ سے کمزور ہوچلی تھی اور روز بروز اس ضعف کے آثار نمایاں ہورہے تھے اِس لیے امام محمد باقر علیہ السلام اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہلِ بیتؑ کے علوم اور اسلامی فقہ کی نشرواشاعت میں منہمک ہوگئے اور اس طرح آپ نے اپنے مکتب سے بہت سے عُلماء معاشرے کو مہیّا کیے۔

اِمام جعفر صادق علیہ السلام

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں اسلامی علوم کی نشرواشاعت کے بہتر مواقع میسّر آئے کیونکہ ایک طرف تو امام محمد باقر علیہ السلام کے احادیث کو نشر کرنے اور ان کے مکتب کے تربیت یافتہ لوگوں کی تبلیغات کے نتیجے میں لوگوں کو اسلامی معارف اور اہلِ بیتؑ کے علوم کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی اور احادیث حاصل کرنے کے لیے ان کی بے تابی بڑھ گئی اور دُوسری طرف بنی امیّہ کی حکومت ختم ہوچکی تھی اور بنی عبّاس کو ابھی مکمّل استحکام حاصل

نہیں ہوا تھا اور چونکہ بنی عباؔس نے بنی اُمیہّ کا تختہ اُلٹنے کے لیے اہلبیتؑ کی مظلومیت اور خونِ حُسینؑ کا سہارا لیا تھا اس لیے وہ اہلِ بیتؑ سے اچھّا برتاؤ کرتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے بہت سے عُلوم کی تعلیم دی۔ علماء اور اسکالر جوق در جوق آپ کے دانشکدے پر حاضر ہوتے اور مختلف عُلوم و فنون کے بارے میں آپ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے مختلف علوم کے لوگوں سے بحثیں کیں، مختلف مذاہب کے علماء سے مناظرے کیے اور اپنے شاگردوں کو مختلف علوم میں تربیت دی۔

آپ نے جو احادیث روایت کیں اور جو عملی بیانات دیے انھیں محفوظ کرنے کے لیے سیکڑوں کتابیں تالیف کی گئیں، جنھیں "اُصول" کہا جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کو اس زمانے کے بے سکون ماحول میں جو تھوڑی بہت فرصت ملی اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ نے ہزاروں شاگردوں کی تربیت کی اور اسلامی علوم کے گرانبہا خزانے بطورِ یادگار چھوڑے جن اشخاص نے آپ کے علم و دانش سے استفادہ کیا ان کی تعداد چار ہزار سے زائد ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ تمام باتوں کو ضبطِ تحریر میں لائیں اور اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں محفوظ کرلیں آپ فرمایا کرتے تھے کہ "ایک زمانہ ایسا آئے گا جب بڑی گڑبڑ ہو گی اور بہت سی کتابیں تلف کر دی جائیں گی اس وقت تمھیں ان کتابوں کی ضرورت پڑے گی اور یہ کتابیں مسلمانوں کا واحد علمی سرمایہ ہوں گی۔" یہی وجہ تھی کہ آپ کے

شاگرد اپنے ساتھ قلم اور دوات لایا کرتے تھے اور اپنے اسباق لکھ لیا کرتے تھے۔ آپ اپنے آرام کے لمحات کے علاوہ ہر وقت اور ہر جگہ لوگوں کو پڑھاتے رہتے تھے اور اپنے علم کا لامحدود خزانہ دوسروں کو منتقل کرتے رہتے تھے۔

المختصر آپ کی گراں قدر علمی خدمات نے جہالت کی دیوار ڈھا دی۔

چونکہ آپ نے دینِ اسلام کی حقیقی بُنیاد از سرِ نو استوار کی، اِس لیے آپ کو "شیعیّت" کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے "شیعہ مذہب" کا نام آپ کے نام پر "جعفری مذہب" پڑ گیا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

جب بنی عبّاس نے بنی امیہ کا تختہ اُلٹ کر خلافت پر قبضہ کر لیا تو وہ بنی فاطمہ کی جانب متوجّہ ہوئے۔ انھوں نے خاندانِ رسالت کو نابود کرنے کے لیے اپنی سی بہت کوششیں کیں اور اس سلسلے میں کئی ایک کی گردنیں مار دیں اور کئی ایک کو زندہ دیواروں میں چُن دیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے گھر کو آگ لگا دی گئی اور انھیں کئی بار عراق طلب کیا گیا۔ اِن حالات میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی زندگی کے آخری دَور میں تقیّہ اور زیادہ شدید ہو گیا۔ چُونکہ آپ کی سخت نگرانی کی جاتی تھی اِس لیے آپ اپنے چند خاص شیعوں کے علاوہ کسی سے نہیں ملتے تھے۔ آخر کار دُوسرے عبّاسی خلیفہ منصور نے آپ کو زہر دلوایا جس کے نتیجے میں آپ کی شہادت واقع ہوئی۔ اس لحاظ سے ساتویں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا دَور مخالفین کی روز افزوں سختیوں کا دور تھا۔

شدید تقیّہ کے باوجود امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اسلامی عُلوم کی نشر و اشاعت

میں مشغول رہے اور آپ نے بہت سی احادیث بیان کیں۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ پانچویں اور چھٹے اماموں کے بعد آپ کی فقہی روایات دوسرے سب اماموں سے زیادہ ہیں۔ شدید تقیہؒ کی بنا پر زیادہ روایات جو آپ سے نقل کی گئی ہیں "عالِم" اور "عبدِ صالح" کے ناموں سے نقل کی گئی ہیں اور آپ کا نام بالصراحت نہیں لیا گیا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے چار عبّاسی خلفاء یعنی منصور، ہادی، مہدی، اور ہارون کا زمانہ دیکھا اور ان سب نے آپ پر سختیاں کیں۔ ہارون رشید کے حکم سے آپ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا اور کئی سال تک ایک قید خانے سے دُوسرے قید خانے میں منتقل کیا جاتا رہا اور بالآخر قید خانے میں ہی آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔

امام علی رضا علیہ السلام

اس دَور کے حالات پر غور کرنے سے ہر صاحبِ نظر شخص پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلبیتؑ کے مُعاصر خلفاء ان پر جتنی سختیاں کرتے تھے اور ان کے شیعوں کو جتنی تکالیف دیتے تھے اسی قدر ان کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا تھا اور ان کا ایمان مضبوط ہوتا جاتا تھا۔

یہ ایک ایسا احساسِ کمتری تھا جو ائمہؑ اہلِ بیتؑ کے ہمعصر خُلفاء کو پریشان رکھتا تھا اور درحقیقت اس نے انھیں بے بس اور حقیر کر دیا تھا۔

ساتواں عبّاسی خلیفہ مامون رشید امام رضا علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ اپنے بھائی کو قتل کر کے خلافت حاصل کرنے کے بعد اُسے خیال آیا کہ وہ اپنے اندرونی رنج اور مسلسل تشویش سے نجات پالے اور سختی اور دباؤ کے علاوہ

دُوسرے طریقوں سے تشیّع کا خاتمہ کر دے۔

اِس مقصد کے حصول کے لیے اس نے جس حکمتِ عملی کا انتخاب کیا وہ یہ تھی کہ امام رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد بنائے تاکہ انھیں کاروبارِ خلافت میں ملوّث کر کے شیعوں کی نگاہوں میں ان کی وقعت گھٹا دے۔ اس صورت میں امامت کے منصب کا امتیاز جو شیعہ مذہب کی اساس ہے باقی نہ رہتا اور اس مذہب کی بنیاد خُود بخود متزلزل ہو جاتی۔

اِس سیاست پر عملدرآمد کر کے اسے ایک اور کامیابی حاصل ہو سکتی تھی، اور وہ یہ کہ بنی عباس کی خلافت کے خلاف بنی فاطمہ کی پے در پے تحریکوں کا قلع قمع ہو جاتا کیونکہ جب بنی فاطمہ دیکھتے کہ خلافت ان کی طرف منتقل ہو رہی ہے تو قدرتی طور پر بغاوتوں سے باز رہتے۔ اِس مقصد کے حصول کے بعد امام رضا علیہ السلام کو ختم کر دینا مامون کے لیے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

مامون نے امام علی رضا علیہ السلام کو پہلے خلافت اور پھر ولی عہدی قبول کرنے کی پیشکش کی۔ اس کے بے حد اصرار اور بالآخر دھمکی کے بعد آپ نے ولی عہدی اس شرط پر قبول کی کہ آپ سرکاری عہدوں پر لوگوں کے تقرر یا معزولی یا سلطنت کے دوسرے کاروبار سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔

اِن حالات میں امام علی رضا علیہ السلام لوگوں کے خیالات کی اصلاح میں مشغول ہو گئے اور جہاں تک ہو سکا دوسرے مذاہب کے علماء سے بحثیں کرتے رہے اور اسلامی معارف کے بارے میں بیش قیمت بیانات دیتے رہے۔ (مامون کو بھی مذہبی بحثوں سے بے حد لگاؤ تھا) اسلامی معارف کے بارے میں آپ کے جو بیانات ہم تک پہنچے ہیں وہ کثرت کے لحاظ سے امیر المومنین علیہ السلام کے بیانات کی مانند ہیں اور ان علوم کے متعلق جو ارشادات دُوسرے

ائمہؑ سے مروی ہیں، یہ ان سے زیادہ ہیں۔

آپ کی برکتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ آپ کے آباؤ اجداد کی بہت سی حدیثیں جو اہلِ تشیّع کے پاس دستیاب تھیں آپ کے سامنے پیش کی گئیں اور آپ نے ان میں سے کئی ایک وضعی احادیث کی نشان دہی کی جو ناپاک ہاتھوں نے اہلِ بیتؑ کی احادیث میں خلط ملط کر دی تھیں۔ چُنانچہ ایسی احادیث متروک ہو گئیں۔

جب امام علی رضا علیہ السلام نے ولی عہدی کے سِلسلے میں مدینہ سے مَرْو کی جانب سفر کیا تو راستے میں، خصوصاً ایران میں، لوگوں میں عجیب جوش و خروش پیدا ہُوا، ہر جگہ سے لوگ زیارت کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ وہ پروانوں کی طرح آپ کے وُجود کی شمع کے گرد چکّر لگاتے اور دینی عُلوم اور احکام سیکھتے۔

لوگوں کی امام علی رضا علیہ السلام سے حد درجہ عقیدت کو دیکھ کر مامون کو اپنی سیاست کے غلط ہونے کا احساس ہُوا اور اس سیاسی شکست کی تلافی کی خاطر اس نے آپ کو زہر دے کر شہید کرا دیا۔ اس کے بعد ایک دفعہ پھر اہلِ بیتؑ اور ان کے شیعوں کے بارے میں خلفاء کی پُرانی روش پر عمل ہونے لگا۔

امام محمد تقی، امام علی نقی اور امام حسن عسکری علیہم السلام

اِن تین ائمہؑ طاہرینؑ کی زندگی کا ماحول ایک دُوسرے سے بہت مشابہ تھا۔ امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد مامون رشید نے آپ کے بیٹے امام محمد تقی علیہ السلام کو بغداد بلوا بھیجا اور کمال مہربانی سے پیش آیا۔

اس نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی اور انھیں بڑے احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔

اگرچہ مامون کا یہ سُلوک بظاہر دوستانہ نظر آتا تھا لیکن درحقیقت وہ امام محمد تقی علیہ السلام کو ہر لحاظ سے اپنی کڑی نگرانی میں رکھنا چاہتا تھا۔

اِسی طرح امام علی نقی اور امام حسن عسکری علیہم السلام کا سامرّہ میں قیام (جو اُن دنوں خلافت کا پایۂ تخت تھا) ایک قسم کی نظر بندی تھی۔

اِن تینوں بزرگواروں کی امامت کی کل مدّت ۵۷ ستاون سال ہے۔ اِس زمانے میں ایران، عراق اور شام میں سکونت پذیر اہلِ تشیع کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی اور ان میں ہزاروں محدّثین موجود تھے۔ اس کے باوجود جو احادیث ان اماموں سے نقل کی گئی ہیں وہ تعداد میں بہت کم ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے عُمریں بھی بہت کم پائیں۔ نویں امام ۲۵ سال کی عمر میں، دسویں امام ۴۰ سال کی عمر میں اور گیارھویں امام ستائیس سال کی عمر میں شہید ہو گئے۔ ان تمام باتوں سے اِس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ان کے دَور میں مخالفین ان کی کڑی نگرانی کرتے تھے جس کے سبب وہ اپنی ذمّے داریاں آزادانہ طور پر پوری نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم دین کے اصول و فروع کے بارے میں اِن تینوں بزرگواروں سے بڑی قیمتی روایات ہم تک پہنچی ہیں۔

امام مہدی علیہ السلام

امام حسن عسکری علیہ السلام کے زمانے میں اربابِ خلافت نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ جس طرح بھی ہو سکا آپ کے جانشین کو مار ڈالیں گے اور یوں امامت کے مسئلے کو اور اس کے نتیجے میں شیعہ مذہب کو ختم کر دیں گے۔ چُنانچہ

دُوسری وجوہات کے علاوہ اس وجہ سے بھی امام حسن عسکری علیہ السلام کی نگرانی کی جاتی تھی۔

اِسی بنا پر امامِ عصر، امام مہدی علیہ السلام کی ولادت مخفی رکھی گئی اور چھ سال کی مدّت تک جب کہ ان کے والد بزرگوار زندہ تھے بجز چند خاص شیعوں کے کِسی نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔

اپنے والد کی شہادت کے بعد آپ نے خُدا کے حکم کے مطابق غیبتِ صغریٰ اختیار فرمائی۔ اِس دوران میں آپ اپنے چار خاص نائبین کے توسط سے جنھیں یکے بعد دیگرے نیابت کا شرف حاصل ہوا، اہلِ تشیّع کے سوالات کے جواب دیتے تھے اور ان کی مشکلات حل کرتے تھے۔

غَیبتِ صغریٰ کے خاتمے پر امام مہدی علیہ السلام نے غَیبتِ کُبریٰ اختیار فرمائی۔ چنانچہ وہ اس وقت تک غائب رہیں گے جب تک ان کے ظہور کے بارے میں حکمِ الٰہی نہیں ہوتا۔ اپنے ظہور کے بعد وہ دُنیا کو جو ظلم وجور سے پُر ہو گی عدل وانصاف سے معمور کر دیں گے۔

امامِ عصر مہدی علیہ السلام کی شخصیّت اور ان کی غَیبت اور ظہور کے بارے میں رسولِ اکرمؐ اور ائمّۂ اہلِ بیتؑ سے بہت سی روایات ہم تک پہنچی ہیں جو شیعہ اور سُنّی محدّثین نے نقل کی ہیں۔ اِسی طرح بہت سے مُمتاز شیعہ حضرات نے آپ کے والدِ بزرگوار کی زندگی میں آپ کی زیارت کی اور ان سے آپ کی امامت کی خوشخبری سُنی۔

علاوہ ازیں نبوّت اور امامت کی بحث میں ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دُنیا کبھی بھی خُدا کے دین اور خُدا کی حُجّت سے خالی نہیں ہوتی۔

پیشوایانِ دین کی روش کا اخلاقی نتیجہ

پیغمبروں اور اماموں کی تاریخ کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ وہ حقیقت پسند اور حق و صداقت کی پیروی کرنے والے اشخاص تھے۔ وہ عالَمِ انسانیت کو حقیقت پسندی اور حق کی پیروی کرنے کی دعوت دیتے تھے اور اس سلسلے میں کسی قربانی سے دریغ نہیں فرماتے تھے۔

دُوسرے الفاظ میں، ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ انسانی معاشرے کی نشوونما صحیح طریقے پر ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ جہالت اور توہّم پرستی سے رہائی پاکر صحیح خیالات اور عقائد سے آراستہ ہوکر حیوانی خُو کی بجائے خالص انسانی خُو اپنائیں، زندگی کے بازار میں انسانیت کا سرمایہ لگائیں اور انسانیت کی بہتری کی خاطر نیک بختی کی نقدی حاصل کریں۔

وہ ایسے لوگ تھے جو فقط اپنی بہتری نہیں چاہتے تھے بلکہ مُعاشرے کی بھلائی کے لیے تگ و دو کرتے تھے۔ وہ اپنی بھلائی (کہ جس کے علاوہ انسان کچھ نہیں چاہتا) اس میں مضمر سمجھتے تھے کہ سب کے خیر خواہ ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ دُوسرے بھی ایسے ہی ہوں۔ ہر شخص جس چیز کو اپنے لیے پسند کرے اسے دُوسروں کے لیے بھی پسند کرے اور جس چیز کو اپنے لیے نہ چاہے اسے دوسروں کے لیے بھی نہ چاہے۔

حق کی پیروی اور انسان کی خیر خواہی کے سلسلے میں ان بزرگواروں نے اپنی جان اور مال نثار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہر اُس بات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جو بدخواہی سے مربوط ہے۔ انھوں نے اپنے مال اور جان کو بچا کر نہیں رکھا۔ وہ خود پسندی اور فرومائیگی سے بیزار تھے، وہ جھوٹ نہیں

بولتے تھے۔ وہ کسی پر تہمت نہیں لگاتے تھے اور دُوسروں کی آبرو اور رُتبے سے تعرض نہیں کرتے تھے۔

اِن صفات کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ انشاء اللہ اَخلاق کے باب میں کیا جائے گا۔

مَعَاد

معاد ان تین اُصولوں میں سے ایک ہے جو دین اسلام کی ضروریات میں سے ہیں۔ ہر انسان اپنی خُداداد فطرت کی بدولت نیکوکاری اور بدکاری میں فرق کا پتا چلا سکتا ہے۔ وہ نیکوکاری کو (خواہ اس کی پیروی نہ بھی کرے) ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جس پر عمل کرنا لازم ہو اور بدکاری کو (اگرچہ وہ اس میں گرفتار ہو) ایک ایسی بُری چیز سمجھتا ہے جس سے اجتناب لازم ہو۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ نیکوکاری اور بدکاری کی بُنیاد اس جزا و سزا پر ہے جو ان کے لیے مقرر ہے۔ نیز اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس دُنیا میں کوئی ایسا دن نہیں کہ جس دن نیکوکاروں اور بدکاروں کو ان کے اچھّے اور بُرے کاموں کا بدلہ مل سکے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے نیکوکار اپنا وقت بے حد پریشانی اور سختی میں گزارتے ہیں اور بہت سے بدکردار عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

لہٰذا اگر انسان کے لیے دوسری دنیا میں کوئی ایسا دن مقرر نہ ہو کہ جس دن اس کے اچھّے اور بُرے اعمال کا اِحتساب کیا جائے اور اُسے اس کا مناسب صِلہ دیا جائے تو پھر یہ خیال (کہ نیکوکاری اچھّی چیز ہے اور اس کا حُصول لازم ہے اور بدکاری بُری چیز ہے اور اس سے پرہیز لازم ہے) انسان کی

فطرت میں پیدا ہی نہ کیا جاتا۔

یہ تصوّر نہیں کرنا چاہیے کہ نیکو کاری جسے انسان اچھّا سمجھتا ہے اس کا صلہ یہ ہے کہ اس کی بدولت معاشرے کے انتظامات برقرار رہتے ہیں، لوگوں کو خوش بختانہ زندگی نصیب ہوتی اور اس کے نتیجے میں اس کے فوائد کا کچھ حصّہ نیکو کار کو بھی ملتا ہے۔ اسی طرح ایک بدکردار شخص اپنی غَلَط روش سے معاشرے میں خلل ڈالتا ہے اور بالآخر اس کا بُرا اثر خود اس پر بھی پڑتا ہے۔

یہ تصوّر اگرچہ محروم اور مستضعف طبقے میں موجود ہے لیکن مراعات یافتہ اعلیٰ طبقہ معاشرے کے امن وامان یا ابتری سے متأثر نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں جس قدر ابتری زیادہ ہوتی ہے اسی قدر ان لوگوں کے حالات میں بہتری آتی ہے۔ چنانچہ ہمارے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں جس کے بل بوتے پر ہم یہ کہہ سکیں کہ ایسے لوگ بھی نیکو کاری کو اچھّا اور بدکاری کو بُرا سمجھتے ہیں۔

یہ بھی تصوّر نہیں کرنا چاہیے کہ یہ لوگ اگرچہ اپنی چند روزہ زندگی میں کامیاب نظر آتے ہیں لیکن آنے والی نسلیں ان کی بدکاری کی وجہ سے ان کا نام نفرت سے لیں گی کیونکہ بعد میں آنے والے انھیں قابلِ نفرت اس وقت قرار دیتے ہیں جب وہ مرچکے ہوتے ہیں اور اس کا ان کی عیش وعشرت کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اِس صورت میں اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انسان نیکو کاری کو اچھّا سمجھے اور اسے حاصل کرے یا بدکاری کو بُرا سمجھے اور اس سے پرہیز کرے اور مذکورہ عقیدے کو اپنائے، کیونکہ اگر آخرت کی زندگی نہ ہو تو یہ عقیدہ اوہام پرستی ہوگا۔

پس ہمیں چاہیے کہ اس پاک اور پائیدار عقیدے سے جو قدرت نے

ہماری فطرت میں رکھ دیا ہے، یہ سمجھ لیں کہ خُدا سب کو مرنے کے بعد زندہ کرے گا اور ان کے اعمال کا حساب کتاب کر کے نیکوکاروں کو ان کے اچھّے کاموں کی جزا دے گا اور بدکاروں کو ان کے بُرے کاموں کی سزا دے گا اور یہ وہ دن ہو گا جسے قیامت کہا جاتا ہے۔

قیامت، مذاہب اور اقوام

وہ تمام مذاہب جو خُدا کی عبادت کی دعوت کے ساتھ انسان کو نیک کام کرنے کا حکم دیتے اور بُرا کام کرنے سے منع کرتے ہیں وہ اس کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے قائل ہیں کیونکہ انھیں اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ نیکوکاری کی قدر و قیمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کا اچھّا بدلہ ملے اور چُونکہ ایسا بدلہ اس دنیا میں پُورے کا پُورا ملتا نظر نہیں آتا اِس لیے وہ لازماً ایک نئی دُنیا میں نئی زندگی کے ساتھ ملے گا۔

علاوہ ازیں جو پُرانے مقبرے دریافت ہُوئے ہیں ان میں ایسے بہت سے آثار دیکھنے میں آئے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ قدیم زمانے کا انسان مَوت کے بعد ایک نئی زندگی پر ایمان رکھتا تھا اور مُردے کی دُوسری دنیا میں آسائش کے لیے اپنے عقیدے کے مطابق کئی ایک رسوم انجام دیتا تھا!

قرآن اور انسان کی دُوسری زندگی

قرآن مجید سیکڑوں آیات میں لوگوں کو موت کے بعد دوسری زندگی کے بارے میں بتاتا ہے اور اس سِلسلے میں ہر قِسم کے شک و شبہ کی نفی کرتا ہے وہ بہت سے مواقع پر لوگوں کی بصیرت میں اضافے کے لیے اور اُن کے اِس

خیال کو رفع کرنے کے لیے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے، انھیں تخلیق کے بارے میں خدا کی قدرت یاد دلاتا ہے اور فرماتا ہے :

"کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اُسے پانی کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے، پھر بھی وہ مخالفت پر اُتر آتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے! وہ ہمارے لیے مثل لاکر کہتا ہے کہ اِن بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ کون زندہ کرے گا؟ (اے رسولؐ!) کہہ دیجیے کہ انھیں وہ زندہ کرے گا جو انھیں پہلے عدم سے وجود میں لایا ہے، جس طرح اس نے انھیں پہلے پیدا کیا ہے اسی طرح دوبارہ بھی انھیں وجود دے سکتا ہے۔"

(سورۂ یٰس - آیت ۷۹)

بعض اوقات وہ لوگوں کو یہ بتا کر کہ دوبارہ زندہ ہونا موسمِ خزاں کی مردنی کے بعد موسمِ بہار میں داخل ہونے کی طرح ہے، ان کو خدا کی قدرت یاد دلاتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے :

"خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم زمین کو ایک مُردے کی طرح بے حس و حرکت دیکھتے ہو اور جُوں ہی خدا مینہ برساتا ہے وہ حرکت میں آکر سرسبز ہو جاتی ہے۔ جو خدا اس مُردہ زمین کو زندہ کرتا ہے وہ مُردوں کو بھی زندہ کرے گا کیونکہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" (سورۂ حٰمٓ سجدہ - آیت ۳۹)

بعض اوقات قرآن مجید عقلی استدلال پیش کرتا ہے اور انسان کی فطرت کو اس حقیقت کے اعتراف کے لیے بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے :

"ہم نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کو

فضول (اور محض دل لگی کے طور پر) پیدا نہیں کیا (کیونکہ اگر ایسا ہو کہ مثلاً انسان وجود میں آئے، چند دن گھومے پھرے اور مرجائے۔ پھر ایک اور انسان اسی طرح پیدا ہو اور مرجائے اور یہ عمل جاری رہے تو دنیا کی تخلیق ایک فضول کام سے زیادہ کچھ نہ ہوگی حالانکہ دانا اور بینا خُدا سے کوئی فضول فعل سرزد نہیں ہوتا)۔ جولوگ دُوسری زندگی کا انکار کرتے ہیں وہ تخلیق کو کارِ عبث سمجھتے ہیں۔ کیا ہم ایمان دار اور نیکوکار لوگوں کو شریر اور بدکردار لوگوں کے برابر قرار دے سکتے ہیں؟ (چُونکہ اس دُنیا میں نیکوکار اور بدکار اپنے اپنے اعمال کا پُورا صِلہ نہیں پاتے، لہذا اگر کوئی دوسری دُنیا نہ ہو کہ جس میں سب کو ان کے اعمال کا صِلہ ملے تو پھر اچھّے، بُرے یہ دونوں گروہ خُدا کے نزدیک برابر ہوں گے اور یہ چیز عدلِ الٰہی کے خلاف ہے)۔"

(سورۂ ص - آیت ۲۷-۲۸)

موت سے قیامت تک

بدن مرتا ہے رُوح نہیں مرتی

اسلام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو رُوح اور بدن کا مرکب ہے۔ انسان کے بدن پر مادّی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے یعنی وہ حجم اور وزن رکھتا ہے، زمان و مکان کے اندر زندگی گزارتا ہے، گرمی اور سردی وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے اور بتدریج بوڑھا ہوجاتا ہے اور آخر کار جیسے خُدا کے حکم سے ایک دن پیدا ہوتا ہے اسی طرح ایک دن تحلیل ہوکر ختم ہوجاتا ہے، لیکن انسان کی رُوح مادّی نہیں ہے اور مادّے کی جو خصوصیات

اُوپر بیان کی گئی ہیں وہ ان میں سے کوئی خصوصیت نہیں رکھتی بلکہ احساس، سوچ، ارادہ، محبّت، کینہ، خوشی، غمی، خوف، امّید اور انھیں جیسی دُوسری رُوحانی صفات کی مالک ہے۔ جس طرح رُوح، مادّے کی مندرجہ بالا خصوصیات نہیں رکھتی اسی طرح رُوحانی صفات بھی ان مادّی خصوصیات سے الگ ہیں بلکہ دل، دماغ اور بدن کے دُوسرے اجزا اپنے بے شمار افعال میں رُوح اور رُوحانی صفات کے تابع ہیں اور بدن کے کسی جزو کو بھی حکم فرمائی کا مرکز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خُدا فرماتا ہے :

"ہم نے پہلی بار انسان کو اس مادّے سے بنایا جو کیچڑ سے لیا گیا تھا۔ اس کے بعد اسے نطفہ قرار دیا جو ایک پُرسکون جگہ میں قرار پاتا ہے، پھر اسے ایک خونی لوتھڑے کی شکل دی۔ اس کے بعد اسے مُضْغَہ (چبائے ہوئے گوشت کی طرح) بنایا اور مُضْغَہ سے ہڈیاں بنائیں اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا (بدن کی شکل ٹھیک ٹھاک کی) اس کے بعد اُسے ایک انوکھی خلقت بخشی۔"

(سورۂ مومنون - آیت ۱۴)

اسلام کے نقطۂ نگاہ سے موت کے معنی

اسلام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق موت کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ انسان نیست و نابود ہوجاتا ہے بلکہ اسلام کی رُو سے موت کے معنیٰ یہ ہیں کہ رُوح جو فنا ہونے والی چیز نہیں ہے، انسان کے بدن سے اپنا تعلّق ختم کرلیتی ہے جس کے نتیجے میں اس کا بدن نابود ہوجاتا ہے اور اس کی رُوح بدن کے بغیر اپنی زندگی جاری رکھتی ہے۔ خُدا فرماتا ہے :

"قیامت کے منکر کہتے ہیں کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر جائیں اور ہمارا بدن مٹی میں مل کر خاک ہو جائے تو ہم پھر سے پیدا ہو جائیں؟ (اے رسولؐ!) جواب میں ان سے کہہ دیجیے کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرّر کیا گیا ہے وہ تمھارے بدنوں سے رُوح کو اس کی تمام خصوصیتوں کے ساتھ نکال لیتا ہے اور بدنوں کے تحلیل ہو جانے سے تم نابود نہیں ہو جاتے۔"

(سورۂ سجدہ ۔ آیت ۱۱)

رسولِ اکرمؐ نے اپنی ایک حدیث میں اس بات کو بڑے دلکش انداز میں یوں بیان کیا ہے:

"تم مرنے کے بعد نابود نہیں ہو جاتے بلکہ ایک گھر سے دُوسرے گھر میں منتقل ہو جاتے ہو۔

عَالمِ برزخ

اسلام کہتا ہے کہ مرنے کے بعد انسان ایک خاص شکل سے زندہ رہتا ہے۔ اگر وہ نیکوکار ہو تو نعمتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے اور اگر بدکار ہو تو سزاؤں میں مبتلا ہوتا ہے اور جب قیامت برپا ہوگی تو سبھی لوگ مکمل حساب کے لیے حاضر کیے جائیں گے۔

وہ دنیا جس میں انسان موت کے بعد قیامت تک رہتا ہے، برزخ کہلاتی ہے۔ خُدا فرماتا ہے:

"موت کے بعد روزِ قیامت تک لوگوں کے لیے برزخ ہے۔"

(سُورۂ مومنون ۔ آیت ۱۰۰)

نیز فرماتا ہے:

"یہ نہ سمجھو کہ جو لوگ خُدا کی راہ میں مارے جائیں وہ مر جاتے ہیں اور نابود ہو جاتے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار سے رزق پاتے ہیں۔" (سورہ آل عمران-آیت ۱۶۹)

اَخلاق

یہ بے شمار وسائلِ زندگی جنھیں ہم ان دنوں انسان کی دسترس میں دیکھتے ہیں، جنھیں حاصل کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی ہم دن رات کوشش کرتے ہیں، یہ پہلے ہی سے اس کے قبضۂ قدرت میں نہ تھے بلکہ بتدریج اس کی کاوشوں سے وجود میں آئے ہیں اور استعمال کے قابل ہوئے ہیں۔

لیکن ہر صورت میں پہلے انسان سے لے کر موجودہ متمدّن انسان تک نوعِ بشر نے کام اور محنت ترک نہیں کی اور اپنی خداداد فطرت کے ساتھ بہتر زندگی گزارنے کے وسائل فراہم کرنے کی سعی جاری رکھی ہے، کیونکہ جب انسان کے وجود کی قوت کام کرنا چھوڑ دے اور اس کے داخلی اور خارجی اعضاء مثلاً آنکھ، کان، منہ، ہاتھ اور پاؤں اور اسی طرح دماغ، دل، پھیپھڑے اور جگر ناکارہ ہوجائیں تو وہ ایک مُردے کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ انسان محض مجبوری کی بنا پر کام نہیں کرتا بلکہ وہ انسان ہونے کی بدولت ہی اپنی گوناگوں سرگرمیوں کا اظہار کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنے

انسانی شعور سے یہ بات سمجھ لیتا ہے کہ جس طریقے سے بھی ممکن ہو، اسے اپنی زندگی کے لیے مسرّت اور کامرانی حاصل کرنی چاہیے، اس لیے وہ کام کاج اور محنت کرتا ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔ یہ صورت بھی اسی بنا پر ہے کہ انسان خواہ کسی ماحول میں اور کسی طریقے سے زندگی بسر کرے یعنی خواہ وہ دینی ہو یا غیر دینی، آئینی ہو یا اِستبدادی اور مدنی ہو یا صحرائی، اپنے لیے کئی ایک تکالیف اور وظائف (وہ کام جن کا زندگی میں انجام دینا ضروری ہے) کا احساس کرتا ہے، جن کا بجالانا انسانیت کی حقیقی آرزوؤں کو پُورا کرتا ہے اور اسے خُوشی، آسودگی اور نیک بختی کی زندگی مہیّا کرتا ہے۔

بلاشبہ یہ تکالیف اور وظائف کہ جو نیک بختی کا واحد راستا ہیں، اُن کی قدر و قیمت جو انسانیت کی قدر و قیمت ہے، اس سے زیادہ گراں بہا سامان کا ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے اور اس کا تبادلہ ہم کسی دُوسری چیز سے نہیں کرتے۔

لہٰذا "وظیفہ شناسی" یعنی اپنے فرض کو پہچاننا اور اسے انجام دینا وہ سب سے زیادہ اہم عملی مسئلہ ہے، جس کا انسان کو اپنی زندگی میں سامنا کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس کی اہمیت خُود انسان کی اہمیت ہے اور جو شخص اپنے مسلّمہ فرائض انجام دینے سے پہلو تہی کرے یا کسی وقت ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرے، وہ اسی اندازے سے انسانیت کے بلند مقام سے نیچے گر جاتا ہے۔ یوں وہ قدرتی طور پر اپنی پستی اور بے مائیگی کا اعتراف کرتا ہے اور جب کبھی وہ ایسی خلاف ورزی کرتا ہے تو مُعاشرے کے جسم کو اور درحقیقت اپنے جسم کو ایک تازہ ضرب لگاتا ہے۔

خُدا اپنے کلام مجید میں فرماتا ہے:

"انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے،

جنھوں نے نیک اور شائستہ کام انجام دیے اور ایک دوسرے کو سچائی اور صبر کی وصیّت کی۔ (سورۂ عصر)

نیز فرماتا ہے:

"لوگوں کے بُرے کاموں کے نتیجے میں ساری دنیا میں فساد اور تباہی ظاہر ہوگئی ہے۔" (سورۂ روم - آیت ۴۱)

فرض کی شناخت میں اختلاف رائے

اپنے فرائض کی اہمیت کو پہچاننا اور انھیں انجام دینا، عالمِ انسانیت کا ایک مسلّمہ اُصول ہے اور کوئی ایسا انسان ہرگز نہیں مل سکتا، جو اپنی انسانی فطرت کے باوصف اس حقیقت کا مُنکر ہو۔

بلاشبہ جب انسانی فرائض انسان کی زندگی اور اس کی نیک بختی سے پُورا پُورا ارتباط رکھتے ہیں اور دین، انسانی زندگی کے بارے میں غیر دینی طور طریقوں سے اختلاف رائے رکھتا ہے تو قدرتی طور پر دینی فرائض دوسرے طریقوں کے فرائض سے مختلف ہوں گے۔

دین اِس بات پر اعتقاد رکھتا ہے کہ انسان کی زندگی ایک لامحدود اور بے پایاں زندگی ہے، جو موت سے ختم نہیں ہوجاتی اور موت کے بعد اس لامحدود زندگی کا سرمایہ وہ پاک اور صحیح عقائد اور پسندیدہ اخلاق اور نیک اعمال ہیں جن کا انسان موت سے پہلے اس دنیا میں حامل ہوتا ہے۔

لہذا جو ذمّے داریاں اور فرائض دین نے فرد اور معاشرے کے لیے مقرر کیے ہیں ان میں دُوسری دُنیا کی جاودانی زندگی کو بھی مدّنظر رکھا ہے۔

دین اپنے قواعد وضوابط، خُداشناسی اور خُداترسی کی روشنی میں وضع کرتا ہے

جس کا واضح نتیجہ مرنے کے بعد قیامت کے دن ظاہر ہو گا۔
غیر دینی مسالک (خواہ وہ کوئی بھی ہوں) فقط اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو مدّنظر رکھتے ہوئے انسان کے لیے ایسے فرائض وضع کرتے ہیں جن کے زیرِ سایہ وہ مادّی زندگی اور جسمانی فوائد سے (جو انسان اور دُوسرے حیوانات میں مشترک ہیں) بہتر طور پر بہرہ مند ہو سکتا ہے اور درحقیقت وہ انسان کے لیے ایک حیوانی زندگی کے ساتھ ایک ایسی منطق ترتیب دیتے ہیں جو چرندوں اور درندوں کے احساسات سے جنم لیتی ہے اور انسان کی حقیقت بینی اور اس کی جاودانی اور رُوحانی زندگی کی طرف کوئی توجّہ نہیں دیتے۔
یہی وجہ ہے (جیسا کہ تجربہ بتاتا ہے) کہ بلند انسانی اخلاق رفتہ رفتہ غیر دینی معاشروں سے ناپید ہو جاتے ہیں اور ان کی اخلاقی گراوٹ روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین کی بنیاد تقلید پر قائم ہے اور اس میں کئی ایک فرائض اور ضوابط کو بلا چون و چرا قبول کرنا ہوتا ہے لیکن انسانی قوانین زمانے کے شعور کا ساتھ دینے کے قابل ہوتے ہیں۔
جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ اس نکتے کو بھول جاتے ہیں کہ جو قوانین اور ضوابط معاشرے میں نافذ ہوتے ہیں، ضروری ہے کہ ان پر بلا چون و چرا عمل درآمد ہو۔ یہ کبھی بھی دیکھنے یا سُننے میں نہیں آیا کہ ایک ملک کے لوگ اپنے ملک میں رائج قوانین کو مناظرے اور علمی بحث و مباحثے کا موضوع بنائیں اور اگر ایک شخص کسی قانون کے مسئلے کو سمجھ نہ پائے تو اسے اس کے مطابق عمل کرنے سے معاف رکھا جائے اور اسے اختیار ہو کہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔
پس اس بارے میں دینی اور غیر دینی طریق کار میں کوئی فرق نہیں ہے۔
بلاشبہ ایک ملک کے طبیعی اور سماجی حالات اور عام طور طریقوں کے مطالعہ

اور تحقیق سے اس کے قوانین کے عام اُصولوں اور کچھ جُزئیات (تمام نہیں) کو سمجھا جاسکتا ہے اور یہ خاصیت دینی قوانین وضوابط کی بھی ہے۔ چنانچہ انسان کی تخلیق اور اس کی فطری ضروریات کے بارے میں واقع بینی اور تحقیق کے ذریعے دین (جو ایک فطری طریقہ ہے) کے عام اصولوں اور ان کی کچھ جزئیات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید اور بہت سی روایات انسان کو عقل سے کام لینے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور بعض احکام کی مصلحت کی طرف مجمل طور پر اشارہ بھی کرتی ہیں۔ نیز رسول اکرمؐ اور ان کے اہلِ بیتِ کرامؑ کی بہت سی روایات احکام کی وجوہات (فلسفۂ احکام) کے بارے میں دستیاب ہیں۔

فرض کا پہچاننا

جیسا کہ کتاب کے آغاز میں کہا گیا ہے کہ اسلام ایک عمومی اور جاودانی، پروگرام ہے جو خدا کی جانب سے انسان کی دونوں جہان کی زندگی کے سلسلے میں خاتم النبیّین حضرت محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے، تاکہ اسے انسانی معاشرے میں نافذ کیا جائے اور یہ انسانیت کی کشتی کو جہالت کے بھنور سے نکال کر ساحلِ نجات پر لگادے۔

چُونکہ دین انسان کی زندگی کا پروگرام ہے، لہذا اس نے ہر وہ چیز کہ جو زندگی سے تعلق رکھتی ہے، اس کے متعلق انسان کا فریضہ معیّن کر دیا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس فریضے کو انجام دے۔

عام طور پر ہماری زندگی کا تعلق تین امور سے ہوتا ہے:

۱ ✱ خُدا سے تعلق ـــ کہ جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اس کا حقِ نعمت

ہر نعمت سے زیادہ بڑا اور اس کے بارے میں فرض شناسی ہر واجب سے زیادہ واجب ہے۔

۲ ٭ خود اپنے آپ سے اور اپنی ذات سے تعلق ۔

۳ ٭ اپنے ہم جنسوں سے تعلق ۔ کیونکہ ہم ان کے ساتھ زندگی گزارنے اور ان کے تعاون اور مدد سے کام کاج کرنے پر مجبور ہیں۔

لہذا قاعدے کے مطابق ہم پر تین قسم کے فرائض عائد ہوتے ہیں، یعنی خدا کی نسبت سے ــــ اپنی نسبت سے ــــ اور ــــ دوسروں کی نسبت سے :۔

اِنسان کا فرض، خدا کی نسبت سے

خُدا شناسی

خُدا کے بارے میں ہمارا فریضہ سب فرائض سے زیادہ اہم ہے، جسے انجام دینے کی کوشش ہمیں پاک دل اور خالص نیّت سے کرنی چاہیے۔ پس انسان کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانے۔ کیونکہ جس طرح خدا کا وُجود ہر پیدا کی گئی چیز کی ہستی کا سرچشمہ اور ہر مظہر کا موجدِ اصلی ہے، اسی طرح اس کے پاک وجود کا عِلم بھی ہر واقع بین آنکھ کو روشنی بخشتا ہے اور اس وجدانی حقیقت سے بے اعتنائی، جہالت، بے بصیرتی اور فرض ناشناسی کو جنم دیتی ہے۔ پس جو شخص خدا کی معرفت حاصل کرنے میں لاپروائی برتے اور اس کے نتیجے میں اپنے ضمیر کے روشن چراغ کو بجھا دے، اس کے لیے حقیقی انسانی نیک بختی کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، جو لوگ خدا کو پہچاننے سے روگردانی کرتے ہیں اور

اس حقیقت کو اپنی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں دیتے ، وہ انسانی روحانیت سے بالکل عاری ہو جاتے ہیں اور ان کی عقل چرنے والے اور چیرنے پھاڑنے والے حیوانات کی عقل سے کچھ بھی زیادہ نہیں ہوتی - خُدا اپنے کلام میں ارشاد فرماتا ہے :

"اُن لوگوں سے مُنہ پھیر لو جو خُدا کی یاد سے مُنہ پھیرتے ہیں اور جن کا دُنیاوی زندگی (یعنی کھانے پینے اور سونے) کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں کیونکہ یہ لوگ کھانے پینے اور سونے کے علاوہ دنیا کی کوئی چیز نہیں جانتے -" (سورۂ نجم - آیت ۲۹)

بلاشبہ اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ انسان کے لیے جو ایک واقع بین ہستی ہے اور استدلال کی قوت رکھتا ہے ، خُدا شناسی ایک ضروری اور فطری چیز ہے - کیونکہ جب وہ اپنے خدا داد شعور کے ساتھ کائنات کے مختلف حصّوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو وہ ان میں خداوندِ عالم کے وُجود اور اس کے علم وقدرت کے آثار کا مشاہدہ کرتا ہے - لہٰذا خُدا شناسی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اپنے لیے خدا شناسی کو وجود میں لائے ، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس واضح حقیقت کو جسے کسی پردے سے ڈھانپنا ممکن نہیں ، بے اعتنائی کی نگاہ سے نہ دیکھے اور اپنے ضمیر کو جو اسے ہر لحظہ خدا کی جانب دعوت دیتا ہے ، مثبت جواب دے اور اس معرفت کی جستجو میں ہر قسم کے شک اور تردّد کو اپنے دِل سے محو کر دے -

خُدا پرستی

خُدا شناسی کے بعد انسان کا دُوسرا فریضہ خدا پرستی ہے کیونکہ خُدا کی پہچان

کے سلسلے میں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ وہ سعادت اور نیک بختی جو ہمارا واحد ہدف ہے وہ اس پروگرام کو نافذ کرنے اور اس پر عمل کرنے میں مضمر ہے جو خُدا نے ہمارے لیے مقرر فرمایا ہے اور اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے۔ پس خدا کے فرمان کی اطاعت اور اس کی بندگی ایک ایسا بے مثل فریضہ ہے جس کے سامنے ہر دُوسرا فریضہ ہیچ ہے۔

خُدا فرماتا ہے:

"تمھارے پروردگار کا حکم یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کو نہ پُوجو اور کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرو۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۲۳)

نیز فرماتا ہے:

"اے لوگو! کیا میں نے تمھیں حُکم نہیں دیا کہ اپنے کُھلے دشمن شیطان کی اطاعت نہ کرو اور فقط میری اطاعت اور بندگی کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔" (سورۂ یٰسٓ۔ آیت ۶۰)

لہذا فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنے بندگی اور محتاجی کے مقام کو پہچانیں اور خدا کی لامحدود عظمت اور کبریائی کو نظر میں رکھیں۔ نیز یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہر جانب سے ہمارا احاطہ کیے ہُوئے ہے، اس کے احکام کی اطاعت کریں ہمارے لیے لازم ہے کہ خُدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور رسولِ اکرمؐ اور ائمہؑ طاہرینؑ کے علاوہ کہ جن کی فرماں برداری کا حکم ہمیں خداوندِ عالم نے دیا ہے، کسی دوسرے کی اطاعت نہ کریں۔

خُدا فرماتا ہے:

"خُدا، رسولؐ اور دینی فرمانرواؤں (ائمہؑ) کی اطاعت کرو۔"

(سورۂ نساء۔ آیت ۵۹)

بلا شبہ خُدا اور پیشوایانِ دین کی اطاعت میں یہ ضروری ہے کہ عملاً ہر اس چیز کا احترام کیا جائے جو خُدا سے منسوب ہو۔ خدا اور پیشوایان دین کے نام ادب سے لینے چاہییں۔ قرآن مجید، خانہ کعبہ، مسجدوں، بزرگانِ دین اور مزارات کا پُورا پُورا احترام کرنا چاہیے۔ جیسا کہ خُداوندِ عالم فرماتا ہے:

"جو شخص خدا کی نشانیوں کی تعظیم اور احترام کرتا ہے وہ اپنی باطنی پرہیزگاری کا اظہار کرتا ہے۔" (سورۂ حج۔ آیت ۳۲)

خُود اپنی نسبت انسان کا فریضہ

انسان اپنی زندگی میں جو راستا بھی اختیار کرے اور جس طریقے پر بھی چلے، درحقیقت وہ اپنی بھلائی اور کامیابی کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ چونکہ کسی چیز کی اچھائی کو پہچاننا خود اس چیز کو پہچاننے کی ایک شاخ ہے، یعنی جب تک ہم اپنے آپ کو نہ پہچانیں ہم اپنی ان حقیقی ضرورتوں کو نہیں پہچان سکتے، جن کے پُورا کرنے میں ہماری بھلائی ہے۔ لہذا انسان کا سب سے لازمی فریضہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو پہچانے، تاکہ اِس وسیلے سے اپنی بھلائی اور نیک بختی کو سمجھ سکے۔ پھر جو وسائل اسے دستیاب ہوں اُن کے ذریعے اپنی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرے اور اپنی بیش قیمت عُمر کو جو اس کا واحد سرمایہ ہے ضائع نہ کر دے۔

رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے:

"جس نے اپنے آپ کو پہچانا اُس نے اپنے خُدا کو پہچان لیا۔"

نیز امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو اپنے آپ کو پہچان لے وہ معرفت کے بلند ترین مقام پر پہنچ جاتا ہے۔"

جب انسان اپنے آپ کو پہچان لے تو وہ اس بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے انسانیت کے جوہر کو عزیز رکھے۔ اس تابناک موتی کو پامال نہ کرے اور اپنی ظاہری اور باطنی حفظانِ صحّت کی کوشش کرے، تاکہ ایک خوشگوار جاودانی زندگی حاصل کر سکے۔

امیرالمؤمنین امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص اپنی عزّت کرتا ہے اس کی نظر میں نفسانی خواہشات پست اور ناچیز ہوتی ہیں۔"

انسان کے وجود نے دو چیزوں یعنی بدن اور رُوح سے تشکیل پائی ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ ان دونوں کی صحّت اور قوّت بحال رکھنے کی کوشش کرے اور اسلام کے دقیق اور مفصل احکام کے مطابق ان میں سے ہر ایک کے حفظانِ صحّت کا خیال رکھے۔

جسمانی حفظانِ صحّت

دینِ اسلام نے متعدد احکام کے ذریعے انسان کی جسمانی صحّت کا خاص اہتمام کر دیا ہے۔ (مثلاً: اس نے خون، مردار اور بعض جانوروں کا گوشت اور زہریلی غذا کھانے اور نشہ آور چیزیں اور ناپاک پانی پینے، بہت زیادہ کھانے اور بدن کو نقصان پہنچانے سے منع کیا ہے) اور کئی ایک ایسے احکام دیے ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کی اس باب میں گنجائش نہیں ہے۔

صفائی

صفائی حفظانِ صحّت کے اہم ترین اُصولوں میں سے ہے۔ اِسی وجہ سے اسے اسلام کے پاک دین میں بے حد اہمّیت دی گئی ہے۔ صفائی کو جتنی اہمیت اسلام میں دی گئی ہے، کسی دُوسرے مذہب میں نہیں دی گئی۔

رسولِ اکرم ؐ نے فرمایا ہے:

"صفائی ایمان کا جُزو ہے۔"

اور یہ بجائے خُود صفائی کی بہت بڑی تعریف ہے۔

حمام اور گرم پانی سے غسل کے بارے میں پیشوایانِ دین نے بار بار تاکید کی ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ایک دن چھوڑ کر ایک دن غُسل کرنا انسان کو فربہ اور صحتمند بناتا ہے۔"

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حمام کیسا عمدہ مکان ہے جو انسان کی میل کچیل دُور کرتا ہے۔"

عام صفائی اور پاکیزگی کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ اسلام بالخصوص ہر ایک چیز کی صفائی کی ہدایت بھی کرتا ہے، مثلاً ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن کاٹنا، سر اور بدن کے فالتو بال مونڈنا، کھانا کھانے سے پہلے اور کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونا، بالوں کو کنگھا کرنا، کُلّی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا گھر میں جھاڑو دینا، راستوں، گلیوں اور درختوں کے نیچے کی جگہوں اور ایسے ہی دُوسرے مقامات کو صاف ستھرا رکھنا۔

اِن ہدایات کے علاوہ اسلام نے ایسی عبادات کا حکم دیا ہے جو دائمی

صفائی اور پاکیزگی سے مربوط ہیں۔ مثلاً بدن اور لباس کو نجاستوں سے پاک کرنا، دن میں پانچ مرتبہ نماز کے لیے وضو کرنا، پھر نماز اور روزے کے لیے کئی قسم کے غسل کرنا اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ وضو اور غسل کے وقت پانی ضرور بدن کے ظاہری حصّے تک پہنچے اور وہ چکنائی اور میل کچیل سے آلودہ نہ ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بدن کی صفائی کو ضمنی طور پر واجب قرار دیا گیا ہے۔

لباس کی صفائی

رسولِ اکرمؐ کی بعثت کے ابتدائی دور میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں سے ایک سورۂ مبارکہ "المدّثر" ہے۔ اس سورہ کی چوتھی آیت میں خدا لباس کے پاکیزہ رکھنے کا حکم دیتا ہے۔

نماز کے موقع پر لباس کی پاکیزگی خاص فقہی معنوں میں واجب ہے لیکن عام طور پر نجاست اور میل کچیل سے پاکیزگی ہر حالت میں مستحب ہے اور ہر معصوم نے اس بارے میں سفارش کی ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"انسان کے لیے ضروری ہے کہ جو لباس وہ پہنے اُسے صاف ستھرا رکھے۔"

امیر المؤمنین امام علیؑ نے فرمایا:

"لباس کا دھونا رنج و غم کو دُور کرتا ہے اور نماز کی قبولیت کا موجب ہے۔"

بدن اور لباس کی صفائی اور پاکیزگی کے علاوہ مُسلمان کے لیے ضروری

ہے کہ وہ خوش لباس ہو اور بہترین وضع کے ساتھ لوگوں سے ملاقات کرے۔
امام علیؑ نے فرمایا :
"نفیس کپڑے پہنو اور اپنے آپ کو بناؤ سنوارو کیونکہ خُدا رعنائی کو پسند کرتا ہے لیکن یہ چیزیں حلال کمائی سے ہونی چاہییں۔"
پھر آپؑ نے اس آیت کی تلاوت کی :
"قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ـــــ (سورۂ اعراف۔آیت ۳۲)
یعنی اے میرے حبیبؐ! پوچھو کہ جو زینتیں خداوندِ عالم نے اپنے بندوں کو مہیّا کی ہیں انھیں کس نے حرام کیا ہے؟"

مَضْمَضَہ اور مِسْواک

اِنسان کا مُنہ جو غذا کو پیٹ میں ڈالنے کا راستہ ہے، وہ غذا کھانے سے آلودہ ہو جاتا ہے اور غذا کے ریزے دانتوں کی جڑوں ،زبان کی سطح اور مُنہ کے دُوسرے حصّوں میں باقی رہ جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر مُنہ کا اندرونی حصّہ آلودہ اور بدبودار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تخمیرات اور کیمیائی عمل اور ردّ عمل کی وجہ سے جو غذا کے ریزوں میں انجام پذیر ہوتے ہیں، زہریلا مواد وجود میں آ جاتا ہے، پھر وہ غذا کے ساتھ مل کر معدے میں پہنچ جاتا ہے۔
علاوہ ازیں جب ایسا شخص کسی محفل میں سانس لیتا ہے تو اس مقام کی فضا خراب ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔
اس بنا پر شرعِ مقدّسِ اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ہر روز اور

بالخصوص وضو سے پہلے ، مسواک کریں یعنی دانت مانجھیں اور صاف پانی سے کلی کر کے اپنا مُنہ آلودگی سے پاک کریں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"اگر سختی اور زحمت کا خوف نہ ہوتا تو میں مسواک کرنا مسلمانوں پر واجب کر دیتا۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"جبرئیل نے ہمیشہ مسواک کی تاکید کی حتیٰ کہ مجھے خیال ہُوا کہ یہ کسی وقت واجب ہو جائے گی۔"

اِستنشاق

سانس لینا انسان کی ضروریاتِ زندگی میں سے ہے، جہاں بہت سے انسان رہتے ہیں وہ علاقے عموماً گرد و غبار اور گندگی سے خالی نہیں ہوتے اور ایسی جگہ پر سانس لینا بلاشبہ انسان کے نظامِ تنفّس کو نقصان پہنچاتا ہے، اس نقصان سے بچاؤ کے لیے خُدا نے انسان کی ناک میں بال اُگا دیے ہیں جو گرد و غبار کو پھیپھڑوں تک پہنچنے سے روکتے ہیں۔ تاہم چُونکہ بعض اوقات گرد و غبار ناک میں جمع ہو جاتا ہے اس لیے ناک کے بال مکمل طور پر اپنا فریضہ ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ لہٰذا شرعِ اسلام نے حکم دیا ہے کہ مسلمان دن میں چند مرتبہ وضو سے پہلے ناک میں پانی ڈالیں اور پاک پانی ناک میں کھینچ کر اپنے سانس لینے کے نظام کی حفاظت کریں۔

روحانی حفظانِ صحّت

(تہذیبِ اخلاق)

انسان اپنی خداداد قوّتِ تمیز کے ساتھ پسندیدہ اخلاق کی قدر و قیمت پہچانتا ہے اور انفرادی اور اجتماعی نقطۂ نگاہ سے اس کی اہمیّت کو سمجھ لیتا ہے، اس بنا پر انسانی معاشرے میں کوئی ایسا فرد نہیں ملتا جو اچھّے اخلاق کی تعریف نہ کرے اور ایسے اخلاق رکھنے والے شخص کو قابل احترام نہ سمجھے۔

انسان پسندیدہ اخلاق کو جو اہمیّت دیتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں اور اسلام نے اخلاق کے بارے میں جو وسیع اور جامع احکام دیئے ہیں وہ بھی سب پر واضح ہیں۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"قسم ہے نفس کی اور اس خُدا کی جس نے اُسے پیدا کیا اور اس کے بعد اسے بُرائیاں اور اچھّائیاں سمجھائیں۔ جو شخص اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرے وہ نجات پانے والا ہے اور جو شخص اپنی تربیت میں کوتاہی کرے وہ نجات سے محروم رہتا ہے"

(سورۂ شمس۔ آیت ۷ تا ۱۰)

امام صادق علیہ السلام نے اِس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ

"خُدا نے انسان پر واضح کر دیا ہے وہ جو کہ اچھّا ہے اور اُسے چاہیے کہ اس پر عمل کرے اور وہ جو کہ بُرا ہے اور اسے چاہیے کہ اُسے ترک کر دے"

عِلم کا حصُول

پسندیدہ رُوحانی صفات میں سے ایک صاحبِ علم ہونا ہے اور جاہل پر عالم کی فوقیت اظہر من الشمس ہے۔

جو چیز انسان کو دُوسرے حیوانات سے ممیّز کرتی ہے وہ عقل کی قوت اور علم کا زیور ہے۔ دُوسرے سبھی حیوانات اپنی مخصوص ساخت کے مطابق جبلّتیں رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کی ضروریات یکساں طور پر ان کے مطابق رفع کرتے ہیں، ان کی زندگی میں ترقی کا ہرگز کوئی امکان نہیں ہوتا اور وہ اپنے اور دوسروں کے لیے کوئی تازہ راہیں نہیں کھول سکتے۔ یہ فقط انسان ہی ہے جو اپنی عقل کی بدولت ہر روز اپنی سابقہ معلومات پر نئی معلومات کا اضافہ کرتا ہے اور طبیعت اور ماورائے طبیعت کے قوانین دریافت کرکے ہر وقت اپنی مادّی اور رُوحانی زندگی کو نئی قیمت اور رونق عطا کرتا ہے بلکہ وہ ماضی پر نظر ڈال کر اپنے اور دوسرے کے مستقبل کے لیے منصوبے تیار کرتا ہے۔

اسلام نے لوگوں کو تمام سماجی نظاموں اور تمام مذاہب سے بڑھ کر علم و دانش حاصل کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اسلام نے ایک مستقل تہذیب کو وجود میں لانے کے لیے ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا واجب قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں رسولِ اکرمؐ اور پیشوایانِ دین کے بہت سے احکام ہم تک پہنچے ہیں۔ جیسا کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے"

اس روایت میں مطلق علم کا ذکر کیا گیا ہے جو علوم کے پُورے سلسلے پر حاوی ہے اور اس میں مرد اور عورت کے لحاظ سے بھی کسی استثناء کا وجود

نہیں۔ پس اس بنا پر اسلام میں علم حاصل کرنا کسی کی طبیعت یا جنس پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ ایک عام فریضہ ہے۔

آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"گہوارے سے قبر تک علم حاصل کرنے کی کوشش کرو۔"

ہر دینی فریضے کی ادائیگی کا ایک خاص وقت ہوتا ہے اور ہر فریضے میں بلوغ شرط ہے یعنی مکلّف کے لیے ضروری ہے کہ وہ بالغ ہو۔ اگر بالغ نہیں ہے تو اس پر اس فعل کا انجام دینا واجب نہیں ہوتا۔ بعض دینی واجبات ایسے بھی ہیں جن سے انسان بڑھاپے اور کمزوری کے عالم میں مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم علم و دانش کا حاصل کرنا انسان کی پیدائش کے دن سے اس کے مرنے کے وقت تک یعنی زندگی کے تمام مرحلوں میں واجب ہے۔ اس اصول کی بنا پر ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تمام عمر میں علم و دانش حاصل کرے اور ہر روز اپنی معلومات میں اضافہ کرے۔ اس حدیث شریف نے اس فریضے کے وقت میں بھی توسیع کر دی ہے اور اس میں عمومیت پیدا کر دی ہے۔

آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ملے۔"

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ:

"علم و دانش وہ سب سے قیمتی چیز ہے جسے مؤمن نے گم کر دیا ہے۔ اگر اسے اس کا سراغ چین (یعنی دُنیا کے دور دراز نقاط) میں بھی ملے تو اسے چاہیے کہ اس کے پیچھے جائے۔"

اس حکم کے مطابق ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ علم حاصل کرے خواہ

اس کے حصول کے لیے اسے دُور دراز کا سفر ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ پس اُسے چاہیے کہ ہر قیمت پر جائے اور اپنے گم شدہ مال کو اپنے قبضے میں لے آئے۔

اسی طرح آپؐ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"علم و حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے، اسے چاہیے کہ اسے جس کے پاس بھی پائے حاصل کرلے۔"

اس معنی میں علم حاصل کرنے کے لیے واحد شرط یہ ہے کہ علم صحیح ہو اور انسانی معاشروں کے لیے مفید ہو۔

اسلام تخلیق کے بھیدوں سے واقفیت حاصل کرنے اور آسمانوں، زمین، انسانی فطرت، اقوام کی تاریخ اور سابقہ قوموں کے آثار (فلسفہ، ریاضی اور طبیعی علوم وغیرہ) کے بارے میں غور و فکر کرنے پر بے حد زور دیتا ہے۔ اسی طرح اخلاقی اور شرعی مسائل (اخلاق اور اسلامی حقوق) اور مختلف اقسام کے ایسے ہنر سیکھنے کی اسلام میں بہت تاکید کی گئی ہے جو انسان کی زندگی کو اُسلوب بخشتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی نظر میں علم کی اس قدر اہمیت تھی کہ جب جنگِ بدر میں کئی ایک کفّار مسلمانوں کے ہاتھوں میں اسیر ہو گئے تو آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ ہر ایک قیدی کو خاصی بڑی رقم لے کر آزاد کر دیا جائے۔ تاہم ان میں سے جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، انھیں زرِ فدیہ کی ادائیگی سے اس شرط پر معاف رکھا گیا کہ ان میں سے ہر ایک دس دس مسلمان نوجوانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔

اِس دنیا میں یہ پہلا موقع تھا کہ تعلیمِ بالغاں کے لیے ایک مکتب قائم کیا گیا اور تاریخِ عالم میں یہ عظیم افتخار مسلمانوں کے نام پر ثبت ہوا۔ یہ امر بھی

قابلِ توجّہ ہے کہ تاریخِ انسانیت میں پہلی اور آخری مرتبہ رسولِ اکرمؐ کے حکم سے تاوانِ جنگ کی بجائے تعلیم دینے کو قبول کرلیا گیا۔ ایسا نہ کبھی پہلے ہوا تھا اور نہ بعد میں ہُوا۔ کسی نے دُنیا میں یہ کبھی نہیں دیکھا تھا کہ ایک سپہ سالار جو جنگ میں فتح حاصل کرلے وہ زرِ فدیہ اور مالِ غنیمت کی بجائے لوگوں کی تعلیم کو قبول کرلے۔

رسولِ اکرمؐ بنفسِ نفیس ان مدرسوں میں تشریف لے جاتے تھے اور جو لوگ پڑھنا لکھنا جانتے تھے انھیں اپنے ہمراہ لے جاتے تھے اور انھیں حکم دیتے تھے کہ طالب علموں کا امتحان لے کر اندازہ لگائیں کہ انھوں نے تعلیم میں کس قدر ترقی کی ہے۔ پھر جس طالب علم کو پڑھائی کے معاملے میں زیادہ محنتی پاتے تھے اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

ایک مورّخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "الشفاء" نامی ایک عورت جس نے زمانۂ جاہلیت میں پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا، آنحضرتؐ کے گھر پر آتی تھی اور ازواجِ رسولؐ کو لکھنا پڑھنا سکھاتی تھی۔ چنانچہ اس بنا پر آپ اس کی قدر کرتے تھے اور اسے اس کام کا شوق دلاتے تھے۔

اسلام کی نگاہ میں طالب علم کی اہمیّت

ہر مقصد کے حصول کی اہمیت اور اس کے لیے کوشش اس مقصد کے اندازے کے مطابق ہوتی ہے۔ چُونکہ ہر انسان اپنی خُداداد فطرت کی بدولت عالمِ انسانیت میں علم و دانش کی اہمیت کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتا ہے، اِس لیے طالبِ علم کی قدر و قیمت بھی ہر چیز سے بڑھ کر ہونی چاہیے۔ چُونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کی بُنیاد فطرت پر ہے اِس لیے وہ بلاشبہ طالبِ علم

کو بلند ترین وقعت دیتا ہے۔

رسولِ اکرمؐ کا ارشاد ہے :

"جو شخص علم حاصل کر رہا ہو وہ خُدا کا محبوب ہوتا ہے۔"

اگرچہ جہاد دین کے ارکان میں سے ہے اور اگر پیغمبر یا امام جنگ کا حکم دے تو مسلمانوں کو بالعموم اس میں شرکت کرنی چاہیے لیکن جو لوگ دینی علوم میں مشغول ہوں وہ اس فریضے سے مستثنیٰ ہیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ علمی مراکز میں علم حاصل کرے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :

"مسلمانوں کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ سب کے سب جہاد کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ہر قوم میں سے ایک گروہ علمی مراکز کی جانب رجوع کرے، وہاں دین کے حقائق سیکھے اور واپسی پر اپنی قوم کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرے۔"

(سورۂ توبہ آیت ۱۲۲)

اُستاد کی اہمیتؒ

اُستاد ایک ایسی گرم اور روشن مشعل ہے جو فضیلت کی روشنی سے قوت حاصل کرتی ہے تاکہ جہالت اور ناخواندگی کو رُوئے زمین سے مٹا دے۔ اُستاد وہ ہستی ہے جس کے ہاتھ سے کور دل اور نادان اشخاص دانا اور بینا بن جاتے ہیں اور علم و دانش کے روشن چراغ کی مدد سے مقدّس وادی اور نیک بختی کی بہشت کی جانب گامزن ہو جاتے ہیں۔

اِسی بنا پر دینِ اسلام میں اُستاد کا احترام لازم اور اس کی اطاعت واجب

ہے۔اِسلام کی نگاہ میں اُستاد انسانی معاشروں کی سب سے زیادہ مقدس اور سربلند ہستی ہے۔ اُستاد کو جو بلند مرتبہ حاصل ہے وہ امام علیؑ کے اس قول سے ظاہر ہے :

"جس شخص نے مجھے ایک حرف پڑھایا اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا۔"

یہ حکیمانہ الفاظ اُستاد کے مرتبے کی بلندی کے سلسلے میں بے حد قیمتی ہیں۔

آپؑ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ :

"انسان تین قسم کے ہوتے ہیں : اوّل، عالمِ ربّانی۔ دوسرے وہ جو اپنی اور دوسروں کی فلاح کے لیے عِلم حاصل کرتے ہیں اور تیسرے وہ جو عقل و دانش سے عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ (یعنی تیسرے گروہ سے تعلق رکھنے والے) ان مکّھیوں کی مانند ہیں جو چوپایوں کے بدن پر بیٹھتی ہیں اور جو ہوا چلتی ہے، اس کے ساتھ اِدھر یا اُدھر چلی جاتی ہیں یا جدھر سے بدبو سُونگھتی ہیں اسی طرف چل دیتی ہیں۔"

عُلماء کا اِحترام

قرآنِ مجید عُلماء کی قدر و منزلت اور عظمت کے بارے میں فرماتا ہے :

"جو لوگ ایمان لائے اور جو عِلم سے بہرہ مند ہوئے خدا اُن کے درجے اور مرتبے بلند کرتا ہے۔" (سورۂ مجادلہ۔ آیت ١٢)

رسولِ اکرمؐ کی نظر میں علماء کی اتنی قدر تھی کہ آپ فرماتے ہیں :

"ایک عالم کی موت کے مقابلے میں ایک قبیلے کی موت زیادہ آسان اور کم نقصان دہ ہے۔"

نیز خداوند تعالیٰ ایک اور آیت میں فرماتا ہے:

"کیا دانا اور نادان برابر ہیں؟ فقط وہی نصیحت قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں۔" (سورۂ زمر۔ آیت ۹)

اس معنیٰ میں عالم اور جاہل کبھی بھی برابر نہیں ہوتے اور ایک عالم اور دانشمند ہر اس شخص پر ذاتی برتری رکھتا ہے جو علم سے بے بہرہ ہو۔ اس آیتِ شریفہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ مجید کی نظر میں علم فقط علمِ دین سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز علم ہے جو انسان کو بصیرت اور روشنی بخشے اور دُنیاوی اور اُخروی اُمور میں اس کی مدد کرے۔

عابدوں اور زاہدوں کے مقابلے میں علماء کی برتری کے سلسلے میں امام محمد باقرؑ سے یوں روایت کی گئی ہے:

"وہ عالم جو اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے وہ ستّر ہزار عابدوں سے افضل اور برتر ہے۔"

پیغمبرِ اسلامؐ کی نظر میں ایک انسان کی شخصیت کا معیار اس کے علم و دانش سے متعین ہوتا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

"لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند شخص وہ ہے جو ہمیشہ دُوسروں کے علم سے استفادہ کر کے اپنے علم میں اضافہ کرے۔ انسان کی قدر علم سے ہے۔ پس جس شخص کا علم زیادہ ہوگا اس کی قدر زیادہ ہوگی اور جس شخص کا علم کم ہوگا اس کی قدر و قیمت بھی کم ہوگی۔"

اُستاد اور شاگرد کے فرائض

قرآنِ مجید علم و دانش کو انسان کی حقیقی زندگی سمجھتا ہے کیونکہ اگر دانش نہ ہو تو انسان میں اور جمادات اور مُردوں میں کوئی فرق نہیں۔

لہذا ایک طالبِ علم کو چاہیے کہ اپنے اُستاد کو زندگی کا خزانہ تصوّر کرے جس سے وہ بتدریج اُصولِ زندگی حاصل کرتا ہے۔ اس بنا پر اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے آپ کو اُستاد کا غلام سمجھے اور اس کے احترام اور تعظیم میں کوتاہی نہ کرے۔ بلکہ اگر وہ تعلیم و تربیت کے دوران غصّے اور سختی کا اظہار کرے، تب بھی اس کے مقابلے میں خود رائی نہ دکھائے۔ نیز اس کے سامنے، اس کی غیر حاضری میں، اس کی زندگی میں اور اس کی موت کے بعد، اس کی عزت اور احترام میں کوئی کمی نہ کرے۔

اسی طرح اُستاد کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو شاگردوں کی زندگی کا ذمّے دار سمجھے اور جب تک انھیں ایک زندہ اور بااِفتخار انسان کے رُتبے تک نہ پہنچا دے تھکن محسوس نہ کرے اور آرام نہ کرے۔ اگر کبھی طالب علم تعلیم و تربیت قبول کرنے میں کوتاہی کریں تو مایوس نہ ہو اور اگر ترقی کریں تو ان کی قدر کرے اور اپنی باتوں اور سُلوک سے شاگردوں کو افسردہ خاطر نہ کرے۔

اسلام کی تعلیمات میں دو اہم شاہکار

مختلف انسانی معاشروں میں جو اجتماعی طور طریقے رائج ہیں، ان کے کچھ پوشیدہ راز ہوتے ہیں، اگر یہ راز عام لوگوں کے عِلم میں آجائیں تو اس سے

معاشرے کے منتظمین کی حکومت اور ان کی نفسانی خواہشات کو زک پہنچتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حقائق کو عوام الناس سے پوشیدہ رکھتے ہیں اور وہ یہ طرزِ عمل اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ بہت سے مسائل اور قواعد وضوابط محض ان کے اپنے دماغ کی اختراع ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ ضوابط عقل سے بعید اور افراد اور معاشرے کے مفاد کے خلاف ہوتے ہیں، اِس لیے وہ لوگ ڈرتے ہیں کہ اگر لوگوں کو حقیقت کا پتا چل گیا تو ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہو جائے گی اور ان کے ذاتی مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اِسی بنا پر عیسائیت کا کلیسا اور دُوسرے مذاہب کے رُوحانی مراکز لوگوں کو آزادانہ طور پر غور وفکر کرنے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ دینی معارف اور مذہبی کتابوں کے مندرجات میں تبدیلی اور ان کی وضاحت کا حق اپنے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔ وہ دُوسرے لوگوں کے لیے یہی ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ ان کا کہا بلا چون وچرا اور بغیر کسی آزادانہ بحث اور تحقیق کے قبول کرلیں۔ یہی وہ رویہ ہے جس نے بہت سے مذاہب کو نقصان پہنچایا ہے اور عیسائیت کا موجودہ طرز عمل اس حقیقت کا گواہ ہے۔

تاہم اسلام چونکہ اپنی حقانیت کے بارے میں اطمینان اور اعتماد رکھتا ہے اور اپنے راستے میں کوئی مبہم اور تاریک نقطہ نہیں دیکھتا، اس لیے تمام دوسرے مذہبی اور غیر مذہبی مسالک کے برعکس اس کا طرزِ عمل یہ ہے:

۱۔ وہ کِسی سچّی بات کو پوشیدہ نہیں رکھتا اور نہ ہی اپنے پیروؤں کو اجازت دیتا ہے کہ وہ حقیقت پر پردہ ڈالیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پاک اور مقدس دین کے قوانین فطرت اور تخلیق کے قوانین کے مطابق وضع کیے گئے ہیں۔ لہٰذا حق اور حقیقت کے نقطۂ نگاہ سے اُس کے کِسی قانون

کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اسلام میں حقائق پر پردہ ڈالنے کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے اور جو لوگ سچائی کو چھپاتے ہیں، خدا اُن پر اپنے کلام میں لعنت بھیجتا ہے اور فرماتا ہے:

"بیشک جو لوگ ہماری ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جنھیں ہم نے نازل کیا ہے، اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ ہم ان کو کتاب توراۃ میں بھی لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور دُوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۹)

۲۔ اسلام اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ وہ حقائق اور معارف کے بارے میں آزادانہ طور پر غور و فکر کریں اور جہاں بھی رتی بھر ابہام پیدا ہو رُک جائیں اور قدم آگے نہ بڑھائیں تاکہ ان کا روشن ایمان ہمیشہ کے لیے شک و شُبہ کی تاریکی سے محفوظ رہے اور اگر شک میں گرفتار ہو جائیں تو مکمل انصاف اور حق جوئی کے ساتھ اسے دُور کرنے کی کوشش کریں اور مسئلے کو آزادانہ طور پر حل کریں۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو چیز واضح نہ ہو اس کی پیروی مت کرو۔" (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۶)

آزادانہ غور و فکر اور اظہارِ حق سے پرہیز

غور و فکر کے ذریعے حقائق کو سمجھنا اور انھیں قبول کرنا انسانیت کے فہم و ادراک کا سب سے قیمتی معمول ہے۔ یہ دُوسرے حیوانات پر انسان کی

برتری کا واحد سبب اور اس کی شرافت اور سربلندی کی بُنیاد ہے۔ چنانچہ انسان دوستی کی حِس اور حقیقت پسندی کی جبلّت ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ دُوسروں کے خیالات کی تقلید کرنے کی بنا پر انسان کی غور و فکر کی آزادی سلب ہو جائے یا حقائق پر پردہ ڈالنے سے اس کی عقل گم ہو جائے اور اس کے نتیجے میں خُدائی خیالات کی فعالیت ختم ہو جائے۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ جب انسان کسی حقیقت کو سمجھنے کی استعداد نہ رکھتا ہو یا دوسرے فریق کی ضد کی وجہ سے حقیقت کی پیش رفت کی امید نہ ہو اور اس کے اظہار سے انسان کی جان، مال یا آبرو کو نقصان پہنچتا ہو تو حقیقت پسندی اور انسان دوستی کی جبلّت اس کے برعکس حکم دیتی ہے، اس وقت وہ حقائق کی پردہ پوشی کو واجب گردانتی ہے تاکہ حقائق کا تقدس اور احترام برقرار رہے اور انسانیت کا نظام گمراہی کے خطرے نیز جان و مال اور آبرو کو لاحق ہونے والے دوسرے خطرات سے محفوظ رہے۔

ائمہ اہل بیت ؑ نے بہت سی روایات میں لوگوں کو بعض ایسے حقائق کے بارے میں غور و فکر کرنے سے بڑی سختی سے منع فرمایا کہ لوگ جن کو سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

خُدا نے اپنے کلام میں دو[2] مواقع پر حقیقت کی پردہ پوشی کو مجازی تقیہ شمار کیا ہے۔ (سورۂ آلِ عمران آیت ۲۸ اور سورۂ نحل آیت ۱۰۶)

نتیجہ

اسلام بعض حالات میں نہ صرف یہ کہ حق و صداقت کو پوشیدہ رکھنے سے منع نہیں کرتا بلکہ اسے ضروری قرار دیتا ہے:

۱ — تقیہ کے موقع پر — یہ وہ مقام ہے جب حق کی پیش رفت کی امّید نہ ہو اور اس کے اظہار سے جان، مال، یا آبرو خطرے میں پڑ جائیں۔

۲ — جب ایک شخص حق کو نہ سمجھ سکتا ہو اور اس کا اظہار اس کی گمراہی کا موجب ہو یا اس حق کی سُبکی اور توہین ہوتی ہو۔

۳ — جب استعداد نہ ہونے کی وجہ سے آزادانہ غور و فکر حق کو اُلٹا کر دکھائے اور گمراہی کا موجب بن جائے۔

اِجتہاد اور تقلید

انسان کو اپنی زندگی میں جو ضروریات پیش آتی ہیں اور انھیں رفع کرنے کے لیے وہ جو کام انجام دیتا ہے وہ اس قدر زیادہ ہیں کہ ایک عام آدمی کا ان میں تخصّص پیدا کرنا اور ان کے بارے میں کافی معلومات بہم پہنچانا تو کجا اس کے لیے ان کے نام گنوانے بھی ممکن نہیں۔

دُوسری طرف چونکہ انسان اپنے کام، اپنی سوچ بچار اور ارادے کے مطابق انجام دیتا ہے اور جب وہ کوئی فیصلہ کرنا چاہیے تو ضروری ہے کہ اس کام کے بارے میں اس کی معلومات کافی ہوں کیونکہ اگر معلومات کافی نہیں ہوں گی تو وہ فیصلہ نہیں کر سکے گا۔ پس یہ لازم ہے کہ جو کام وہ کرنا چاہیے یا تو خود اس میں مہارت رکھتا ہو یا ماہرین سے مشورہ کرے اور جو رائے وہ دیں اس کے مطابق عمل کرے۔ مثلاً ہم اپنی فطرت کے تقاضے کے مطابق بیماری کے علاج کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں اور مکان بنوانے کے لیے انجینئر کی خدمات حاصل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پس بعض بالکل معمولی

چیزوں کو چھوڑ کر ہم اپنی ساری زندگی تقلید میں گزارتے ہیں۔

جو شخص کہے کہ "میں اپنی زندگی میں کسی کی تقلید نہیں کرتا" وہ یا تو جو کچھ کہتا ہے اس کے معنیٰ نہیں سمجھتا، یا کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہے۔ اسلام کہ جس نے اپنی شریعت کی بنیادِ فطرتِ انسانی پر رکھی ہے اُس نے بھی یہی روش اختیار کی ہے۔ اس نے اپنے ماننے والوں کو حُکم دیا ہے کہ وہ دین کے معارف و احکام سیکھیں اور ان معارف کا منبع کتاب وسنّت کے علاوہ اور کچُھ نہیں۔

جیسا کہ ظاہر ہے، دینی معارف کو قرآن وسنت سے حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور سارے مسلمان یہ کام آسانی سے نہیں کرسکتے البتہ مسلمانوں کے ایک گروہ کے لیے یہ کام کرنا ممکن ہے۔

لہذا قدرتی طور پر اس دینی حُکم کے یہ معنیٰ نکلتے ہیں کہ وہ مسلمان جو استدلال کے ذریعے احکام اور معارف کو نہیں سمجھ پاتے، وہ اُن اشخاص سے رجوع کریں جنھوں نے دینی احکام دلائل کے ذریعے سمجھ رکھے ہوں اور پھر ان کی ہدایت کے مطابق اپنے فرائض انجام دیں۔

وہ عالِم جس نے دینی احکام پر استدلال کے ذریعے عُبور حاصل کیا ہو مُجتَہِد کہلاتا ہے اور اس کے عمل کو اِجتِہاد کہتے ہیں۔ جو شخص مجتہد سے مراجعہ کرے اُسے مُقَلِّد اور اس کے مراجعہ کو تقلید کہا جاتا ہے۔

تاہم یہ نکتہ ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ تقلید صرف غیر قطعی فرعی احکام یعنی عبادات، معاملات اور دین کی دوسری عملی باتوں کے سِلسلے میں کی جاتی ہے لیکن اُصولِ دین کے بارے میں جو کہ اعتقادی اُمور ہیں، دُوسروں کی رائے پر بھروسا کر کے تقلید پر ہرگز اکتفا نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جہاںتک

اُصولِ دین کا تعلق ہے، ان میں سوال عمل کا نہیں بلکہ ایمان کا ہے اور دوسروں کے ایمان کو خود اپنا ایمان فرض کرلینا ممکن نہیں ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خُدا ایک ہے کیونکہ ہمارے باپ دادا اور عُلماء یہی کہتے ہیں یا یہ کہ موت کے بعد زندگی ایک حقیقی چیز ہے کیونکہ تمام مُسلمان اس پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

لہٰذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اصولِ دین کو استدلال کے ذریعے مانے خواہ سادہ طور پر ہی کیوں نہ ہو۔

وَالِدَین کی نسبت اِنسان کا فریضہ

ماں باپ اپنے فرزند کی پیدائش اور اس کی ابتدائی تربیت کا ذریعہ ہیں۔ اسی بنا پر اسلام میں ان کی اطاعت اور احترام کی بے حد تاکید کی گئی ہے حتّٰی کہ خدا اپنے کلام میں توحید کا ذکر کرنے کے بعد والدین کے ساتھ نیکی سے پیش آنے کا حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"تمھارے پروردِگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو"۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۲۳)

جن احادیث میں گُناہانِ کبیرہ کا ذکر کیا گیا ہے ان میں شرک کے بعد وَالِدَین سے بدسُلوکی کا نمبر آتا ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا آیت کے بعد خداوندِ عالم فرماتا ہے:

اگر تمھارے ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچیں تو اُن سے کوئی تلخ بات نہ کہو، ان پر

آوازہ نہ کسو، ان کے ساتھ ادب سے بات کرو، مہربانی سے پیش آؤ اور کہو: "اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جیسے کہ انھوں نے میرے بچپنے میں میری تربیت کی تھی۔"

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۲۴)

اسلام میں والدین کی اطاعت واجب ہے بجز اس کے کہ وہ کسی واجب کو ترک کرنے یا کسی حرام کام کو انجام دینے کو کہیں اور تجربے سے یہ بات ثابت ہے کہ جو لوگ اپنے ماں باپ کو رنجیدہ کرتے ہیں وہ زندگی میں نیک بختی اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھتے اور بالآخر فلاح سے محروم رہتے ہیں۔

والدین کی نافرمانی

ایک گھرانے میں ماں باپ کی فرزندوں سے وہی نسبت ہوتی ہے جو ایک درخت کی جڑ کی شاخوں سے ہوتی ہے۔ جس طرح ایک درخت کی شاخوں کی نسل اور وجود اس کی جڑ سے وابستہ ہوتا ہے، اسی طرح والدین اپنے فرزند کی زندگی کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ انسانی معاشرہ دو طبقوں یعنی والدین اور اولاد سے مرکب ہے، اس لیے معاشرے کی اصلی جڑ والدین ہی ہیں۔

والدین کے ساتھ بدسلوکی کرنا اور انھیں دکھ پہنچانا انتہائی احسان فراموشی اور کم ظرفی کی علامت ہونے کے علاوہ انسانیت کے زوال اور معاشرے کی تباہی کا موجب بھی ہے، کیونکہ اگر اولاد ماں باپ کا احترام نہ کرے تو ان کا ردِعمل بھی بے مہری اور بے اعتنائی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور دوسری جانب اگر فرزند ماں باپ کو ذلت کی نگاہ سے دیکھیں تو پھر وہ بھی اپنی اولاد سے

اس سے بہتر توقع نہ رکھ سکیں گے اور اپنے بڑھاپے اور کمزوری کے زمانے میں اُن سے مہربانی اور خدمت کے امّید وار نہ ہوں گے۔ اسی طرح وہ قدرتی طور پر گھر بسانے سے بد دل ہو جائیں گے جیسا کہ اکثر نوجوانوں میں آج کل یہ صُورت دیکھنے میں آتی ہے۔

اِس طرزِ فکر کے عام ہونے پر لازماً توالُد و تناسُل کا راستا رُک جاتا ہے کیونکہ کوئی عقلمند شخص اپنی عُمرِ عزیز ایک ایسے پودے کی پرورش کے لیے وقف نہیں کرتا جس کا نہ تو وہ پھل کھا سکے، نہ اس کے سائے میں آرام کر سکے اور نہ ہی اسے دیکھنے پر رنج وغم کے علاوہ اسے کچھ حاصل ہو۔ ممکن ہے کہ ہم یہ تصوّر کریں کہ حکومت لوگوں کو مختلف انعامات دے کر گھر بسانے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرے اور اس طرح توالد و تناسل کا مسئلہ حل کر دے۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی معاشرتی رسم یا طریقہ جسے (مثلاً والدین اور فرزند کے جذبۂ محبّت کا) طبیعی سہارا حاصل نہ ہو وہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں ایک فطری خواہش کو ترک کرنے سے انسان کئی ایک پاک رُوحانی لذّتوں سے محروم ہو جائے گا۔

ماں باپ پر اولاد کے حقوق

جو کام انسان انجام دیتا ہے وہ اس شخص کی نسبت سے جسے اس کام کے نتیجے میں فائدہ پہنچتا ہو "حق" کہلاتا ہے اور اس شخص کی نسبت سے جو اس کام کو انجام دیتا ہے اُسے فرض، حُکم اور تکلیف کا نام دیا جاتا ہے مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اُجرت پر دُوسرے شخص کے لیے کام کرے تو اُجرت دینا کام کرانے والے کا فرض اور کام کرنے والے کا حق ہے اور اگر کام

کرانے والا اُجرت ادا نہ کرے تو کام کرنے والے کا حق ہے کہ اس کا مطالبہ کرے اور اپنے حق کا دفاع کرے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، انسان کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ اس دُنیا میں اسے ہمیشہ نہیں رہنا اور ایک نہ ایک دن یہاں سے کوچ کرجانا ہے۔ اس لیے خُدا نے نوعِ بشر کو معدوم ہونے سے بچانے کے لیے توالُد و تناسل کا سلسلہ قائم کیا ہے اور افراد کو اولاد پیدا کرنے کے وسیلوں کا حامل بنایا ہے نیز انسان کے اندرونی جذبات کو بھی اس طرف متوجّہ کیا ہے۔

چُونکہ انسان کو اس کام کے لیے مکمل طور پر تیار کیا گیا ہے، اِس لیے قدُرتی طور پر وہ اپنی اولاد کو اپنا ایک جُزو سمجھتا ہے اور اس کی زندگی کو اپنی زندگی تصوّر کرتا ہے۔ وہ اس کی آسائش اور کامیابی کی خاطر ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور طرح طرح کی تکالیف برداشت کرتا ہے کیونکہ اس کی ہستی یا شخصیت کی فنا کو وہ اپنی ہستی یا شخصیت کی فنا سمجھتا ہے اور اس طرح درحقیقت وہ نظامِ تخلیق کی اطاعت کرتا ہے جو نوعِ بشر کی بقا کا خواہش مند ہے۔ پس یہ ماں باپ کا وظیفہ ہے کہ وہ اپنے فرزند کے بارے میں اس حکم پر عملدرآمد کریں، جس پر انسانی ضمیر اور شرع دونوں متفق ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اس کی پرورش صحیح انداز سے کریں تاکہ وہ ایک شائستہ انسان بنے اور اس کے لیے وہی چیز روا رکھیں جو انسانیت کے نقطۂ نظر سے اپنے لیے روا رکھتے ہیں۔

ذیل میں ہم ایسی چند چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

پہلے ہی دن سے جب بچّہ بات یا اشارہ سمجھنے لگے والدین اس کی رُوح میں پسندیدہ اخلاق اور شائستہ صفات کی مضبوط بنیاد رکھیں اور

جہاں تک ہو سکے، اُسے توہّم پرستانہ باتوں سے نہ ڈرائیں۔ اُسے بُرے اور پاک دامنی کے منافی کاموں سے باز رکھیں، پھر خود بھی اس کے سامنے جھُوٹ بولنے، بدزبانی کرنے اور ناشائستہ الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کریں اور اس کے سامنے اچھے کام کریں تاکہ وہ بڑا ہوکر پاک دامن اور بلند طبع ثابت ہو۔ وہ خُود محنت، ہمّت اور عدالت کا مظاہرہ کریں تاکہ "انتقالِ اخلاق" کے قانون کی رُو سے ان کی عدالت دوستی اور "نوع پروری" اُسے منتقل ہو جائے۔

جب تک وہ تمیز کی حد تک نہ پہنچ جائے، اس کے کھانے پینے، سونے اور دوسری ضروریاتِ زندگی کا خیال رکھیں اور اس کی جسمانی صحت کی طرف توجّہ دیں تاکہ وہ صحّت مند بدن اور مضبوط دماغ اور مزاج کے ساتھ تعلیم و تربیت کے لیے تیار ہو جائے۔

جب وہ تعلیم و تربیت حاصل کرلے (عموماً ساتویں سال سے) تو اسے ایک اُستاد کے سپرد کر دیں اور اس بات کا پُورا پُورا خیال رکھیں کہ وہ ایک شائستہ اُستاد کے زیرِ سایہ تربیت پائے تاکہ جو کچھ وہ سُنے اس کا اچھّا اثر لے اور وہ اس کی رُوح کی پاکیزگی، تزکیۂ نفس اور تہذیبِ اخلاق کا موجب ہو۔

جب فرزند کی عمر اس امر کا تقاضا کرے کہ وہ عام محفلوں یا خاندان سے متعلقہ ملاقاتوں میں شریک ہو تو والدین کو چاہیے کہ اُسے معاشرتی رسوم سے واقف کرانے کے لیے اپنے ساتھ محفلوں میں لے جائیں اور رہن سہن کے پسندیدہ طور طریقوں سے آشنا کریں۔

بزرگوں کا احترام

بڑے بوڑھوں کا احترام کرنا بھی لازم ہے۔
رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ
"بوڑھوں کا ادب احترام خُدا کا ادب احترام ہے۔"

رشتے داروں کے حقوق

انسان کے رشتے دار جو اس کے ماں باپ کے وسیلے سے خونی رشتہ رکھتے ہیں وہ معاشرے کے قیام کا سبب ہوتے ہیں اور واحد خون اور مشترک خلیوں کی وجہ سے انسان ایک خاندان کا فرد بن جاتا ہے۔ اس فطری اِتّحاد اور تعلّق کی بنا پر اسلام اپنے ماننے والوں کو صلہ رحم یعنی رشتے دارو ں سے نیک سُلوک کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ قرآنِ مجید اور ہادیانِ دین کی روایات میں اس بارے میں بے حد تاکید کی گئی ہے۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :

"اُس خُدا سے ڈرو جس کی تم ایک دُوسرے کو قسم دیتے ہو اور قطع رحمی سے بھی پرہیز کرو کیونکہ خدا تمھارے احوال کو دیکھ رہا ہے۔" (سُورۂ نساء - آیت ۱)

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں :

"میں اپنی اُمّت کو صلۂ رحم کی سفارش کرتا ہوں اور اگر رشتے داروں کے درمیان ایک سال کے راستے کا فاصلہ ہو تب بھی انھیں چاہیے کہ اپنا رشتہ نہ توڑیں۔"

ہمسایوں کے حقوق

ہمسائے ایک دوسرے کے نزدیک رہنے کی وجہ سے آپس میں زیادہ میل جول رکھتے ہیں اور قدرتی طور پر ایک بڑے خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کا اچّھا یا بُرا طرزِ عمل دُوسرے لوگوں کے مقابلے میں اس کے ہمسایوں پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

جو شخص اپنے گھر میں تمام رات طوفان مچاتا رہے، وہ شہر کی دوسری طرف رہنے والوں کو تو کوئی تکلیف نہیں پہنچاتا لیکن اپنے ہمسائے کا سکون غارت کر دیتا ہے۔ جو امیر شخص اپنی عالیشان کوٹھی میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرتا ہے وہ دُور رہنے والے بیکس لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوتا ہے لیکن اس کا وہ تنگ دست ہمسایہ جو اپنے غریبانہ مکان میں رہتا ہے، وہ امیر آدمی اس کے دِل میں ہر لحظہ آگ کے شعلے بھڑکاتا ہے اور یقیناً ایک دن ایسا آئے گا جب وہ اپنے کیے کا پھل چکھ لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہمسائے کا خیال رکھنے کی بے حد تاکید کی ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے :

"جبرئیلؑ نے مجھے ہمسائے کے بارے میں اس قدر سفارش کی کہ مجھے گمان ہوا کہ ممکن ہے خُدا ہمسائے کو بھی ایک وارث قرار دیدے۔"

"جو شخص خُدا اور یومِ قیامت پر ایمان رکھتا ہے وہ ہرگز اپنے ہمسائے پر ظلم وستم نہیں کرتا۔ اگر وہ قرض مانگے تو دیتا ہے اور اس کی خوشی اور غم میں شریک ہوتا ہے اور اگر اس کا

ہمسایہ کافر ہو تب بھی وہ اسے تکلیف نہیں پہنچاتا۔"

"جو شخص اپنے ہمسائے کو تکلیف دے گا وہ بہشت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ جو شخص ہمسائے کے حق کا لحاظ نہیں کرے گا وہ ہم میں سے نہیں اور جو شخص سیر ہو کر کھائے اور جانتا ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا ہے اور اسے کچھ نہ دے وہ مسلمان نہیں۔"

غریبوں اور محتاجوں کے بارے میں انسان کا وظیفہ

چونکہ معاشرہ افراد کی ضرورتیں رفع کرنے کے لیے تشکیل دیا جاتا ہے، اس لیے ہر معاشرے کے افراد کا سب سے اہم وظیفہ یہ ہے کہ وہ بیکسوں اور کمزوروں کی مدد کریں اور ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی کسی نہ کسی وسیلے سے پوری کریں جو خود انھیں رفع کرنے کی طاقت رکھتے۔

ہمارے زمانے میں ایک دفعہ پھر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ غریب افراد کی پریشانیوں کے مقابلے میں امیر لوگوں کا ہر بندش سے آزاد ہونا وہ عظیم ترین خطرہ ہے جو معاشرے کو نیست و نابود کر سکتا ہے اور سب سے پہلے اس خطرے کی بھینٹ چڑھنے والے خود امیر لوگ ہیں۔

اس خطرے کو بھانپتے ہوئے اسلام نے چودہ سو سال پہلے حکم دیا تھا کہ دولتمند ہر سال اپنی دولت کا ایک حصہ غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیں اور جب اس حد تک ان کی ضروریات رفع ہو جائیں تو مستحب ہے کہ غریبوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے دولتمند لوگ جتنا خرچ کر سکیں وہ ان کے حق میں فائدہ مند ہے۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"تم بھلائی اور نجات نہیں پا سکتے بجز اس کے کہ جس چیز کو تم پسند کرتے ہو اس کی کچھ مقدار اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔"

(سورۂ آلِ عمران - آیت ۹۲)

خدمتِ خلق کے بارے میں بھی بیشمار روایات ہم تک پہنچی ہیں، رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں سے بڑھ کر لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔"

"قیامت کے دن خدا کے نزدیک اس شخص کا درجہ بلند ہوگا جس نے لوگوں کی خیر خواہی کے سلسلے میں دوسروں سے بڑھ کر قدم اٹھایا ہوگا۔"

معاشرے کے بارے میں انسان کا وظیفہ

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، انسان ایک دوسرے کی مدد سے کام کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے کام اور محنت سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کی ضروریات رفع کرتے ہیں۔ ان افراد کے میل جول سے جو معاشرے وجود میں آتے ہیں وہ ایک بڑے انسان کی مانند ہیں اور ان میں سے ہر فرد اس بڑے انسان کے اعضا میں سے ایک عضو ہے۔

انسان کے بدن کا ہر عضو اپنا مخصوص کام انجام دیتا ہے، وہ اپنے کام کے علاوہ دوسروں کے کام سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسروں کی زندگی کی روشنی میں اپنی زندگی جاری رکھتا ہے۔ اگر ہر عضو خودغرضی کا مظاہرہ

کرے اور دوسروں کی کوئی مدد نہ کرے مثلاً جب ہاتھ پاؤں کام کر رہے ہوں اور آنکھ ان سے تعاون نہ کرے یا مُنہ فقط غذا چبانے اور اس سے لذّت حاصل کرنے پر اکتفا کرے اور معدے کی ضروریات رفع کرنے کے لیے غذا کو پیٹ میں نہ اتارے تو انسان کی زندگی جلد ہی ختم ہو جائے اور اس کے نتیجے میں خود غرض اور آزادی پسند اعضاء بھی موت سے ہمکنار ہو جائیں۔

جہاں تک معاشرے کا تعلّق ہے اس کے افراد کا فریضہ بھی انسان کے اعضاء کے فریضے کی مانند ہے۔ یعنی ایک انسان کو چاہیے کہ وہ اپنا منافع معاشرے کے منافع کے تحت قرار دے اور اپنے کام میں معاشرے کے مفاد کو مدِّنظر رکھے تاکہ وہ اپنی محنت کا پھل چکھ سکے اور دوسروں کو بھی نفع پہنچا سکے، اس طرح وہ خود بھی دوسروں سے نفع حاصل کر سکے گا، اس کے ساتھ ہی وہ دوسروں کے حقوق کی رعایت کرے تاکہ اس کے اپنے حقوق بھی ضائع نہ ہوں۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہم اپنی خداداد فطرت کی بدولت سمجھتے ہیں اور اسلام بھی جو دینِ فطرت ہے، اس کے متعلق کوئی اور نظریہ یا رائے نہیں رکھتا۔

رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں:

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دیگر مسلمان محفوظ رہیں۔"

"مسلمان ایک دُوسرے کے بھائی ہیں اور غیروں کے مقابلے میں ایک ہاتھ، ایک دل اور ایک مقصد کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

"جو شخص مسلمانوں کے اُمور کو اہمیّت نہ دے وہ مُسلمان نہیں ہے"۔

روایت ہے کہ جب رسولِ اکرمؐ جنگ تبوک کے سلسلے میں روم کی سرحد کی جانب تشریف لے گئے تو تین ایسے مسلمان بھی تھے جنھوں نے جنگ میں شرکت نہیں کی۔ جب اسلام کے جانباز واپس لوٹے تو وہ تین اشخاص ان کے استقبال کو گئے اور آنحضرتؐ کو سلام کیا۔ آپؐ نے اپنا رُوئے مبارک ان کی جانب سے پھیر لیا اور ان کے سلام کا جواب نہ دیا۔ اسی طرح جب مسلمانوں نے ان سے بے اعتنائی برتی اور شہر مدینہ میں کوئی شخص حتّیٰ کہ ان کی بیویاں بھی ان سے بات کرنے کی رَوادار نہ تھیں تو آخر مجبور ہو کر انھوں نے مدینہ کی پہاڑیوں میں پناہ لی اور توبہ و استغفار میں مشغول ہو گئے۔ چند دن کے بعد خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی اور وہ دوبارہ شہر میں داخل ہُوئے۔

عدالت

اسلامی ادراک کے مطابق ساری دنیا ایک ایسی حقیقت ہے جو عدالت کی بنیاد پر قائم ہے یعنی ہر چیز ایک ضابطے اور حساب کے تابع ہے۔

قرآن مجید میں ہے :

"اس نے آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز کے لیے میزان قائم کی"۔
(سُورۂ رحمٰن - آیت ۷)

پھر جس اصول کا ہمیں مولی الموحدین امام علیؑ کے ارشادِ گرامی سے پتا چلتا ہے اس کے مطابق عدل اس چیز سے عبارت ہے کہ "ہر چیز اپنی جگہ پر

رکھی ہو۔" اس کے برعکس ظلم یہ ہے کہ" کوئی چیز اپنی اصل جگہ سے ہٹ جائے۔"

قرآنِ مجید اور پیشوایانِ دین کی روایات کے مطابق عدالت دو قسم کی ہے : ایک انفرادی، دوسری اجتماعی۔ اسلام نے عدالت کے ان ہر دو معانی کی جانب پوری توجّہ دی ہے۔

اِنفرادی عدالت

انفرادی عدالت یہ ہے کہ انسان جھوٹ، غیبت، بُہتان اور دُوسرے کبیرہ گناہوں سے اجتناب برتے اور دُوسرے گناہوں پر بھی مُصِر نہ ہو۔ جس شخص میں یہ صِفَت موجود ہو اُسے عادل کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسلامی قواعد وضوابط کے مطابق اگر وہ علمی استعداد بھی رکھتا ہو تو قاضی، حاکم اور قابِل تقلید رہنما کے فرائض اور دُوسرے اجتماعی کام بھی انجام دے سکتا ہے لیکن جو شخص اس دینی شخصیت سے محروم ہو وہ خواہ عالم ہی کیوں نہ ہو ان اعزازات سے بہرہ مند نہیں ہوسکتا۔

اجتماعی عدالت

اجتماعی عدالت یہ ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کے بارے میں اِفراط وتفریط رَوا نہ رکھے اور قانونِ خداوندی کے سامنے سب کو برابر سمجھے۔ دینی احکام کے اِجرا میں حق سے تجاوز نہ کرے اور جذبات واحساسات سے مغلوب ہوکر سیدھے راستے سے بھٹک نہ جائے۔

خُداوندِ کریم فرماتا ہے :

"خُدا عدالت کا حُکم دیتا ہے۔" (سُورۂ نحل۔ آیت ۹۰)

ایک اور آیت میں خداوند حاکموں کو حکم دیتا ہے کہ وہ عدالت کے مطابق فیصلے کریں۔ بہت سی آیات اور روایات میں قول و عمل میں عدالت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تیز خُدائے قہّار نے اپنے کلام میں بعض موقعوں پر ظالموں پر صریحاً لعنت کی ہے۔

ظلم و ستم

خُدا نے اپنے آفاقی کلام میں سیکڑوں دفعہ ظلم کا ذکر کیا ہے اور اس بُری صِفَت کی جو درندوں کی خُو ہے مذمّت کی ہے۔ (قرآنِ مجید کی ۱۱۴ سورتوں میں سے دو تہائی سورتوں میں ظلم کا ذکر آیا ہے)۔

ایسا کوئی شخص نہیں جس نے اپنی فطرت کی بدولت ظلم کی بُرائی اور خرابی کو نہ سمجھا ہو یا وہ کم از کم یہ نہ جانتا ہو کہ ظلم کی وجہ سے معاشرے پر کِتنی دردناک مصیبتیں نازل ہوئی ہیں، کِتنا خُون بہا ہے اور کِتنے گھر اُجڑ گئے ہیں۔

تجربے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ظلم کی عمارت خواہ کِتنی ہی پختہ کیوں نہ ہو، پائیدار نہیں ہوتی اور کبھی نہ کبھی ظالموں کے سر پر آ گرتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"اِس میں کوئی شک نہیں کہ خُدا ظالموں کو ان کے اصلی مقصد تک نہیں پہنچائے گا۔" (سورۂ انعام۔ آیت ۱۴۴)

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے :

"سلطنت اور مملکت کُفر کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے،
لیکن ظُلم وستم کے ساتھ نہیں رہ سکتی"

حُسنِ مُعاشرت

انسان جو کہ چاہتے یا نہ چاہتے ہُوئے بھی معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے، وہ لوگوں سے معاشرت یعنی میل جول سے اجتناب نہیں برت سکتا۔ معاشرت کا مقصد بلاشبہ یہ ہے کہ انسان اپنی سماجی حیثیت کی حفاظت کرے اور روز بروز اپنی مادّی و رُوحانی ترقّی میں اضافہ کرے اور زندگی کی مشکلات کو بہتر اور زیادہ آسان طریقوں سے حل کرے۔

لہذا لوگوں سے اس طرح ملنا چاہیے کہ انسان کا حُسنِ سلوک اس کی ہر دلعزیزی کا موجب بن جائے، روز بروز اس کے سماجی مقام میں اضافہ ہو اور اس کے دوستوں کی تعداد بھی بڑھ جائے۔ کیونکہ اگر لوگ کسی شخص سے مِلتے وقت یہ محسوس کریں کہ وہ تُرش رُو اور تلخ مزاج ہے تو ان کے دِل میں اس کے لیے غصّہ اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ سبھی اس سے دُور بھاگتے ہیں اور بالآخر وہ معاشرے کی نگاہ میں حقیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی تنہا ہوتا ہے اور اپنے وطن میں ایک اجنبی جیسی زندگی بسر کرتا ہے جیسا کہ ظاہر ہے یہ صورتِ حال انسان کی بدبختی کا انتہائی تلخ اور ناگوار نمونہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں کو ہدایت کی ہے کہ لوگوں سے اچھّی طرح ملیں اور اس سلسلے میں بہترین آداب اور احکام وضع فرمائے ہیں چنانچہ ایک حکم اس نے یہ دیا ہے کہ جب مسلمانوں کی باہمی ملاقات ہو تو وہ

ایک دوسرے کو سلام کہیں اور فضیلت کا حقدار اُسے گردانا ہے جو سلام کہنے میں پہل کرے۔ جیسا کہ اسلام کہتا ہے کہ راہ چلتا سوار پیدل چلنے والے کو، پیدل چلنے والا راستے میں کھڑے لوگوں کو اور کسی محفل میں آنے والا وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرے۔

رسولِ اکرمؐ سلام کہنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے حتّٰی کہ عورتوں اور بچّوں کو بھی سلام کہتے تھے۔ اگر کوئی شخص آپؐ کو سلام کہتا تھا تو اس کے سلام کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دیتے تھے۔

خُداوند تعالیٰ فرماتا ہے:

"جب کوئی شخص تمھیں سلام کہے تو تم اس کے جواب میں اُس سے بہتر طریقے سے سلام کہو یا وہی لفظ جواب میں کہدو۔"

(سورۂ نساء - آیت ۸۵)

یہ حُکم بھی دیا گیا ہے کہ انسان جب دُوسروں سے ملے تو تواضع اور فروتنی سے پیش آئے اور ہر ایک کا احترام اس کی سماجی حیثیت کے مطابق کرے۔

خُدا قرآنِ مجید میں فرماتا ہے:

"خُدا کے شائستہ بندے وہ ہیں جو لوگوں کے ساتھ تواضع اور فروتنی سے پیش آتے ہیں۔" (سورۂ فرقان - آیت ۶۳)

ایک نکتہ جس ذکر کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تواضع اور فروتنی کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ انسان اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار کردے اور اپنی انسانیت کو نقصان پہنچائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنے امتیازات اور مرتبے سے لوگوں کو مرعُوب نہ کرے، ڈینگیں نہ مارے اور لوگوں کو گھٹیا نہ سمجھے۔ اِسی طرح لوگوں کا احترام کرنے کے یہ معنیٰ نہیں کہ

لوگوں کا اتنا احترام کیا جائے کہ وہ خوشامد اور چاپلوسی کی شکل اختیار کرلے ، بلکہ چاہیے یہ کہ ہر شخص کی قدر اس کے دینی اور سماجی رُتبے کے مطابق کی جائے، بزرگوں کا ان کی بزرگی کے مطابق احترام کیا جائے اور انسانیت کے ناطے دُوسروں کی بھی عزّت کی جائے۔

لوگوں کے احترام کے یہ معنیٰ بھی نہیں کہ اگر کوئی شخص ناجائز کام کررہا ہو تب بھی انسان اپنے ہونٹ سی لے اور چُپکے سے گزر جائے یا کسی ایسی محفل میں شریک ہو جس کے شرکا انسانی شرافت کے منافی حرکتوں میں مصروف ہوں اور رسوائی کے خوف سے انھیں کے رنگ میں رنگا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت لوگوں کا احترام ان کے بدن کا احترام نہیں بلکہ ان کی انسانی شرافت اور دینی اور اخلاقی رُتبے کا احترام ہے۔ جب ایک شخص اپنی انسانی شرافت اور دینی حیثیت کو خیرباد کہہ دے تو اس کے احترام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے :

”دُوسروں کی فرماں برداری کرکے خدُا کا گنہگار نہیں ہونا چاہیے“

لوگوں کو ایذا پہنچانا اور شرارتیں کرنا

یہ دونوں صفتیں ایک دوسری کے قریب ہیں کیونکہ ایذا پہنچانے کے معنیٰ لوگوں کو اذیت اور دُکھ دینے کے ہیں خواہ وہ زبان سے ہو مثلاً گالی بکنا اور ایسی بات کہنا جس سے دُوسروں کو تکلیف پہنچے یا ہاتھ سے ہو جیسے کہ ایسا کام کرنا جو لوگوں کے لیے پریشانی کا موجب ہو۔ شرارت کرنے سے مُراد ایسے کام ہیں جو لوگوں کے لیے شر پیدا کریں۔ بہرحال یہ دُو صفتیں اس آرزو

کے بالکل برعکس ہیں جسے پُورا کرنے کے لیے انسان معاشرے کو وُجود میں لایا ہے، اور وہ آرزو آرام دہ زندگی اور دل کا سکون ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعتِ محمدی نے جو معاشرہ کی بہبود کو انتہائی اہمیت دیتی ہے، اِن دونوں صفات کو حرام قرار دیا ہے۔

خُداوندِ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں کو بلا وجہ تکلیف دیتے ہیں وہ بہتان اور گناہِ کبیرہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھاتے ہیں۔"
(سُورۂ احزاب - آیت ۵۸)

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"جو شخص کسی مسلمان کو اذیّت دیتا ہے وہ مجھے اذیّت دیتا ہے، اور جو مجھے اذیت دیتا ہے وہ خُدا کو اذیّت دیتا ہے۔ ایسے شخص پر تورات، انجیل اور قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔"

"جو شخص ایک مسلمان پر غیظ و غضب کی نگاہ ڈال کر اُسے ڈرا دے، خُدا قیامت کے دن اُسے ڈرائے گا۔"

اچھّے لوگوں کی صُحبت میں بیٹھنا

گو اِنسان بہت سے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے لیکن زندگی کے تقاضوں کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ وہ بعض لوگوں کے مقابلے میں بعض دُوسرے لوگوں کے ساتھ زیادہ گھُل مِل کر رہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں دوست کا نام دیا جاتا ہے۔

بلا شبہ اس دوستی اور قرب کا باعث اخلاق، طور طریقوں یا پیشے وغیرہ

میں ایک طرح کی یکسانیت اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ چونکہ آہستہ آہستہ دُو مل بیٹھنے والوں میں سے ایک کی عادات اور اخلاق دُوسرے کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اِس لیے انسان کو چاہیے کہ اچھّے لوگوں کی صحبت اختیار کرے۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے اچھے اخلاق اس میں سرایت کریں گے اور ان کی بے لوث اور خیر خواہی پر مبنی دوستی سے اُسے فائدہ ہوگا اور ان کی دوستی کی پائیداری پر اسے بھی اعتماد ہوگا۔ ان سب باتوں کے علاوہ لوگوں کی نظر میں اس کی سماجی وقعت اور عزّت بھی بڑھے گی۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"تمھارا بہترین دوست وہ ہے جو تمھاری رہنمائی نیک کام کی طرف کرے۔"

"کسی شخص کے کردار کا اندازہ اس کے دوست سے لگایا جاتا ہے۔"

بُرے لوگوں کی صُحبت اختیار کرنا

بُرے اور بد اطوار لوگوں کے ساتھ میل جول ہر قسم کی مصیبت اور بدبختی کا موجب ہے۔ اِس حقیقت کی وضاحت کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر ہم جرائم پیشہ اور بدکردار لوگوں مثلاً چوروں اور ڈاکوؤں سے ان کی بے راہ روی اور بداعمالیوں کا سبب پوچھیں تو وہ یہی کہیں گے کہ ہمیں بُری صُحبت نے اس نوبت تک پہنچایا ہے۔ حتّٰی کہ ایک ہزار بدکار اور بگڑے ہُوئے افراد میں سے ایسا ایک شخص بھی نہیں ملے گا، جس نے اپنے آپ یہ غلط راستا اختیار کیا ہو۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے :

"بُرے لوگوں کی صحبت سے دُور رہو کیونکہ بُرا دوست تمھیں خود اپنے جیسا بنالے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک وہ تمھیں اپنے جیسا نہ بنالے وہ تمھیں قبول نہیں کرسکتا۔"

"بدکردار آدمی کی دوستی سے دُوری اختیار کرو کیونکہ وہ تمھیں تھوڑی سی قیمت پر بیچ دے گا۔"

راست گوئی

لوگوں کے باہمی تعلقات جو انسانی مُعاشرے کی بُنیاد ہیں وہ باہم گفتگو کرنے کے ذریعے قائم ہوتے ہیں۔ لہٰذا سچّی بات کہنا کہ جو پوشیدہ حقیقت کو انسان کے لیے ظاہر کرتی ہے، معاشرے کے ضروری ارکان میں سے ہے۔ وہ اہم فوائد جن سے معاشرہ ہرگز بے نیاز نہیں ہوسکتا وہ سچ بولنے کی بدولت ہی حاصل ہوتے ہیں۔

سچ بولنے کے فوائد کا خلاصہ چند جملوں میں بیان کیا جاسکتا ہے:

سچّے آدمی پر لوگ اعتماد کرتے ہیں اور جو کچھ وہ کہے اُسے سن کر انھیں ایک گونہ اطمینان ہوتا ہے۔

سچّا آدمی اپنے ضمیر کے سامنے سربلند اور جھوٹ کے دُکھ سے محفوظ رہتا ہے۔

سچّا آدمی اپنے وعدے پُورے کرتا ہے اور جو امانت اس کے سپرد کی جائے وہ اس میں خیانت نہیں کرتا کیونکہ فعل میں سچائی اور قول میں سچّائی دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔

راست گوئی کے ذریعے بہت سے اختلافات اور جھگڑے طے ہو جاتے ہیں کیونکہ اکثر جھگڑے اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ ایک یا دونوں فریق سچّی بات نہیں کہتے۔

بہت سے اخلاقی عیوب اور قوانین وضوابط کی خلاف درزی کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے کیونکہ زیادہ تر لوگ اسی قسم کے اعمال اور کردار کی پردہ پوشی کیلئے جھوٹ بولتے ہیں۔

امیر المؤمنین امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"حقیقی مسلمان وہ ہے جو سچّائی کو خواہ وہ اس کے لیے نقصان دِہ ہی ہو جھُوٹ پر ترجیح دے، گو وہ اس کے لیے مُفید ہو اور اُسے ترجیح دینے سے رُوحانی سکون حاصل کرے"

جھُوٹ بولنے کے نقصانات

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے، اس سے جھُوٹ بولنے کے نقصانات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ جھُوٹا شخص انسانی معاشرے کا نابکار دشمن ہوتا ہے اور اپنے جھُوٹ کے ساتھ جو ایک بہت بڑا جرم ہے، مُعاشرے کو بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ جھُوٹ چونکہ مسکّن مادّے کی مانند ہے جو معاشرے کی سمجھ بُوجھ کی قوّت کو زائل کر دیتا ہے اور حقائق پر پردہ ڈال دیتا ہے — یا منشیات کی مانند ہے جو لوگوں کو مست کر کے ان کی قوّتِ عاقلہ کو اچّھائی اور بُرائی کی تمیز سے محروم کر دیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جھُوٹ کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے اور وہ کسی جھُوٹے شخص کی دینی شخصیّت کو تسلیم نہیں کرتا۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے :

"تینؔ قسم کے لوگ ایسے ہیں جو اگر نمازیں بھی پڑھیں اور روزے بھی رکھیں لیکن مُنافق ہیں : جھوٹ بولنے والا۔ وعدہ وفا نہ کرنے والا اور۔ امانت میں خیانت کرنے والا۔"

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے :

"انسان ایمان کی لذّت اس وقت چکھتا ہے جب وہ جھوٹ بولنا چھوڑ دے خواہ وہ مذاق مذاق میں ہی کیوں نہ ہو۔"

جھوٹ کو فقط شرع ہی میں ایک گناہ اور بُرا کام نہیں سمجھا گیا بلکہ عقل کی رُو سے بھی اس کی برائی واضح ہے۔ اس ناپسندیدہ عادت کے اثرات بہت تھوڑے وقت میں اعتماد کو جو لوگوں کے مابین واحد اجتماعی رابطہ ہے ختم کر دیتے ہیں اور جب یہ رابطہ ختم ہو جاتا ہے تو لوگ بے حد تشویش کے عالم میں درحقیقت تنہائی کی زندگی گزارتے ہیں گو بظاہر وہ معاشرے کا ایک حصّہ نظر آتے ہیں۔

اِنسان کو اس کی زندگی میں ہمیشہ خارجی مادّے سے واسطہ پڑتا ہے، وہ اپنی سرگرمیوں اور اس مادے کو استعمال میں لانے کی بدولت زندہ رہتا ہے اور اپنی خواہشوں کی تکمیل کرتا ہے۔ اس موجود (یعنی انسان) نے جو اپنے کام شعور اور ارادے کے ساتھ کرتا ہے، اپنی وسیع زندگی کی بنیاد علم پر رکھی ہے اور وہ دماغ کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اس کے کام کا دار ومدار براہِ راست ان معلومات پر ہوتا ہے جو اُسے میسّر ہوں۔ وہ ہمیشہ اپنے ذہنی مواد کو منظّم کرتا رہتا ہے اور اس کی بیرونی سرگرمیاں اس کے مطابق انجام پاتی ہیں۔

لہذا صحیح معلومات حاصل کرنا انسان کے لیے ضروری اور بے حد اہم چیز ہے۔ اگر انسان صحیح خارجی معلومات سے محروم ہو جائے مثلاً دُور کو نزدیک اور نزدیک کو دور سمجھنے لگے اور جو خبر سُنے حقیقت اس کے برعکس ہو تو یقیناً اس کی زندگی کا پہیہّ جام ہو جائے گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جھُوٹ انسان کی سماجی زندگی کے لیے ایک عظیم خطرہ ہے۔

جھوٹا آدمی ایک بے شخصیت اور گھٹیا انسان ہوتا ہے جو معاشرے کا دشمن ہوتا ہے۔ اس کی باتیں اعتماد اور اطمینان کے قابل نہیں ہوتیں اور وہ خود خدا کی لعنت میں گرفتار ہوتا ہے۔

غیبت اور اِفتراء

دُوسروں کی برائی کرنا اور ان کے عیب بیان کرنا اگر سچ پر مبنی ہو تو غیبت ہے اور اگر جھُوٹ ہو تو اسے افتراء اور تُہمت کہا جاتا ہے۔

بلاشبہ خُدا نے (پیغمبروں اور اماموں کے علاوہ) کسی کو معصوم نہیں بنایا اور ہر شخص سے اس کے بعض نقائص کی بنا پر لغزش ہوسکتی ہے اور عموماً لوگ اس پردے کے پیچھے زندگی بسر کرتے ہیں جو خُدا نے اپنی حکمت سے ان کے اعمال کے آگے تان دیا ہے۔ یہ خُداوندی پردہ اگر ایک لحظہ بھر کے لیے بھی ان کے عیوب اور نقائص پر سے ہٹ جائے تو وہ سب ایک دوسرے سے بیزار اور متنفر ہو جائیں اور معاشرے کی بنیاد درہم برہم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خُدا نے غیبت کو حرام قرار دیا ہے تاکہ لوگ پیٹھ پیچھے ایک دُوسرے کے ہاتھوں محفوظ رہیں اور ان کی ظاہری زندگی ٹھیک ٹھاک نظر آئے تاکہ بتدریج وہی بیرونی زیبائش ان کی اندرونی خرابی کی اصلاح کردے۔

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :

"ایک دُوسرے کی غیبت نہ کرو کیونکہ ایک مسلمان بھائی کی غیبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ اس کے مُردہ اور بے جان جسم کو (جو کہ بے خبر ہے) چیر پھاڑ کر کھالیا جائے۔"

(سورۂ حجرات - آیت ۱۲)

اِفترا، غیبت سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے اور عقل کی نگاہ میں اس کی بُرائی واضح ہے۔ خدا نے اپنے کلام میں اسے مسلّمہ طور پر بُرا اور ناروا گردانا ہے اور فرمایا ہے :

"جو لوگ افترا باندھتے ہیں وہ ایمان نہیں رکھتے۔"

(سورۂ نحل - آیت ۱۰۵)

لوگوں کے ناموس پر حملہ کرنا

اسلام کے نقطۂ نگاہ سے عِفّت کا پردہ چاک کرنا ایک گناہِ کبیرہ ہے اور مختلف حالات کے مطابق اس کے لیے کوڑوں، قتل اور سنگسار کرنے جیسی سخت سزائیں وضع کی گئی ہیں۔

اگرچہ یہ ناروا فعل طرفین کی مرضی سے انجام پائے، لیکن پھر بھی یہ نسب کی بُنیاد کو جسے اسلام بے حد اہمیت دیتا ہے، متزلزل کر دیتا ہے۔ وراثت کے احکام کو معطّل کر دیتا ہے اور آخر کار والدین اور اولاد کی باہمی محبّت کو غیر مؤثر اور توالد و تناسل کے فطری اثر کو جو معاشرے کی بقا کا حقیقی ضامن ہے، ختم کر دیتا ہے۔

عزّتِ نفس اور دیانتداری

کارخانۂ قدرت نے اِنسان کی تخلیق اس انداز سے کی ہے کہ وہ دُوسروں کے ساتھ مِل جُل کر رہنے اور ان کے تعاون سے زندگی بسر کرنے کا محتاج ہے یعنی اسے یوں تیار کیا گیا ہے کہ وہ معاشرے کے ماحول میں رہتے ہوئے اپنی ذاتی قوّت سے کام کاج کرسکتا ہے اور اپنے کام کا جو صِلہ ملے اس کے ذریعے گزر بسر کرسکتا ہے۔

جو کچھ اُوپر کہا گیا ہے اس پر غور کرنے سے اِس بارے میں کسی شک و شُبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ عزّتِ نفس کی صفت اس چیز سے عبارت ہے کہ انسان اپنی زندگی میں خُداداد قوتوں سے استفادہ کرے اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے انھیں بروئے کار لائے نہ کہ دُوسروں کی قوت پر بھروسا کرے اور یہ چیز بجائے خود انسان کے فطری اور پسندیدہ اخلاق میں سے ہے۔ عزّتِ نفس ایک ایسا پشتہ ہے جو ذلّت کی زندگی اور دُوسرے بہت سے ناروا کاموں سے انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ جو شخص عزّتِ نفس کا خیال نہیں رکھتا اور ہر ایک کا دستِ نگر رہتا ہے وہ بڑی آسانی سے اپنا ارادہ اور شخصیت دوسروں کے ہاتھ بیچ سکتا ہے پھر جو کچھ وہ کہیں، معمولی فائدے کی طمع میں وہی کرتا ہے اور جو بھی وہ چاہیں وہی ان پر نثار کرتا ہے، خواہ وہ فطری آزادی، آبرو، عزّت اور شرافت ہی کیوں نہ ہو۔

زیادہ تر جرائم مثلاً قتل، رہزنی، چوری، جیب تراشی، دروغ گوئی، چاپلوسی، قوم فروشی، اغیار پرستی وغیرہ حرص وطمع اور دوسروں پر تکیہ

کرنے کے منحوس نتائج ہیں۔

تاہم جو شخص عزّتِ نفس کے افتخار کا تاج سر پر رکھے ہوئے ہو وہ خدا کی بڑائی کے علاوہ کسی بڑائی کے آگے سر نہیں جھکاتا اور کسی اقتدار اور جاہ و جلال کے سامنے سر نیچا نہیں کرتا۔ وہ جس چیز کو حق سمجھتا ہے، ہمیشہ اس کا دفاع کرتا ہے۔ عزّتِ نفس، دیانت داری کی صفت پیدا کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

محتاجوں کی مدد

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ ہر معاشرے میں محتاج اور بے کس لوگ مدد کے مستحق ہوتے ہیں۔ دولتمند لوگوں کا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں اور ان کے اس مسلمہ حق کو پامال نہ کریں۔ اسلام نے بھی اس حق کی ادائیگی کی تاکید کی ہے اور دولتمندوں کو محتاجوں اور بیکسوں کی امداد کا ذمّے دار ٹھہرایا ہے۔

خدا قرآنِ مجید میں اپنا تعارف نیکوکار، دردمند اور رحیم کی حیثیت سے کراتا ہے اور اپنے بندوں کو بھی اپنے اندر یہ پسندیدہ صفات اُجاگر کرنے کی ترغیب دیتا ہے چنانچہ فرماتا ہے:

"خُدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔"

"جو چیز تم (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے فائدہ مند ہے۔"

"جو کچھ تم (خُدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہو وہ تمھاری طرف لوٹ آئے گا اور تم خسارے میں نہیں رہو گے۔"

معاشرتی حالات اور احسان کے فوائد پر غور کرنے سے ان آیات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت معاشرے کی تمام قوتیں سبھی افراد کی خاطر کام کرتی ہیں اور جس معاشرے میں ایک گروہ تنگدستی کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہیں رہتا اس میں اسی نسبت سے دولت کی پیداوار میں کمی آجاتی ہے۔ پھر اس کے بُرے نتائج سبھی افراد کو متأثر کرتے ہیں اور نوبت یہاں تک آپہنچتی ہے کہ دولتمند لوگ سب سے زیادہ بے کس ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر دولتمند لوگ نیکوکاری اور رحم دلی کو کام میں لاتے ہوئے محتاجوں کی مدد کریں تو ان کے لیے بھی اس کے بہت اچھے نتائج نکلتے ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں :

ایسا کر کے وہ دُوسروں کے دلوں میں اپنے لیے محبّت پیدا کرتے ہیں اور انھیں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔

وہ ایک معمولی رقم کے عوض بہت زیادہ احترام حاصل کرتے ہیں۔

وہ اکثر لوگوں کی حمایت حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ لوگ نیکوکار شخص کی طرفداری کرتے ہیں۔

وہ اس دن کے خطرے سے محفوظ ہو جاتے ہیں کہ جس دن تہی دست لوگوں کا کینہ اور غصّہ جمع ہو کر ہر خشک و تر کو جلا کر رکھ دے۔

جو مال و زر وہ غریبوں پر خرچ کرتے ہیں وہ معاشرے کی اقتصادیات کا پہیہّ گھومنے پر کئی گنا ہو جاتا ہے اور خود ان کی طرف لوٹ آتا ہے۔

ایسی آیات اور روایات بیشمار ہیں جن میں خدا کی راہ میں انفاق کی

فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

تعاوُن

احسان اور نیکو کاری کہ جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے تعاون کی مختلف شاخوں میں سے ایک ایسی شاخ ہے جو انسانی معاشرے کی بنیاد ہے۔ کیونکہ معاشرہ درحقیقت افراد کا ایک دوسرے کے ہاتھ تھامنے کا نام ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں اور یوں سب کی حالت درست، زندگی مستحکم اور ضرورت پوری ہو جائے۔ تاہم یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اسلام نے نیکو کاری کو فقط مال خرچ کرنے تک ہی محدود رکھا ہے بلکہ اس کا مقصد ہر حاجتمند کی مدد کرنا ہے خواہ اسے مالی امداد کی ضرورت نہ بھی ہو اور انسان کا ضمیر بھی اسی چیز کا طالب ہے۔

اَن پڑھ شخص کو تعلیم دینا، نابینا آدمی کو راستا پار کرانا، گمراہ کو راہ دکھانا، گرے ہوئے کو اُٹھنے میں مدد دینا وغیرہ احسان اور نیکو کاری کے زُمرے میں آتے ہیں اور اس تعاون کا حصّہ ہیں جس کی پسندیدگی کی تصدیق ہم نے معاشرہ تشکیل دینے کے پہلے دن کی تھی۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اگر انسان کچھ فروعی کام انجام نہ دے تو پھر وہ بنیادی کام نہیں کرسکتا اور کچھ غیر اہم جُزوی ذمّے داریاں پوری نہ کرے تو وہ دیگر اہم فرائض سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

خیرات اور صدقات

نیکو کاری کا پسندیدہ ہونا اُن نتائج کی بنا پر ہے جو اس سے

حاصل ہوتے ہیں۔ جس قدر یہ نتائج عمومی اور پائیدار ہوں گے اسی قدر نیکوکاری بھی زیادہ پسندیدہ اور زیادہ بلند مرتبہ ہوگی۔ ایک بیمار شخص کا علاج کرنا نیکوکاری اور احسان ہے لیکن اس کا ایک ایسا ہسپتال قائم کرنے سے کوئی مقابلہ نہیں کہ جس میں روزانہ سیکڑوں مریضوں کا علاج ہوتا ہو۔ ایک طالب علم کو پڑھانا پسندیدہ چیز ہے لیکن یہ فعل ایک کالج قائم کرنے کے پائے کا نہیں کہ جس سے ہر سال سیکڑوں طلباء فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عام اوقاف اور عمومی خیرات و مبرات اعلیٰ درجے کا احسان اور نیکوکاری ہے۔

شرعی اصطلاح میں اس عمومی خیرات کو "صدقہ جاریہ" کہا جاتا ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"دو چیزیں انسان کے لیے سربلندی کا موجب ہیں: ایک فرزندِ صالح اور دوسری صدقۂ جاریہ۔"

کتاب و سُنّت سے پتا چلتا ہے کہ جب تک "صدقۂ جاریہ" قائم رہے، صدقہ کرنے والے کے حق میں نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

سرفروشی

اِس میں کوئی شک نہیں کہ انسانی ضمیر کی لغت میں حقیقی زندگی اور شریفانہ زندگی ہم معنیٰ ہیں اور جو زندگی شرافت سے خالی اور سعادت سے عاری ہو وہ زندگی نہیں بلکہ موت ہے اور موت بھی ایسی کہ جو طبیعی موت سے بھی زیادہ تلخ اور ناگوار ہے۔ جس انسان کی نظر میں اپنی شرافت اور نیک بختی کی قدر و قیمت ہو، اسے چاہیے کہ ایسی پست زندگی سے اس

طرح بھاگے جیسے وہ بے مقصد کی موت سے بھاگتا ہے۔

انسان خواہ کسی ماحول میں زندگی بسر کرے اور کوئی سی روش اپنائے وہ اپنی خدا داد فطرت کے ذریعے اس بات کو سمجھتا ہے کہ جس چیز کو وہ وقعت دیتا ہے اس کی راہ میں مرنا بجائے خود نیک بختی ہے۔ اگرچہ دین کی منطق میں یہ مسئلہ دوسری ہر منطق سے زیادہ واضح ہے اور قیاس آرائی اور توہّم سے بھی پاک ہے کیونکہ جو شخص دین کے حکم کے مطابق اپنے دینی معاشرے کا دفاع کرتے ہوئے جان دیدے وہ جانتا ہے کہ وہ خسارے میں نہیں رہا۔ وہ اپنی یہ چند روزہ زندگی خدا کی راہ میں نچھاور کر کے ایک زیادہ شیریں، زیادہ قیمتی اور جاودانی زندگی حاصل کرلیتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پھر اس کی خوش نصیبی کو کبھی زوال نہیں آتا۔

اس بارے میں خُدا اپنے کلام میں یوں ارشاد فرماتا ہے :

"جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں وہ مردہ نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور قرب کے مقام میں خُدا کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

لیکن غیر دینی مسالک میں جو انسان کی زندگی کو اِس دُنیا کی چند روزہ زندگی تک محدود سمجھتے ہیں یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ انسان موت کے بعد زندہ رہتا ہے۔ بجز اس کے جو محض قیاس آرائی اور توہّم پرستی کی بنا پر اُسے بتایا جاتا ہے کہ مثلاً جو شخص وطن اور قوم کی مقدّس چیزوں کی خاطر قتل ہوجائے، اس کا نام قوم کے جانبازوں اور سرفروشوں کی فہرست میں لکھا جاتا ہے، وہ قوم اور وطن کا ہیرو بن کر شہرت کے آسمان پر چمکتا رہتا ہے ، تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف میں درج ہوتا ہے اور وہ

ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

اسلام میں اللہ کی راہ میں قتل ہو جانے اور شہادت پانے کی جتنی تعریف و توصیف کی گئی ہے اتنی کسی اور نیک عمل کی نہیں گئی۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"ہر نیکو کاری سے بڑھ کر ایک نیکو کاری ہے لیکن شہادت سے بڑھ کر اور کوئی نیکو کاری نہیں"

اِسلام کے ابتدائی دَور میں مسلمان آنحضرتؐ سے مغفرت کی دُعا کرنے کی درخواست کرتے تھے اور آپؐ کی دُعا کے نتیجے میں شہادت کا بلند درجہ حاصل کر لیتے تھے۔[1]

بذل و عطا

زندگی کو متوازن بنانے میں دولت جو کردار ادا کرتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس کی اہمیت کی بنا پر بہت سے لوگ دولت کو ہی زندگی سمجھتے ہیں اور ان کے ذہن میں مال و دولت کے علاوہ انسانی فضیلت اور شرافت کا کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ ان کی تمام تر سرگرمیوں کا مقصد فقط دولت جمع کرنا ہوتا ہے اور اس حرص و ہوس کے نتیجے میں وہ بُخل کی برائی میں گرفتار ہو کر دُوسروں کو (ان کے جائز حقوق سے) محروم کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ایک قدم آگے بڑھا کر رذیل اور لئیم بن جاتے ہیں اور خُود اپنے آپ کو بھی اپنے مال سے مستفید ہونے سے محروم کر دیتے ہیں۔ پھر وہ نہ خُود

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں فلسفۂ شہادت مؤلفہ مرتضیٰ مطہری۔ مطبوعہ جامعہ تعلیمات اسلامی

کھاتے ہیں اور نہ دوسروں کو دیتے ہیں بلکہ دولت جمع کرنے میں مگن رہتے ہیں۔

جو لوگ بُخل کی قابلِ نفرت عادت میں گرفتار ہوں (اور بلاشبہ لئیم لوگ ان سے بھی بدتر ہوتے ہیں) وہ انسانی فطرت سے بیگانہ اور زندگی کے بازار میں دیوالیہ ہو جاتے ہیں کیونکہ:

* وہ زندگی میں فقط اپنی خوشحالی اور نیک بختی چاہتے ہیں اور انفرادی زندگی پر اعتقاد رکھتے ہیں حالانکہ فطرتِ انسانی ہمیں بتاتی ہے کہ اجتماعی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے اور انفرادی زندگی خواہ کسی طرح بھی گزار دی جائے اس کا انجام شکست ہے۔
* اپنی قوّت کا اظہار کر کے محتاجوں اور بیکسوں کو اپنے سامنے عاجزی اور انکساری پر مجبور کرتے ہیں اور گو وہ تکلیف میں مبتلا لوگوں کی مدد کو نہیں پہنچتے لیکن انھیں مطیع اور غلام بنائے رکھتے ہیں اور بُت پرستی کی رُوح کو زندہ رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اولوالعزمی، شجاعت اور بلند ہمتی اور دُوسری انسانی خوبیاں معاشرے سے رخصت ہو جاتی ہیں۔
* فقط یہی نہیں کہ وہ لوگ مہر و محبت، انسان دوستی، ہمدردی اور خیر خواہی کے پاکیزہ جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں، بلکہ مختلف جرائم اور ہر قسم کی رذالت کو معاشرے میں رواج دیتے ہیں۔ کیونکہ بدگوئی، بدکرداری، چوری اور قتل جیسے جرائم کا سب سے طاقت ور طبیعی حامل وہ فقر و فاقہ ہے جو حاجتمند طبقے میں پایا جاتا ہے اور وہ غصّہ، کینہ اور انتقام کا جذبہ ہے جو پریشان حال لوگوں کے

دلوں میں دولت مندوں کے خلاف جاگزیں ہوتا ہے اور یہ بخیل اور لئیم اہلِ ثروت اسے ہوا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ درحقیقت ایک بخیل شخص معاشرے کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے اور ہر حالت میں خداوندِ عالم کے سخت غضب اور لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنتا ہے۔

قرآنِ مجید کی بہت سی آیات کنجوسی اور بُخل کی مذمّت میں اور اس کے برعکس بذل وعطا، خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور محتاجوں اور بیکسوں کی مدد کی تعریف میں نازل ہوئی ہیں۔

خداوندِ تعالیٰ اپنے کلام میں یہ وعدہ کرتا ہے کہ جو مال اس کی راہ میں خرچ کیا جائے وہ اسے دس گنا اور بعض حالات میں ستر گنا حتّیٰ کہ سات سو گنا تک بڑھا کر خرچ کرنے والے کو واپس لوٹا دے گا نیز تجربے سے بھی ثابت ہے کہ جو لوگ اپنا ہاتھ کھلا رکھیں، کریم النفسی کے ساتھ حاجتمند کی مدد کریں اور انسانی معاشرے میں جو کمی ہو اسے پورا کریں، ان کی دولت میں روز افزوں اضافہ ہوتا ہے۔ تاہم اگر اتفاق سے کبھی ان کے بُرے دن آ بھی جائیں تو سبھی ان سے ہمدردی کرتے ہیں اور انھوں نے دوسروں کی جو مدد کی ہو وہ ساری جمع ہو کر ان کے پاس لوٹ آتی ہے۔

اِس کے علاوہ شریف انسان اچھے کردار کی بدولت، اپنے ضمیر کو سکون بخشتے ہیں، وہ واجب اور مستحب حقوق کے بارے میں آسمانی احکام پر لبّیک کہتے ہوئے انسانیت کے پاک احساسات کو مہربانی، شفقت، انسانی دوستی اور خیر خواہی کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔ اِس طرح وہ ہر دلعزیزی اور سچّا احترام حاصل کرتے ہیں اور بالآخر بہت تھوڑی قیمت پر خُدا کی خوشنودی

اور دائمی نیک بختی سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

جہاد کے عام مسائل

جو کوئی بھی پیدا کیا گیا ہے وہ اپنی ہستی اور منفعت کا دفاع کرتا ہے اور دوسروں کی مانند اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے دفاع کی قوّت کا حامل ہوتا ہے۔ انسان اپنی خداداد فطرت کی بنا پر یہ سوچ رکھتا ہے کہ وہ ضرور اپنا دفاع کرے اور اس دشمن کو جو اُسے نابود کرنے کی فکر میں ہو اور کسی طرح دشمنی سے باز نہ آئے وہ اس کو نابود کردے۔ اسی طرح اگر کوئی اس کے اہم مفادات پر دست درازی کرے تو وہ اُٹھ کھڑا ہو اور جس طرح بھی ممکن ہو اسے ایسا کرنے سے روک دے۔

یہ فطری احساس جو ہر انسان کی طبیعت میں ثابت اور استوار ہے، انسانی معاشروں میں بھی ثابت اور استوار ہے یعنی جو دشمن، معاشرے کے لیے یا معاشرے کے افراد کے لیے خوف و خطرے کا موجب ہو وہ واجبُ القتل سمجھا جاتا ہے۔ جب سے انسان اور انسانی معاشرے وجود میں آئے ہیں، ان کے درمیان یہ خیال قائم اور برقرار رہا ہے کہ ہر فرد اور معاشرے کیلیے جائز ہے کہ اپنے جانی دشمن کے خلاف جو فیصلہ کرنا چاہے کرے اور سخت اقدامات عمل میں لائے۔

اسلام بھی ایک اجتماعی دین ہے اور اس کی بُنیاد توحید پر رکھی گئی ہے۔ یہ دین ان لوگوں کو جو سچّائی اور عدل سے سرتابی کریں اپنا جانی دشمن اور انسانیت کے نظام میں مخُل سمجھتا ہے اور ان کے لیے کسی انسانی عزّت واحترام کا قائل نہیں ہے۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو ایک آفاقی دین کی حیثیت سے پیش کرتا

ہے اور اس نے اپنے پیروؤں کے لیے کوئی وطن یا سرحد مقرّر نہیں کی، اِس لیے ہر وہ شخص جو شرک کے عقیدے میں گرفتار ہو اور واضح دلیل اور حکیمانہ نصیحتوں کے باوجود سچائی اور آسمانی احکام کو ماننے سے انکار کردے یہ اس سے جنگ کرتا ہے تاکہ وہ سچائی اور عدل کے مقابلے میں فروتنی اختیار کرے۔

جہاد کے بارے میں دینِ اسلام کے احکام کا خلاصہ یہی ہے اور یہ مکمّل طور پر اس روش کے مطابق ہے کہ جو ہر انسانی معاشرہ اپنی فطرت کی رُو سے اپنے جانی دشمنوں کے متعلق اختیار کرتا ہے۔

اسلام اپنے بداندیش دشمنوں کے پراپیگنڈے کے باوجود "تلوار کا دین" نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی شہنشاہانہ طریقہ نہیں جس کی واحد دلیل تلوار اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ ہو بلکہ یہ ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد خدا نے رکھی ہے، جو اپنے آسمانی کلام میں منطق اور عقل کے مطابق لوگوں سے خطاب کرتا ہے اور ان کو ایک ایسے دین کی دعوت دیتا ہے جو ان کی ساخت سے ہم آہنگ ہے

وہ دین کہ جس کی عام دعائے خیر "سلام" ہو اور واضح نصّ قرآن کے مطابق جس کا آفاقی پروگرام یہ ہو کہ

"صُلح بہرحال بہتر ہے۔" (سورۂ نساء۔ آیت ۱۲۸)

وہ دین ہرگز تلوار اور طاقت کا دین نہیں ہے۔

رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں جب کہ اسلام کی روشنی سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی اور مُسلمانوں کو بڑی اہم اور سخت جنگیں لڑنی پڑیں، مُسلمانوں کا جانی نقصان دوسو افراد سے زیادہ نہیں ہوا اور کُفّار کا نقصان

ایک ہزار افراد تک نہیں پہنچا[1] لہذا یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ اس دین کو تلوار کا دین کہا گیا ہے۔

اسلام میں جنگ کے مواقع

جن لوگوں سے اسلام جنگ کرتا ہے انھیں چند گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :

* الف * مُشرکین۔ یعنی وہ لوگ جو توحید، نبوّت اور قیامت کے قائل نہیں، اُنھیں پہلے اسلام کی دعوت دینی چاہیئے اور دین کے حقائق اتنی وضاحت سے سمجھانے چاہییں کہ کوئی نقطہ مبہم نہ رہ جائے اور عُذر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ پس اگر وہ دینِ حق کو قبول کرلیں تو دوسرے مسلمانوں کے دینی بھائی اور نفع ونقصان میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے اور اگر حق وصداقت واضح ہوجانے کے بعد بھی اُسے قبول نہ کریں اور اپنی ضد پر قائم رہیں تو اسلام ان کے مقابلے میں اپنا جہاد کا دینی فریضہ انجام دے گا۔

* ب * اہلِ کتاب (یہودی، عیسائی اور مجوسی) وہ لوگ ہیں جنھیں اسلام ایک دین اور آسمانی کتاب کا پیرو سمجھتا ہے اور وہ توحید، نبوّت اور قیامت کے قائل ہیں۔ اسلام نے انھیں اجازت دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو جزیہ ادا کرکے اسلام کی پناہ میں آجائیں

---

[1] ان ہزار اشخاص میں ۷۰۰ کا تعلق بنی قریظہ سے تھا جن کو خود انھی کے انتخاب کردہ فیصلے کے مطابق قتل کیا گیا۔

یعنی اسلام کی سرپرستی قبول کرلیں، اپنی آزادی برقرار رکھیں اور اپنے دینی احکام کے مطابق عمل کریں۔ اِس صورت میں ان کی جان، مال اور آبرو مسلمانوں کی طرح قابلِ احترام ہوتی ہے اور اس کے عوض وہ ایک معمولی سی رقم جزیے کے طور پر اسلامی مُعاشرے کو ادا کرتے ہیں۔ تاہم اُنھیں اِس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ غلط پراپیگنڈا کریں یا اسلام کے دشمنوں کی مدد کریں یا دُوسرے ایسے کام کریں جو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہوں۔

* ج * بغاوت اور فساد برپا کرنے والے لوگ۔ یعنی وہ مسلمان جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسلّح بغاوت کریں اور خوں ریزی کے مرتکب ہوں، اسلامی معاشرہ اُن کے خلاف جنگ کرتا ہے تاکہ وہ اطاعت قبول کریں اور فساد اور ہنگامہ آرائی سے باز رہیں۔

* د * دین کے دشمن جو اسلام کو مٹانے یا اسلامی حکومت کو تباہ کرنے کے لیے حملہ کریں۔ اس صورت میں سب مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنا دفاع کریں اور ان لوگوں کے ساتھ کافرِ حربی جیسا سُلوک کریں۔

اگر اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہو تو اسلامی معاشرہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ وقتی طور پر عدمِ تعرض کا معاہدہ کرسکتا ہے لیکن اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان لوگوں کے ساتھ دوستی کے ایسے روابط قائم کرے کہ ان کی گفتار اور ان کے طور طریقے مسلمانوں پر بُرا اثر ڈال کر ان کے خیالات اور اعمال کو بگاڑ دیں۔

جہاد اور دفاع سے فرار

میدانِ جنگ سے بھاگ نکلنے اور دشمن کو پیٹھ دکھانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ بھاگنے والا شخص اپنی جان کو معاشرے کی زندگی سے زیادہ قیمتی اور عزیز سمجھتا ہے اور درحقیقت یہ فعل دینی مقدّسات اور قوم کی جان، مال اور آبرو کو ایک ایسے دشمن کے حوالے کرنا ہے جس سے انھیں ہر لحاظ سے خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاد اور دفاع سے فرار کو گناہِ کبیرہ شمار کیا گیا ہے اور خُدا نے اپنے کلام میں بھگوڑے کے لیے صریحاً دوزخ کا وعدہ کیا۔ چُنانچہ فرماتا ہے:

"جو شخص جہاد اور دفاع میں دُشمن کو پیٹھ دکھاتا ہے اور لوٹ جاتا ہے وہ خُدا کے غضب کے ساتھ لوٹتا ہے اور اس کی بازگشت دوزخ کی طرف ہے بجز اس کے کہ ایک طرف کو ہٹ جائے تاکہ بہتر طور پر لڑ سکے یا لوٹ آئے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کرے۔"

(سورۂ انفال - آیت ۱۶)

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے اس کی رُو سے اسلامی معاشرے اور مسلمانوں کی سرزمین کا دفاع اہم ترین اسلامی واجبات میں سے ہے۔

ان دلاور مردوں کی داستان جو اسلام کے ابتدائی ایّام میں جان ہتھیلی پر رکھ کر خونیں جنگوں میں شریک ہوتے تھے اور ان شہیدوں کی روئیداد جو اپنے خون میں لتھڑ جاتے تھے، بے حد حیرت انگیز اور ساتھ ہی ساتھ

سبق آموز بھی ہے۔ یہی وہ بزرگوار تھے جنھوں نے اپنے پاک لہو اور چاک چاک جسموں کے ساتھ اِس مقدّس دین کی بُنیاد مستحکم کی۔

مُعاشرے کے داخلی دشمنوں سے جنگ

جس طرح فطرت کے حکم کے مطابق یہ ضروری ہے کہ معاشرے کے خارجی دشمنوں سے لڑا جائے اور ممکنہ نقصان کے مقابل معاشرے کا دفاع کیا جائے، اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ معاشرے کے داخلی دشمنوں سے جنگ کی جائے۔ مُعاشرے کا داخلی دشمن وہ شخص ہے جو عام روش اور رائج الوقت قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے اور یُوں مُعاشرے کی زندگی تباہ کرتا ہے اور عام نظام میں خلل ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم و نسق چلانے کے لیے جو ادارے تشکیل دیے جاتے ہیں ان میں سیکوریٹی فورسز رکھی جاتی ہیں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے مختلف سزائیں تجویز کی جاتی ہیں۔

اسلام نے انتظامی اختیارات اور مختلف سزاؤں کے علاوہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ معاشرے کے تمام افراد کے لیے فرض اور واجب قرار دیا ہے اور اس طرح مقابلے کو زیادہ عمومی اور زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔ اسلام اور دوسرے معاشرتی قوانین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دُوسرے قوانین میں فقط لوگوں کے اعمال اور افعال کی اصلاح کی جانب توجّہ دی گئی ہے جب کہ اسلام نے لوگوں کے اعمال کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق کا خیال بھی رکھا ہے اور دونوں مرحلوں پر بُرائی کے خلاف جنگ کی ہے۔

جن گناہوں کا ارتکاب اسلام نے حرام قرار دیا ہے وہ وہی اعمال ہیں جن کا

اثر معاشرے پر بہت بُرا پڑتا ہے اور جن کے نتائج ناخوشگوار نکلتے ہیں، اس کے باوجود ان میں سے بعض ایسے ہیں جو براہِ راست اس فرد کو یا ان افراد کو بگاڑتے ہیں جو ان کے مرتکب ہوتے ہیں اور بالواسطہ معاشرے میں رخنہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایک خاص مقام تک محدود زخموں اور عضوی عارضوں کی ہوتی ہے جو انسان کے بدن میں پیدا ہوتے ہیں بہت سے گناہ جو بندگی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور خُدائی حقوق کو ضائع کرتے ہیں (مثلاً نماز نہ پڑھنا اور روزہ نہ رکھنا) اسی زُمرے میں آتے ہیں۔

بعض گناہ ایسے بھی ہیں جو اجتماعی زندگی کے لیے براہِ راست خطرے کا موجب ہیں اور وہ معاشرے کے ڈھانچے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کی مثال ان بیماریوں کی ہے جو انسان کی زندگی سے براہِ راست تعلّق رکھتی ہیں اور زندگی کا رشتہ توڑ دیتی ہیں، جھُوٹ اور اِفتراء اسی قسم کے گناہ ہیں اور اسلام کے نقطۂ نگاہ کے مطابق والدین کے حقوق کی عدمِ ادائیگی۔ غیبت اور دُوسروں کی آبرو پر حملہ کرنا بھی اسی زُمرے میں آتے ہیں۔

حق کا دِفاع

ایک اور دفاع جو مسلمانوں کے وطن کے دفاع سے زیادہ عمیق اور وسیع ہے، وہ حق کا دفاع ہے جو اسلام کا واحد ہدف ہے۔ اس خُدائی حکم کا بُنیادی مقصد حق اور حقیقت کی بحالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پاک مذہب کو دینِ حق کہا گیا ہے۔ یعنی وہ دین جو برحق ہے، جس میں حق کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں اور جو حق کے علاوہ کسی چیز کو اپنا ہدف قرار نہیں دیتا۔

خُدا اپنی اس کتاب کی تعریف میں جس میں تمام حقائق جمع ہیں یوں ارشاد

فرماتا ہے:

"قرآن مجید حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اس راستے کی طرف جس میں کوئی تناقض اور تضاد نہیں ہے۔"

(سورۂ احقاف۔آیت ۳۰)

یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ حق کی پیروی کرے، حق کہے، حق سُنے اور اپنی تمام قوّتوں کے ساتھ اور جس طرح بھی بن پڑے حق کا دفاع کرے۔

قتلِ نفس

ایک اور ظالمانہ اقدام کہ جسے اسلام میں بے حد ناپسندیدہ اور قابلِ مذمّت قرار دیا گیا ہے وہ قتلِ نفس اور کسی بے گناہ کو موت کے گھاٹ اُتارنا ہے۔

قتلِ نفس کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور خُدا اپنے کلام میں ایک انسان کے قتل کو تمام بنی نوعِ انسان کو قتل کرنے کے برابر قرار دیتا ہے اور یہ اس معنیٰ میں ہے کہ کسی انسان پر حملہ دراصل انسانیت پر حملہ ہوتا ہے اور انسانیت ایک نفر میں اور ہزار نفر میں برابر ہوتی ہے۔

یتیم کا مال غصب کرنا

جس طرح لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا عقل اور شرع کی رُو سے پسندیدہ چیز ہے، اسی طرح خدا کے بندوں کے ساتھ بدی کرنا بھی ناجائز اور قابلِ مذمّت ہے۔ اسلام میں ظلم اور استحصال کی چند اقسام سے بڑی سختی کے

ساتھ منع کیا گیا ہے اور ان میں سے ایک "یتیموں کا مال غصب کرنا" ہے۔

اسلام نے یتیم کا مال کھانے کو ایک گناہِ کبیرہ قرار دیا ہے اور قرآنِ مجید میں بالصراحت بتایا گیا ہے کہ جو شخص یتیم کا مال کھاتا ہے وہ درحقیقت آگ کھاتا ہے اور جلد ہی بھڑکتی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ ائمہ طاہرینؑ کے ارشادات سے پتا چلتا ہے کہ اس تاکید کا سبب یہ ہے کہ اگر ایک بالغ شخص کے ساتھ زیادتی ہو تو ممکن ہے کہ وہ لڑے جھگڑے اور اپنے حق کا دفاع کرے لیکن ایک کم عمر یتیم بچّے کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔

خدا کی رحمت سے نااُمّیدی

اسلام میں خطرناک ترین گناہوں میں سے ایک گناہ خُدا کی رحمت سے نااُمّیدی ہے۔

خُداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے میرے بندو کہ جنھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے خُدا کی رحمت اور معافی سے نااُمّید نہ ہو اور اگر تم توبہ کرو تو خُدا ہر گناہ بخش دیتا ہے کیونکہ خُدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

(سورۂ زُمر۔ آیت ۵۴)

ایک اور مقام پر خداوند تعالیٰ اپنی رحمت سے نااُمّید ہونے والے کو کافر قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص خدا کی رحمت سے نااُمّید ہو جائے تو اس کے اندر کوئی ایسا محرّک نہیں رہ جاتا کہ جس کی بدولت وہ اچھے اور پسندیدہ کام انجام دے یا چھوٹے بڑے گناہوں اور ناروا کاموں سے اجتناب برتے۔ کیونکہ دونوں چیزوں کا اصلی محرّک "رحمت کی اُمّید اور

خُدا کے عذاب سے نجات" ہے اور یہ امّید اس شخص کے اندر موجود نہیں ہوتی۔ چنانچہ دلی کیفیت اور اندرونی صفات کے لحاظ اس شخص میں اور ایک ایسے شخص میں جو کسی دین اور قانون کا پابند نہ ہو رتّی بھر فرق نہیں ہوتا۔

غیظ و غضب

غصّہ انسان کی ایک ایسی کیفیت ہے جس کے ظاہر ہونے پر وہ انتقام پر تل جاتا ہے اور انتقام لینے پر اسے اندرونی راحت ملتی ہے۔ چنانچہ اگر انسان اس حالت میں اپنے نفس پر قابو پانے میں رتّی بھر سُستی بھی برتے تو اس کی عقلِ سلیم فوراً غیظ و غضب سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ پھر ہر بُرا اور ناجائز کام اُسے دُرست نظر آتا ہے اور نوبت یہاں تک آ پہنچتی ہے کہ اس حالت میں وہ ہر درندے سے زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے۔

اسلام میں اس حالت کے ہیجان پر قابو پانے کی بے حد تاکید کی گئی ہے اور اس سے مغلوب ہونے کی مذمّت کی گئی ہے۔ خُدا ایسے لوگوں کو بہت پسند کرتا ہے جو طیش پر قابو پا لیتے ہیں اور غیظ و غضب کی حالت میں بُردباری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ایسے لوگ بھی ہیں جو غصّے پر قابو پا لیتے ہیں اور لوگوں سے عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔" (سورۂ آلِ عمران - آیت ۱۳۴)

اہلِ ایمان کی علامت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

"اہلِ ایمان وہ ہیں جنھیں غصہ آتا ہے تو درگزر کر دیتے ہیں۔" (سورۂ شوریٰ - آیت ۳۷)

رشوت

اگر کوئی شخص کسی معاملے میں فیصلہ دے یا ایسا کام انجام دے جو اس کے فرائض میں شامل ہو اور اس کے بدلے میں نقدی یا کوئی تحفہ قبول کرے تو اسے رشوت کہا جاتا ہے۔

اسلام میں رشوت کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والا اجتماعی دینی خوبیوں (مثلاً عدالت) سے محروم ہو جاتا ہے اور عذابِ خداوندی کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس بارے میں کتاب و سنت میں صراحت کی گئی ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے رشوت دینے والے، رشوت لینے والے اور اس شخص پر جو ان کے درمیان رابطے کا کام دے لعنت بھیجی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"فیصلہ دینے کے سلسلے میں (قاضی کا) رشوت لینا خُدا سے کفر کرنے کے برابر ہے۔"

بلاشبہ یہ سب مذمّت اس رشوت کی ہے جو صحیح فیصلہ کرنے اور عادلانہ عمل انجام دینے کے لیے لی جائے اور جو رشوت غلط فیصلہ کرنے اور ظالمانہ عمل انجام دینے کے لیے لی جائے وہ تو اور بھی بڑا گناہ ہے اور اس کی سزا بھی زیادہ سخت ہے۔

چوری

چوری ایک مذموم اور ناجائز پیشہ ہے جو معاشرے کے مالیاتی تحفّظ کے لیے خطرے کا موجب ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کا اوّلین

سامان وہ مال و اسباب ہے جو اس کے عمر بھر کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے گرد معاشرتی تحفظ کا ایک حصار کھینچ لیتا ہے تاکہ وہ ہر قسم کی زیادتی اور تجاوز سے محفوظ رہے اور معاشرے کی زندگی کا سہارا بن سکے۔ بلاشبہ اس حصار کو توڑنا اور امن و امان میں خلل ڈالنا ایک شخص کی عمر کو اکارت کرنا ہے جو اس دولت کے کمانے میں صرف ہوئی ہے۔ نیز یہ عام لوگوں کی سرگرمیوں کے ایک بڑے حصے کو معطل کرنے اور ان کے ہاتھ کاٹ دینے کے مترادف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس قابلِ نفرت عمل (جس کے خیانت ہونے کی چور کا ضمیر خود گواہی دیتا ہے) کی سزا یہ مقرر کی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ (یعنی دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں کاٹ دی جائیں)۔

خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"چور (مرد ہو یا عورت) اس کا ہاتھ کاٹ دو اور اسے اس کے کیفرِ کردار تک پہنچا دو۔" (سورۂ مائدہ۔ آیت ۳۸)

ناپ تول میں کمی کرنا

اسلام کی نگاہ میں کم تولنا گناہِ کبیرہ ہے۔ کلامِ مجید میں اس گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کو سرزنش کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"وائے ہو کم فروشوں پر ..... کیا یہ نہیں جانتے کہ وہ ایک بڑے دن میں اٹھائے جائیں گے۔ (سورۂ تطفیف۔ آیات ۱-۵)

کم فروش تاجر لوگوں پر ظلم کرنے اور چوری کے ذریعے ان کے مال پر قبضہ جمانے کے باعث لوگوں کا اعتماد کھو بیٹھتا ہے اور بتدریج گاہکوں سے

اور بالآخر اپنے سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

اسلام میں گناہوں کی سزا

اسلام نے اس قسم کے بُرے اعمال کو گناہ کبیرہ کا نام دیا ہے اور خدا نے ان گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کو اپنے کلام میں صریح طور پر عذاب کی وعید دی ہے۔

اِس کے علاوہ کہ ان میں سے بعض گناہوں کی سخت سزائیں مقرّر کی گئی ہیں، اسلام نے ان کا ارتکاب کرنے والوں کا (اگرچہ وہ یہ گناہ ایک دفعہ ہی انجام دیں) عدالت کا اعزاز منسوخ کر دیا ہے، یعنی ان کا انسانی معاشرے کے ایک صالح رکن ہونے کا رُتبہ سلب کر لیا ہے۔

جو شخص گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو وہ اپنی عدالت کھو دیتا ہے اور ان مراتب سے محروم ہو جاتا ہے جن سے معاشرے کے ارکان میں سے ایک صالح رکن بہرہ مند ہوتا ہے۔ وہ حکومت اسلامی کے مختلف کاروبار میں سے کسی کا نظم و نسق نہیں سنبھال سکتا۔ چنانچہ نہ تو وہ سرکاری عہدہ حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی امامِ جماعت ہو سکتا ہے۔ اس کی شہادت کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اور وہ کسی کے خلاف قبول نہیں کی جا سکتی۔ وہ جب تک توبہ نہ کرے اور مسلسل پرہیزگاری سے اپنے اندر عدالت کی صفت دوبارہ نہ پیدا کر لے اس کی یہی حالت رہتی ہے۔

کام اور ہنر کی اہمیت

کام اور محنت وہ بنیاد ہے جس پر کائنات کا نظام قائم ہے اور یہی ہر

پیدا کی گئی چیز کی بقا کا ضامن ہے۔ خدا نے اپنی مخلوق کے ہر فرد کے حسب حال اسے وسائل مہیّا کیے ہیں، جنھیں بروئے کار لاکر وہ فوائد حاصل کرسکتا ہے اور اپنے آپ کو نقصان سے بچا سکتا ہے۔

کل اپنے مُریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے !
قیمت میں یہ معنی ہے درِ ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچّے نہیں خوددار و ہنرمند
اقبالؔ

اِنسان کو جو کہ قُدرت کی سب سے زیادہ پُراسرار مخلوق ہے اور جس کی ضروریات بھی دوسری مخلوق سے زیادہ ہیں، اسے زیادہ دوڑ دھوپ کی ضرورت بھی ہے تاکہ وہ اپنی بے شمار حاجتیں پوری کرسکے اور خاندان کے نظام کو برقرار رکھ سکے جو اسے قدرتی طور پر تشکیل دینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ اسلام نے جو ایک فطری اور اجتماعی دین ہے، کام اور محنت کو واجب قرار دیا ہے۔

جیساکہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے :

"زندگی کی ضروریات پوری کرنے اور گزر بسر کے لیے رزقِ حلال کمانا ہر مسلمان مرد اور عورت پر واجب ہے۔"

(بحار الانوار۔ جلد ۲۳۔ صفحہ ۶)

اسلام کی نظر میں بیکار رہنے والوں کی کوئی اہمیّت نہیں ہے۔ جب رسول اکرمؐ کسی ایسے شخص کو دیکھتے جس کی طاقت اور توانائی آپؐ کے لیے تعجّب کا موجب ہوتی تھی تو آپؐ دریافت فرماتے تھے :

"کیا یہ شخص کوئی کام کاج کرتا ہے ؟"

اگر آپؐ کو جواب نفی میں دیا جاتا تو آپ فرماتے تھے :

"یہ ہماری نگاہ سے گر گیا ہے۔"

یعنی ایک بیکار آدمی کی آنحضرتؐ کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔

(مستدرک الوسائل۔ جلد ۲ ۔ صفحہ ۵۰۱)

اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہر انسان کو چاہیے کہ اپنی پسند اور ذوق کے مطابق ان مختلف پیشوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے، جن کی ہدایت خُدا نے انسانی ذہن کو فرمائی ہے، اس طرح وہ اپنی روزی کمائے اور معاشرے کے بوجھوں میں سے ایک بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لوگوں کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے۔

خداوندِ عالم فرماتا ہے :

"انسان فقط کوشش اور محنت کے ذریعے کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔"

(سورۂ نجم ۔ آیت ۳۹)

المختصر اسلام نے محنت اور کوشش کرنے اور قوّتِ بازو سے روزی کمانے کی بے حد تاکید کی ہے ؎

اپنی قوّت سے قوت حاصل کر

مفت خوری حرام خوری ہے

(اسمٰعیل میرٹھی)

اسلام نے سخت ترین لمحوں میں بھی اقتصادی سرگرمیوں کو فراموش نہیں کیا۔ حتّیٰ کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے جس کا نام ہشام تھا، یوں ارشاد فرمایا :

"جس دن سپاہی ایک دوسرے کے مقابلے میں صفیں باندھے کھڑے ہوں اور جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں اس دن بھی تم اپنے اقتصادی فریضے اور روزی کمانے کیلیے ضروری کوشش کو نظر انداز نہ کرو اور ان مشکل حالات میں بھی اپنی مالی کوششیں جاری رکھو۔"

(وسائل الشیعہ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۰۱)

یہی وجہ ہے کہ سُستی کی وجہ سے بیکار رہنے کی اسلام میں سخت ممانعت کی گئی ہے۔

بیکاری کی مذمّت

جو کچھ اُوپر بیان کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ کام اور محنت ایک ایسا راستا ہے جو قدرت نے انسان کو دکھایا ہے تاکہ وہ اس پر چل کر نیک بختی کی زندگی گزار سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیق اور فطرت کے راستے سے انحراف خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو انسان کو لازماً نقصان پہنچاتا ہے اور جب ایسی چیز سے انحراف کیا جائے کہ جس پر زندگی کے نظام کی بنیاد قائم ہے تو دُنیا اور آخرت کی بدبختی کے علاوہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

اِسی بنا پر امام موسٰی کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں :

"کاموں میں سستی اور تھکاوٹ کا اظہار نہ کرو ورنہ دنیا اور آخرت دونوں کھو بیٹھو گے۔"

رسولِ اکرمؐ نے ان لوگوں پر لعنت فرمائی ہے جو بیکاری کی عادت ڈال کر اپنی زندگی کا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔

آج کل نفسیاتی اور معاشرتی تحقیق سے بخوبی واضح ہو گیا ہے کہ اجتماعی خرابیوں کے بڑے حصّے کی وجہ بیکاری ہے۔ یہ بیکاری ہی ہے جو معاشرے کے اقتصادی اور تہذیبی پہیّے کو گھومنے سے باز رکھتی ہے اور ہر قسم کی اخلاقی گراوٹ اور توہّم پرستی کو رواج دیتی ہے۔

کھیتی باڑی اور اس کے فوائد

کھیتی باڑی کہ جس کے ذریعے معاشرے کو کھانے پینے کا سامان مہیّا ہوتا ہے، اپنی اہمیت کی بنا پر سب سے زیادہ پسندیدہ انسانی پیشہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اس پیشے کو اختیار کرنے کی بے حد تاکید کی گئی ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"جو مسلمان درخت لگائے یا سبزی اُگائے کہ جسے انسان پرندے اور چرندے کھائیں، اسے صدقے کا اَجر ملتا ہے۔"

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"کوئی ایسا کام نہیں جو زراعت سے بہتر ہو اور جس کا فائدہ اس کے مقابلے میں زیادہ عام ہو۔ کیونکہ اچھّے اور بُرے لوگ نیز چرندے اور پرندے سبھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور زبانِ حال سے دعائیں دیتے ہیں۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"قیامت کے دن کسانوں کا مقام ہر مقام سے بلند تر ہوگا۔"

مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ اپنی فطری قوت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ

اُٹھائیں۔ یہاں تک کہ ایک معصومؑ فرماتے ہیں:

"اگر دنیا کے معدوم ہونے اور نظامِ شمسی کے ٹوٹ پھوٹ جانے کی گھڑی آپہنچے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں ایک پودا ہو اور اسے لگانے کی مہلت ہو تو اسے لگا دو۔ یعنی دُنیا کے معدوم ہونے کا خوف تمھیں اس نیک کام کے انجام دینے سے باز نہ رکھے۔" (مستدرک الوسائل۔ جلد ۲ صفحہ ۵۰۱)

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص پانی اور مٹی (یعنی طبیعی وسائل) رکھتا ہو، مگر اپنی انسانی قوّت کو اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے کام میں نہ لائے اور تنگدستی کی حالت میں بھیک مانگ کر گزر بسر کرے اُس پر خُدا کی لعنت ہو۔" (بحار الانوار۔ جلد ۲۳ صفحہ ۱۹)

خُود اِعتمادی

اِعتقادات کے باب میں بارہا اس چیز کا ذکر کیا گیا ہے کہ اسلام کا آفاقی پروگرام یہ ہے کہ انسان خُدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرے اور کائنات کے پروردگار کے سوا کسی کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرے۔ سبھی کا پیدا کرنے والا اور پالنے والا خدا ہے اور سبھی اس کی دی ہوئی روزی کھاتے ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں بجز ان کے جو خُدا کی طرف متوجّہ ہوں۔

ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اپنے نفس پر اعتماد رکھے اور آزادی کا جو تحفہ خدا نے اسے دیا ہے اس سے فائدہ اٹھائے یعنی جو وسائل اس نے

اسے عطا کیے ہیں انھیں کام میں لائے اور زندگی کا راستہ طے کرے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دوسروں سے امّید لگائے رکھے، کسی کو خُدا کا شریک ٹھہرائے اور ہر روز ایک نیا بُت تراشے۔ ایک خادم کو جاننا چاہیے کہ وہ مخدوم کی نہیں بلکہ اپنی روٹی کھاتا ہے۔ مزدور کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی محنت کی اُجرت لیتا ہے، آجر اس پر مُفت میں احسان نہیں کرتا۔ ہر ملازم کا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ وہ حکومت یا مُعاشرے سے تعلّق رکھنے والے ادارے یا اس کے سربراہ کا عطیہ اور ہدیہ نہیں لیتا بلکہ اپنے کام کی مزدوری لیتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ایک آزاد انسان کو ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خُدا کے علاوہ کسی سے امّیدیں وابستہ کرے اور اس کے آگے سر جھکائے۔ ورنہ اس کے باطن میں وہی پستی اور شرک کی وہی غلامی موجود ہوگی جو بُت پرستوں میں بظاہر دیکھنے میں آتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نفس پر اعتماد سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں اپنی ذاتی لیاقت کو کام میں لائے اور دوسروں پر بھروسا کرکے نہ بیٹھ رہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خدا سے اپنا تعلق توڑ لے اور خود اپنے آپ کو ہر امید اور آرزو کا مختار اور حقیقی صاحبِ تاثیر سمجھنے لگے۔

دُوسروں کے سہارے پر جینے کے نُقصانات

دُوسروں کے سہارے جینا درحقیقت انسانی اِفتخار اور آزادی کے شرف کو کھو دینا ہے، کیونکہ یہ ان تمام سماجی برائیوں کا سرچشمہ ہے جو ذلّت اور

پستی سے جنم لیتی ہیں۔

جو شخص دوسروں کے بھروسے پر بیٹھا رہے اور ہر کس و ناکس کا دست نگر ہو، وہ درحقیقت اپنے ارادے اور شعور کو دُوسروں کے ہاتھوں بیچ ڈالتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ ان کی خوشامد کرے اور جو کچھ وہ چاہیں اور کہیں (خواہ وہ چیز سچ ہو یا جھوٹ اور خواہ اچھی ہو یا بُری) اسے انجام دے، ہر ذلّت برداشت کرے، غیروں کی اطاعت کرے، ہر ظلم اور ہر ناجائز چیز پر راضی ہو اور بالآخر تمام اسلامی قواعد و ضوابط کو بیکار سمجھے۔

ضرورت کے بغیر دوسروں سے سوال کرنا اسلام میں حرام ہے اور فقراء کی مالی امداد کہ جو اسلامی احکام کا جزو ہے، وہ فقط ان تنگدست لوگوں کے لیے ہے، جن کی کمائی ان کے اخراجات کے برابر نہ ہو یا جو کام کاج کرنے کے قابل نہ رہے ہوں۔

اَحکام

جیسا کہ ہم نے کتاب کے شروع میں کہا ہے، اسلام کی تعلیمات کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے کا تعلّق اِعتقادات سے، دوسرے کا اخلاق سے اور تیسرے کا احکام سے ہے۔

عقائد اور اخلاق کے بارے میں تو ہم مختصراً عرض کر چکے ہیں، اَب ہم احکام سے متعلق چند باتیں مختصر طور پر پیش کر رہے ہیں۔

خُدا کو پہچاننے کے بعد ہمارے لیے لازم ہے کہ نماز اور روزے جیسے اعمال بجالائیں کہ جو بندگی اور فرماں برداری کی نشانی ہیں۔ چنانچہ پہلے ہم نماز کے احکام بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد روزے کے احکام کی تشریح کریں گے۔

نماز

قرآن میں ارشاد ہے:

"جب دوزخیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمھیں کس چیز نے دوزخی بنایا؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دُنیا میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔" (سورۂ مدّثّر - آیت ۴۲-۴۳)

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"نماز دین کا ستون ہے۔ اگر نماز خدا کی بارگاہ میں قبول ہوجائے تو دوسری عبادتیں بھی قبول ہوجاتی ہیں اور اگر یہ قبول نہ ہو تو دوسری عبادتیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔"

جس طرح دن رات میں پانچ مرتبہ نہر میں نہانے دھونے سے بدن پر میل کچیل نہیں رہتی اسی طرح پنجگانہ نماز بھی انسان کو گناہوں سے پاک کردیتی ہے، البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ شخص جو نماز پڑھے لیکن اسے اہمیّت نہ دے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو نماز نہ پڑھتا ہو۔

خُدا قرآنِ مجید میں فرماتا ہے:

"وائے ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔" (سورۂ ماعون - آیت ۴-۵)

ایک دن رسولِ اکرمؐ مسجد میں تشریف لائے تو آپؐ نے ایک شخص کو نماز پڑھتے دیکھا جو رکوع اور سجود مکمل طور پر انجام نہیں دے رہا تھا۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا:

"اگر یہ شخص اس حالت میں مرجائے تو بحیثیت مسلمان نہیں مرے گا۔"

لہٰذا مسلمان کو چاہیے کہ نماز خضوع اور خشوع کے ساتھ بجالائے اور نماز پڑھتے وقت یہ دھیان رکھے کہ وہ کس سے باتیں کر رہا ہے۔ پھر رکوع،

سجود اور دوسرے اعمال صحیح طور پر انجام دے تاکہ نماز کے شاندار نتائج سے بہرہ مند ہو سکے۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"نماز انسان کو بُرے اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے۔" (سورۂ عنکبوت۔ آیت ۴۵)

بلاشبہ ایسا ہی ہے کیونکہ نماز کے آداب اس طرح کے ہیں کہ اگر نماز پڑھنے والا ان کی رعایت کرے تو کبھی بھی برائیوں کا مرتکب نہ ہو۔

مثلاً نماز کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ نمازی کے نماز پڑھنے کی جگہ اور اس کے کپڑے غصبی نہ ہوں حتیٰ کہ اگر اس کے کپڑے میں ایک تار بھی غصبی ہوگا تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی۔ پس جو نمازی اس ذرہ بھر حرام سے بھی اجتناب برتنے پر مجبور ہو، اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ حرام مال میں تصرّف کرے یا کسی کا حق ضائع کرے۔ علاوہ ازیں نماز اس صورت میں قبول ہوتی ہے، جب آدمی حرص، حسَد اور دوسری ناپسندیدہ صفات سے پاک ہو۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تمام برائیوں کا منبع یہی گھٹیا صفات ہیں۔ پس جو نمازی ان مذموم صفات سے کنارہ کشی کرلے وہ یقیناً تمام برائیوں سے اجتناب برتے گا۔

اگر بعض لوگ نماز پڑھنے کے باوجود ان بُرے کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نماز کے بارے میں ضروری احکام پر عملدرآمد نہیں کرتے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کی نماز قبول نہیں ہوتی اور وہ اس کے عظیم فوائد سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔

شارعِ مقدّس نے نماز کو اس قدر اہمیّت دی ہے کہ اُسے ہر حالت،

حتیٰ کہ قریب المرگ ہونے پر بھی واجب قرار دیا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص حمد، سورہ اور نماز کے اذکار زبان سے ادا نہ کرسکے تو اسے چاہیے کہ انھیں دل سے گزارے اور اگر نماز کے دوران کھڑا نہ ہوسکے تو بیٹھ کر پڑھے اور اگر بیٹھ کر بھی نہ پڑھ سکے تو لیٹ کر پڑھے۔ غرض یہ کہ نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہے اور اگر کوئی شخص جنگ کی حالت میں یا دشمن کے خوف سے یا اضطرار اور ناچاری کی بنا پر رُو بقبلہ ہوکر نماز نہ پڑھ سکے تو قبلہ کی طرف توجّہ ساقط ہے تاہم اسے چاہیے کہ نماز ہر حالت میں ادا کرے۔

واجب نمازیں

چھ نمازیں واجب ہیں:۔

۱۔ روزانہ کی نماز

۲۔ نمازِ آیات

۳۔ نمازِ میّت

۴۔ کعبہ کے واجب طواف کی نماز

۵۔ ماں باپ کی قضا نمازیں جو بڑے بیٹے پر واجب ہیں۔

۶۔ وہ نماز جو اجارہ، نذر، قسم یا عہد کی بنا پر واجب ہوجاتی ہے۔

مقدّماتِ نماز

نماز پڑھنے یعنی پروردگارِ عالم کی بارگاہ میں حاضری دینے، اس ذاتِ اقدس کے سامنے بندگی کا اظہار کرنے اور اس کی پرستش کرنے کے

لیے کچھ ضروری مقدّمات ہیں کہ جن کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی۔
وہ مقدّمات یہ ہیں :۔

۱ * طہارت
۲ * وقت
۳ * لباس
۴ * مکان
۵ * قبلہ

اِن مقدّمات کی تفصیل بالترتیب نیچے درج کی جاتی ہے :۔

اَوّل - طہارت

نمازی کو چاہیے کہ وہ نماز کی حالت میں باطہارت ہو یعنی اپنے وظیفے کے مطابق وضو، غسُل یا تیمّم کے ساتھ نماز پڑھے اور اس کا بدن اور لباس نجاست سے آلودہ نہ ہو۔

نجاستیں

کئی ایک چیزیں نجس ہیں اور مندرجہ ذیل ان میں شامل ہیں :۔
۱ــ و ۲ــ پیشاب اور پاخانہ [۱]

---

[۱] پیشاب خارج ہونے کی جگہ فقط پانی سے پاک ہوسکتی ہے۔جہاں تک مقعد کا تعلّق ہے اسے یا تو پانی سے دھویا جاسکتا ہے یا پتھر، کاغذ، ٹوائلٹ پیپر وغیرہ کے تین ٹکڑوں سے پاک کیا جاسکتا ہے۔لیکن یہ اس صورت میں ہے جب پاخانہ اپنے خارج

حرام گوشت حیوان جو خونِ جہندہ رکھتا ہو یعنی اگر اس کی رگ کاٹی جائے تو خُون اُچھل کر نکلے مثلاً بلی، لومڑی اور خرگوش وغیرہ کا پیشاب اور پاخانہ نجس ہے، بلکہ اگر کوئی پرندہ یا حیوان نجاست کھانے کی وجہ سے حرام گوشت ہوجائے تو اس کا پیشاب اور پاخانہ بھی نجس ہے۔

۳ — خونِ جہندہ رکھنے والے حیوان کا مُردار خواہ وہ حلال گوشت ہو یا حرام گوشت ہو لیکن مردہ حیوان کے وہ اجزا پاک ہیں جن میں رُوح نہ ہو جیسے پشم، بال اور ناخن وغیرہ۔

۴ — خون جہندہ رکھنے والے حیوان کا خُون، خواہ وہ جانور حلال گوشت ہو یا حرام گوشت ہو۔

۵ — و ۶ — خشکی پر رہنے والا کتا اور سُوّر [1]

۷ — شراب اور ہر وہ بہنے والی چیز جو انسان کو مست کردے۔

۸ — فقاع یعنی جَو کی شراب [2]

ہونے کے مقام سے اِدھر اُدھر پھیل نہ جائے۔ ورنہ وہ جگہ پانی کے بغیر پاک نہیں ہو سکتی۔

اِس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر پاخانہ مثلاً پتھر کے تین ڈھیلوں سے پورا صاف نہ ہو تو پھر اتنے ڈھیلوں کا اضافہ کرنا چاہیے کہ مقعد مکمّل طور پر پاک ہو جائے۔

[1] آبی کُتّا اور سُوّر پاک ہیں۔

[2] مَاءُ الشّعیر یعنی جَو کا پانی جو طبّی اُصولوں کے مطابق حاصل کیا جاتا ہے، پاک ہے۔

مُطَہِّرات

ہر اس چیز کو جس کے ذریعے نجاست دور ہوتی ہے مُطَہِّر کہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں :۔

۱۔ **پانی** : یہ ہر اس چیز کو جو نجس ہوگئی ہو پاک کردیتا ہے۔ لیکن ایس صورت میں ہے کہ پانی مطلق ہو۔ اگر پانی مضاف ہو مثلاً تربوز، گلاب یا کیوڑے کا پانی ہو تو اس سے نجاست پاک نہیں ہوتی اور اس سے وضو اور غسل کرنا بھی صحیح نہیں ہے[۱]

۲۔ **زمین** : یہ جوتے کے تلوے اور پاؤں کے تلوے وغیرہ کو پاک کردیتی ہے۔

۳۔ **سُورج** : یہ نجس زمین اور چٹائی وغیرہ کو جو اس کی دھوپ سے خشک ہوجائے پاک کردیتا ہے۔

۴۔ **اِستحَالہ** : جب نجس چیز کی جنس بدل جائے اور وہ پاک چیز کی شکل

---

[۱] پانی دو قسم کا ہوتا ہے : کُر اور قلیل۔
آبِ کُر تقریباً ۳۸۴ لیٹر ہوتا ہے اور اگر اس میں نجاست مل جائے تو وہ نجس نہیں ہوتا۔
آبِ قلیل وہ پانی ہے جو کُر سے کم ہو اور اگر اس میں نجاست مل جائے تو نجس ہوجاتا ہے۔ اس کے پاک ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جاری پانی یا بارش کے پانی سے متصل ہو یا اس میں ایک کُر پانی کا اضافہ کیا جائے۔

اختیار کرلے مثلاً کتا نمک زار میں گر کر نمک بن جائے تو وہ پاک ہے۔

۵۔ اِنتِقال : انسان یا جہندہ خون رکھنے والے حیوان کا خون اس حیوان کے بدن میں چلا جائے جو اچھلنے والا خون نہ رکھتا ہو مثلاً انسان کے بدن کا خون مچھر اور مکھی وغیرہ کے بدن میں منتقل ہوجائے۔

۶۔ اِزالہ : عین نجاست کا حیوان کے ظاہر سے اور انسان کے باطن سے دور ہوجانا۔ مثلاً اگر حیوان کی پشت یا انسان کی ناک کا اندرونی حصّہ خون آلود ہوجائے تو وہ خون کے ختم ہوجانے پر پاک ہوجاتا ہے اور اسے پانی سے دھوکر پاک کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۷۔ تَبَعِیّت : تبعیّت سے مراد یہ ہے کہ ایک نجس چیز ایک دوسری نجس چیز کے پاک ہونے کی بدولت پاک ہوجائے۔ مثلاً اگر ایک کافر مسلمان ہوجائے تو اس کے بچّے بھی اس کی تبعیت میں پاک ہوجائیں گے۔

۸۔ اِنقِلاب : یعنی انگور کے پانی کا دو تہائی کم ہوجانا کیونکہ اگر انگور کا پانی جوش کھائے تو نجس ہوجاتا ہے اور جب جوش کھانے کی وجہ سے اس کا دو تہائی حصّہ بھاپ بن کر اُڑ جائے تو باقی ماندہ پاک ہوجاتا ہے۔

وضو اور اس کے احکام

مستحب ہے کہ وضو سے پہلے انسان مسواک اور کلی کرے۔ یہ بھی مستحب ہے کہ استنشاق کرے یعنی پاک پانی ناک کے اندر کھینچے۔

وضو کا طریقہ

وضو میں ضروری ہے کہ چہرے کو سر کے بال اُگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی تک اور ہاتھوں کو کہنی سے لے کر انگلیوں کے سروں تک دھویا جائے اور سر کے اگلے حصے اور پاؤں کی پشت کا مسح کیا جائے۔

وضو میں ان چند چیزوں کی رعایت کرنی چاہیے :-

۱ — وضو کے اعضا پاک ہوں۔

۲ — وضو کا پانی پاک، مطلق اور مباح ہو۔

۳ — نیّت، یعنی یہ کہ وضو خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لیے کرے۔ پس اگر بدن کو ٹھنڈک پہنچانے یا کسی اور مقصد کے لیے وضو کیا جائے تو وہ صحیح نہیں۔

۴ — ترتیب، یعنی پہلے مُنہ اور اس کے بعد دایاں ہاتھ اور پھر بایاں ہاتھ دھونا چاہیے اور اس کے بعد سر کا اور پھر پاؤں کا مسح کرنا چاہیے

۵ — موالات، یعنی وضو کے افعال مسلسل انجام دیئے جائیں اور ان کے درمیان اتنا فاصلہ نہ ڈالا جائے کہ ایک عضو کو دھوتے یا اس کا مسح کرتے وقت پہلا عضو خشک ہو جائے۔ تاہم اگر وضو کے افعال مسلسل انجام دیے جائیں لیکن موسم کی گرمی یا بدن کی زیادہ حرارت وغیرہ کی

وجہ سے رطوبت خشک ہو جائے تو وُضو صحیح ہو گا۔

تبصِرہ

یہ ضروری نہیں کہ سر کا مسح اس کی کھال پر ہو بلکہ سر کے اگلے حصّے کے بالوں پر بھی مسح کرنا صحیح ہے لیکن اگر بال سر کے اگلے حصّے پر جمع ہو جائیں تو انھیں ہٹا دینا چاہیے۔ علاوہ ازیں اگر سر کے اگلے حصّے کے بال اتنے لمبے ہوں کہ اگر کنگھا کیا جائے تو چہرے پر آگریں تو پھر بالوں کی جڑوں کا مسح کرنا چاہیے یا مانگ نکال کر سر کی کھال پر مسح کرنا چاہیے۔

مُبطِلاتِ وضو

جو چیزیں وضو کو باطل کرتی ہیں انھیں مبطلاتِ وضو کہتے ہیں۔

اور وہ آٹھ ہیں :۔

۱ * پیشاب۔

۲ * پاخانہ ۔

۳ * ریح اور یہ اس صورت میں ہے جب وہ اپنی معمول کی جگہ سے باہر آئے یا بیماری اور جرّاحی کی بنا پر اس کے نکلنے کی جگہ دوسری ہو۔

۴ * بیہوشی۔

۵ * بدمستی۔

۶ * نیند۔ جس کے نتیجے میں آنکھیں نہ دیکھیں اور کان نہ سُنیں۔ پس اگر آنکھیں دیکھیں لیکن کان نہ سنیں تو وضو باطل نہ ہو گا۔

۷ ٭ دیوانگی ۔
۸ ٭ جنابت اور وہ دُوسری چیزیں جن کے لیے غسل ضروری ہو ۔
علاوہ ازیں خونِ استحاضہ جو بعض اوقات عورتوں کو آتا ہے وضو کو باطل کر دیتا ہے ۔

غُسل

غسل دو۲ طریقوں سے کیا جاسکتا ہے :۔
ترتیبی اور ارتماسی
ترتیبی غُسل میں سر، گردن ، بدن کا دایاں حصّہ اور بدن کا بایاں حصّہ بالترتیب دھوئے جاتے ہیں ۔
اِرتماسی غُسل یہ ہے کہ انسان اپنا پورا بدن ایک ہی دفعہ نہر وغیرہ میں ڈبو دے ۔
غسل کی دو۲ قسمیں ہیں : یعنی واجب اور مستحب ۔
شریعت میں مستحب غسل بے شمار ہیں اور واجب غسل سات ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے :

۱ ۔ غسل جنابت
۲ ۔ غسل میّت
۳ ۔ غسل مسِ میّت ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان ایک مردہ بدن کو جو ٹھنڈا ہو چکا ہو اور اسے غسل نہ دیا گیا ہو مس کرے یعنی اپنے بدن کا کوئی حصّہ اس سے چھُوئے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ غُسل کرے ۔

۴- جب کسی نے غسل کرنے کی نذر مانی ہو یا عہد کیا ہو یا قسم کھائی ہو۔

۵- غسل حیض

۶- غسل نفاس

۷- غسل استحاضہ

ان میں سے پہلے چار غسل مرد اور عورت دونوں کے لیے ہیں اور آخری تین غسل فقط عورت کے لیے ہیں۔

جو چیزیں مُجنِب پر حرام ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱۔ قرآن مجید کے لفظوں اور خُدا، رسولؐ اور اماموںؑ کے ناموں کو چھُونا۔

۲۔ مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ میں داخل ہونا۔

۳۔ دُوسری مسجدوں میں ٹھہرنا اور ان میں کوئی چیز رکھنا۔

۴۔ ان چار سورتوں میں سے کسی ایک کا پڑھنا جن میں واجب سجدہ آتا ہے یعنی سورۂ سجدہ، سورہ حٰمٓ سجدہ، سورۂ نجم اور سورۂ عَلَق۔

جنابت، حَیض، نِفاس اور اِستحاضہ کے بارے میں دوسرے احکام کے لیے متعلّقہ کتابوں سے رجوع کرنا چاہیے۔

تبصرہ

غُسل میں بھی وضو کی طرح نیت ضروری ہے۔ غُسل سے پہلے بدن پاک ہونا چاہیے اور پانی کے بدن تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہونی چاہیے۔

تیمّم

اگر انسان وقت کی تنگی، بیماری یا پانی دستیاب نہ ہونے یا ایسی ہی کسی اور وجہ کی بنا پر نماز وغیرہ کے لیے وضو یا غسل نہ کرسکے تو اسے چاہیے کہ تیمّم کرلے۔

تیمّم کا طریقہ

تیمّم میں چار چیزیں واجب ہیں:-

۱۔ نیّت

۲۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں بیک وقت مٹی یا کسی دوسری ایسی چیز پر مارنا جس پر تیمّم صحیح ہو۔

۳۔ سر کے بالوں کے اُگنے کی جگہ سے لے کر بھوؤں تک اور ناک کے اوپر تک دونوں ہتھیلیوں کو پوری پیشانی پر پھیرنا۔ اور بہتر یہ ہے کہ ہتھیلیاں بھوؤں پر بھی پھیری جائیں۔

۴۔ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دائیں ہاتھ کی پوری پشت پر پھیرنا اور پھر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پوری پشت پر پھیرنا۔

اگر تیمّم وضو کے بدلے کیا جائے تو اتنا ہی کافی ہے لیکن اگر وہ غسل کے بدلے میں ہو تو ایک دفعہ پھر ہاتھوں کو زمین پر مارنا چاہیے اور ہاتھوں کی پشت کا مسح کرنا چاہیے۔

تیمّم کے اَحکام

(۱) اگر مٹی نہ ملے تو ریت پر اور اگر ریت نہ ہو تو ڈھیلے پر اور اگر وہ بھی نہ ہو تو پھر پتھّر پر تیمّم کرنا چاہیے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی میسر نہ ہو تو اس گرد و غبار پر تیمّم کرنا چاہیے جو کسی جگہ جمع ہو گیا ہو۔

(۲) چُونے اور دوسری معدنی چیزوں پر تیمّم کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۳) اگر پانی مہنگا ملتا ہو لیکن انسان اسے خریدنے کی قوّت رکھتا ہو تو وہ تیمّم نہیں کر سکتا بلکہ اُسے چاہیے کہ پانی خریدے اور وضو و غسل کرے۔

دوم۔ وقت

نمازِ ظہر و عصر میں سے ہر ایک کا مخصوص اور مشترک وقت ہے۔ نمازِ ظہر کا مخصوص وقت اوّلِ ظہر[۱] سے اس وقت تک ہے جب کہ نمازِ ظہر

۱؎ اگر لکڑی (شاخص) یا اس جیسی کوئی اور چیز ہموار زمین میں سیدھی گاڑ دی جائے تو صبح کے وقت جب سورج نکلتا ہے اس کا سایہ مغرب کی طرف ہوتا ہے اور جوں جوں سورج بلند ہوتا جاتا ہے یہ سایہ کم ہوتا جاتا ہے اور اوّلِ ظہر میں وہ کمی کے آخری درجے پر پہنچ جاتا ہے ظہر کا وقت گزر جانے کے بعد یہ سایہ مشرق کی طرف پڑنے لگتا ہے اور جُوں جُوں سورج مغرب کی جانب جاتا ہے سایہ لمبا ہوتا جاتا ہے، لہٰذا جب سایہ کمی کے آخری درجے پر پہنچ جائے اور دوبارہ بڑھنے لگے تو پتا چلتا ہے کہ ظہر کا وقت ہو گیا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ بعض شہروں مثلاً مکّہ میں نمازِ ظہر کے وقت سایہ بالکل ختم ہو جاتا ہے اور ان شہروں میں جب سایہ دوبارہ نظر آنے لگے تو پتا چلتا ہے کہ ظہر کا وقت ہو گیا ہے۔

پڑھنے کا وقت اندازاً گزر جائے ۔ اگر کوئی شخص غلطی سے اِس وقت کے دوران نماز عصر بھی پڑھ لے تو اس کی نماز باطل ہے۔

نمازِ عصر کا مخصوص وقت وہ ہے جب مغرب سے پہلے نمازِ عصر پڑھنے کے اندازے کے مطابق وقت باقی ہو۔ اگر کوئی شخص اس وقت تک نماز ظہر نہ پڑھے تو اس کی نماز ظہر قضا ہو جاتی ہے اور اسے چاہیے کہ نماز عصر پڑھے۔ نماز ظہر کے مخصوص وقت اور نمازِ عصر کے مخصوص وقت کا درمیانی عرصہ نمازِ ظہر وعصر کے لیے مشترک وقت ہے۔ اگر کوئی شخص اس وقت میں غلطی سے نماز ظہر سے پہلے نماز عصر پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے چاہیے کہ نمازِ ظہر اس کے بعد بجا لائے ۔

نمازِ مغرب و عشاء میں سے بھی ہر ایک کا مخصوص اور مشترک وقت ہے۔

نمازِ مغرب کا مخصوص وقت اوّلِ مغرب سے اس وقت تک ہے ، جب کہ مغرب کے بعد تین رکعت نماز پڑھنے کے اندازے کے مطابق وقت گزر جائے[1]

نمازِ عشاء کا مخصوص وقت وہ ہے جب آدھی رات[2] میں اندازاً نمازِ عشاء کا وقت باقی ہو۔ چنانچہ اگر کسی شخص نے اس وقت تک نمازِ مغرب نہ پڑھی ہو تو اسے چاہیے کہ پہلے نمازِ عشاء اور اس کے بعد نماز مغرب پڑھے۔

---

[1] مغرب ، سورج ڈوبنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد مشرق کی جانب جو سُرخی نظر آتی ہے وہ زائل ہو جائے۔

[2] شریعت کی رو سے آدھی رات ظہر کے بعد سوا گیارہ گھنٹے گزرنے پر ہوتی ہے ۔

نمازِ مغرب کے مخصوص وقت اور نمازِ عشاء کے مخصوص وقت کا درمیانی عرصہ ان دونوں نمازوں کا مشترک وقت ہے اور اگر کوئی شخص اس دوران میں غلطی سے نمازِ عشاء نمازِ مغرب سے پہلے پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہے اور اسے چاہیے کہ اس کے بعد نمازِ مغرب بجالائے۔

صبح کی نماز کا وقت صبحِ صادق[1] کی ابتدا سے سورج نکلنے تک ہے۔

سوم۔ لباس

نمازی کے لباس کی چند شرطیں مندرجۂ ذیل ہیں:

۱ — مباح ہو یعنی نمازی کا اپنا مال ہو یا اگر اس کا اپنا نہ بھی ہو تو اس کا مالک اس کے یہ لباس پہن کر نماز پڑھنے پر راضی ہو۔

۲ — نجس نہ ہو۔

۳ — مُردار کی کھال نہ ہو۔ خواہ حلال گوشت حیوان کی یا حرام گوشت حیوان کی ہو۔

۴ — حرام گوشت حیوان کی پشم، بالوں اور اُون کا بنا ہُوا

---

[1] صبح کی اذان کے نزدیک مشرق کی طرف سے ایک سفیدی اوپر کی جانب حرکت کرتی ہے جسے فجرِ اوّل یا فجرِ کاذب کہتے ہیں۔ جب وہ سفیدی پھیل جائے تو فجرِ دوم اور اذان کا وقت ہوتا ہے اور یہ صبح کی نماز کا اوّل وقت ہے۔

نہ ہو۔ لیکن سمور کا لباس پہن کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

(۵) اگر نمازی مرد ہو تو اس کا لباس ریشم اور زردوزی کا نہیں ہونا چاہیے اور اسے سونے سے بھی اپنی آرائش نہیں کرنی چاہیے۔

نماز کے علاوہ بھی ریشم کا لباس پہننا اور سونے سے اپنی آرائش کرنا مردوں کے لیے حرام ہے۔

چہارم۔ مکان

نمازی کے نماز پڑھنے کی جگہ کی چند شرطیں ہیں :-

۱۔ مباح ہو۔

۲۔ بے حرکت ہو۔ اگر نمازی ایسی جگہ پر نماز پڑھنے پر مجبور ہو جو حرکت کرتی ہو (مثلاً موٹر کار یا کشتی) تو کوئی حرج نہیں، تاہم اگر یہ چیزیں قبلہ کی طرف سے کسی دوسری طرف حرکت کریں تو اسے چاہیے کہ اپنا منہ قبلہ کی طرف موڑ لے۔

۳۔ اگر نماز کی جگہ نجس ہو تو وہ اتنی تر نہیں ہونی چاہیے کہ اس کی رطوبت نمازی کے بدن یا لباس کو لگے۔ لیکن اگر سجدہ کرنے کی جگہ نجس ہو تو وہ خواہ خشک بھی ہو نماز باطل ہے۔

۴۔ سجدہ کرنے کی جگہ نمازی کے گھٹنوں سے اور اس کے پاؤں کی انگلیوں کے سروں سے چار جڑی ہوئی انگلیوں سے زیادہ اونچی یا نیچی نہ ہو۔

پنجم - قبلہ

خانہ کعبہ جو کہ مکّہ معظمہ میں واقع ہے مسلمانوں کی قبلہ گاہ ہے، اس کی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھنی چاہیے لیکن جو شخص اس سے دُور ہو اگر وہ اس طرح کھڑا ہو یا بیٹھے کہ لوگ کہیں کہ وہ قبلہ رُو ہو کر نماز پڑھ رہا ہے تو یہ کافی ہے۔ نیز وہ دوسرے کام جو قبلہ رُو ہو کر انجام دینے چاہئیں۔ (مثلاً حیوانات کا ذبح کرنا) ان کی بھی یہی صورت ہے۔

جو شخص بیٹھ کر بھی نماز ادا نہ کرسکے اسے چاہیے کہ نماز کی حالت میں دائیں پہلو اس طرح لیٹے کہ اس کے بدن کا اگلا حصّہ رُوبقبلہ ہو اور اگر یہ بھی نہ کرسکے تو پیٹھ کے بل اس طرح لیٹے کہ اس کے پاؤں کے تلوے رُوبقبلہ ہوں۔

اگر نمازی کو تحقیق کرنے کے بعد بھی قبلہ کے رُخ کا پتا نہ چل سکے تو اسے چاہیے کہ جو اندازہ مسلمانوں کی محرابوں یا ان کی قبروں یا دُوسرے ذرائع سے لگایا جاسکے اس کے مطابق عمل کرے۔

واجباتِ نماز

واجباتِ نماز یعنی جو کام نماز میں واجب ہیں ان کی تعداد گیارہ ہے:-

۱ - نیّت

۲ - تکبیرۃ الاحرام

۳ — قیام
۴ — قراءت
۵ — رکوع
۶ — سُجود
۷ — ذکر رکوع وسجود
۸ — تشہد
۹ — سلام
۱۰ — ترتیب ۔ یعنی نماز کے مختلف حصوں کو مقررہ ترتیب کے مطابق ادا کرے اور انھیں آگے پیچھے نہ کرے۔
۱۱ — موالات ۔ یعنی نماز کے مختلف حصوں کو متواتر بجا لاتے اور ان میں فاصلہ نہ ڈالے[۱]

اِن گیارہ چیزوں میں سے پانچ چیزیں رکن نماز ہیں۔ اگر ان میں عمداً یا سہواً کمی بیشی ہوجائے تو نماز باطل ہوجاتی ہے ۔ باقی اُمور رکن نماز نہیں ہیں اور ان میں کمی بیشی ہوجانے سے نماز اس صورت میں باطل ہوتی ہے، جب یہ کمی بیشی عمداً کی گئی ہو ۔

ارکانِ نماز

ارکانِ نماز یہ ہیں :۔

---

[۱] محترم علامہ طباطبائی نے طمانیت یعنی وقار اور آرام کے ساتھ نماز ادا کرنے کو بھی واجبات میں شمار کیا ہے۔

۱ ٭ نیت
۲ ٭ تکبیرۃ الاحرام
۳ ٭ تکبیرۃ الاحرام کہنے کے وقت قیام اور رکوع سے متصل قیام
۴ ٭ رکوع
۵ ٭ دو سجدے -

۱ ٭ نیت

نیّت سے مراد یہ ہے کہ انسان قربت کے قصد سے یعنی خدا کا حکم بجالانے کے لیے نماز ادا کرے - نیّت کا اپنے قلب سے گزارنا یا مثلاً یہ کہنا کہ "چار رکعت نماز ظہر پڑھتا ہوں قربۃً اِلَی اللّٰہ" ضروری نہیں -

۲ ٭ تکبیرۃ الاحرام

اَذان اور اِقامت کہنے ، نیت باندھنے اور اللّٰہ اکبر کہنے پر نماز شروع ہوجاتی ہے - چونکہ یہ تکبیر کہنے کی بنا پر چند چیزیں (مثلاً کھانا، پینا، ہنسنا اور قبلہ کی جانب پیٹھ کرنا) حرام ہوجاتی ہیں اس لیے اِس تکبیر کو تکبیرۃ الاحرام کہتے ہیں -

مستحب ہے کہ تکبیر کہتے وقت ہم دونوں ہاتھوں کو بلند کریں اور اس عمل سے خدا کی بڑائی نظر میں لاکر اس کے غیر کو ناچیز تصوّر کرتے ہوئے نظرانداز کردیں -

۳ ☼ قِیَام

تکبیرۃ الاحرام کہنے کے وقت اور رکوع سے متصل قیام رکن ہے لیکن حمد اور سورہ پڑھتے وقت اور رکوع کے بعد قیام رکن نہیں ہے۔ لہذا اگر کوئی شخص رکوع ادا کرنا بھول جائے اور سجدے میں جانے سے پہلے اسے یاد آئے تو اسے چاہیے کہ کھڑا ہو جائے اور پھر رکوع میں جائے۔ اگر وہ جھکے جھکے ہی رکوع میں چلا جائے تو چونکہ اس نے رکوع کے متصل قیام نہیں کیا اس لیے اس کی نماز باطل ہوگی۔

۴ ☼ رُکُوع

قرارت پڑھنے کے بعد نمازی کو چاہیے کہ قدرے جھک جائے تاکہ اس کے ہاتھ اس کے گھٹنوں تک پہنچ جائیں۔ یہ عمل رکوع کہلاتا ہے۔ رکوع میں ایک مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ یا تین مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہ کہنا چاہیے۔ نمازی کو چاہیے کہ رکوع کے بعد سیدھا کھڑا ہو جائے اور سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ کہے پھر سجدے میں جائے۔

۵ ☼ سُجُود

سجدے کے معنی یہ ہیں کہ نمازی اپنی پیشانی، ہاتھوں، گھٹنوں اور پاؤں کے دونوں انگوٹھوں کے سرے زمین پر رکھ دے اور ایک مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی وَبِحَمْدِہٖ یا تین مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰہِ

کہے۔ پھر بیٹھ جائے اور اس کے بعد دوبارہ سجدے میں جاکر وہی ذکر دُہرائے۔

جس جگہ نمازی اپنی پیشانی رکھے وہ زمین یا ایسی چیز ہونی چاہیے جو زمین سے اُگے۔ خوراک اور پوشاک کے طور پر استعمال ہونے والی اور معدنی چیزوں پر سجدہ جائز نہیں۔

تَشَہُّد اور سَلام

اگر نماز دو رکعتی ہو تو نمازی کو چاہیے کہ دو سجدے کرنے کے بعد کھڑا ہو جائے پھر حمد، سورہ اور قنوت پڑھے [1] اور رکوع و سجود کے بعد تشہّد پڑھے [2] اور پھر سلام کہے [3]

---

[1] حمد اور سورہ کے بعد ہاتھوں کو اپنے چہرے کے سامنے بلند کر کے جو ذکر چاہے پڑھے مثلاً کہے رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

[2] تشہّد میں یہ جملے کہے:

اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ.

[3] سلام کے جملے یہ ہیں:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ. اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ. اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ.

اگر نماز تین رکعتی ہو تو نمازی کو چاہیے کہ تشہّد کے بعد کھڑا ہو جائے اور فقط حمد پڑھے۔ یا تین مرتبہ کہے: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اور اس کے بعد رُکوع وسُجُود بجالائے اور تشہّد و سلام پڑھے اور اگر نماز چار رکعتی ہو تو چوتھی رکعت کو تیسری رکعت کی طرح انجام دے اور پھر تشہّد اور سلام پڑھے۔

نمازِ آیات

نمازِ آیات چار چیزوں کی وجہ سے واجب ہوتی ہے:

۱ * سورج کو گہن لگنا۔

۲ * چاند کو گہن لگنا۔

۳ * زلزلہ۔ خواہ اس سے کسی کے دل میں خوف پیدا ہو یا نہ ہو۔

۴ * بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، سرخ و سیاہ آندھیاں اور ان سے ملتی جلتی چیزیں جن سے بیشتر لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا ہوتا ہے۔

نمازِ آیات پڑھنے کا طریقہ

نمازِ آیات کی دو رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں پانچ رکوع ہوتے ہیں اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان نیّت کے بعد تکبیر کہے اور ایک بار حمد اور ایک پورہ سورہ پڑھے اور رکوع میں جائے: پھر رکوع سے سر اٹھائے اور دوبارہ حمد اور ایک سورہ پڑھے اور رکوع میں جائے۔ یہ عمل پانچ مرتبہ دُہرائے اور پانچویں رکوع سے کھڑے ہونے کے بعد دو سجدے کرے پھر کھڑا ہو اور دوسری رکعت بھی پہلی رکعت کی طرح بجالائے اور تشہّد پڑھے

اور سلام کہے۔

نمازِ آیات میں یہ بھی ممکن ہے کہ انسان نیت باندھنے اور تکبیر اور حمد پڑھنے کے بعد ایک سورے کے پانچ حصے کرے اور ایک آیت یا اس سے زیادہ پڑھے اور رکوع میں جائے اور یہ عمل دُہراتا رہے حتیٰ کہ پانچویں رکوع سے پہلے سورہ ختم کرلے اور اس کے بعد رکوع میں جائے اور پھر دو سجدے کرے اور پھر اسی طرح دوسری رکعت پڑھے اور نماز تمام کرے۔

مسافر کی نماز

جو شخص مسافر ہو وہ مندرجہ ذیل چھ شرائط کے تحت چار رکعتی نمازوں کی بجائے دو رکعتیں پڑھتا ہے:

۱۔ اس کا سفر آٹھ فرسنگ (تقریباً ۴۵ کیلو میٹر) سے کم نہ ہو یا وہ چار فرسنگ تک جائے اور چار ہی فرسنگ فاصلہ واپسی میں بھی طے کرے۔

۲۔ سفر کے شروع سے ہی اس کا ارادہ آٹھ فرسنگ فاصلہ طے کرنے کا ہو۔

۳۔ وہ راستے میں اپنا ارادہ نہ بدلے۔

۴۔ اس کا سفر گناہ کی غرض سے نہ ہو۔

۵۔ سفر کرنا اس کا پیشہ نہ ہو لہذا جس شخص کا پیشہ ہی سفر کرنا ہو (مثلاً ڈرائیور) اُسے چاہیے کہ پوری نماز پڑھے بجز اس کے کہ دس دن گھر پر رہے کیونکہ اِس صورت میں اُسے چاہیے کہ تین دفعہ

سفر کرنے تک نماز قصر کر کے پڑھے۔

۶ ـ حدِّ ترخّص تک پہنچ جائے یعنی اپنے وطن سے یا ایسی جگہ سے جہاں اس نے دس دن قیام کرنے کا ارادہ کیا ہو اتنی دُور پہنچ جائے کہ نہ تو شہر کی فصیل دیکھ سکے اور نہ ہی وہاں کی اذان سُن سکے۔

نمازِ جماعت

مسلمانوں کے لیے روزانہ نمازیں اجتماع کی حالت میں پڑھنا مستحب ہے اور نمازِ جماعت کا ثواب تنہائی میں یا اکیلے پڑھی جانے والی نماز کے مقابلے میں کئی ہزار گنا زیادہ ہے۔

نمازِ جماعت کی شرطیں

۱ ـ امام جماعت کے لیے ضروری ہے کہ مکلّف، مؤمن، عادِل اور حلال زادہ ہو اور نماز صحیح طور پر پڑھے اور اگر ماموم مرد ہو تو اس کا امام بھی مرد ہی ہونا چاہیے۔

۲ ـ امام اور ماموم کے درمیان پردہ یا کوئی دوسری ایسی چیز حائل نہیں ہونی چاہیے جو ماموم کے امام کو دیکھنے میں مانع ہو، لیکن اگر ماموم عورت ہو تو پھر پردہ وغیرہ ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

۳ ـ امام کی جگہ ماموم کی جگہ سے زیادہ بلند نہیں ہونی چاہیے لیکن اگر تھوڑی سی (چار انگشت کے برابر یا اس سے کم) بلند ہو تو کوئی حرج نہیں

۴ ـ ماموم کو چاہیے کہ امام کے پیچھے یا اس کے برابر کھڑا ہو۔

نماز جماعت کے احکام

۱- ماموم کو چاہیے کہ حمد اور سورے کے علاوہ نماز کی ہر چیز خود بھی پڑھے۔ لیکن اگر اس کی پہلی یا دوسری رکعت امام کی تیسری یا چوتھی رکعت ہو تو اسے چاہیے کہ حمد اور سورہ بھی پڑھے اور اگر سورہ پڑھنے کی وجہ سے امام کے ساتھ رکوع میں شامل نہ ہو سکے تو فقط حمد پڑھے اور امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہو جائے اور اگر رکوع میں شامل نہ ہو پائے تو فُرادیٰ (یعنی اکیلے میں نماز پڑھنے) کے قصد سے نماز پُوری کرے۔

۲- ماموم کو چاہیے کہ رکوع، سجود اور نماز کے دُوسرے افعال امام کے ساتھ یا اس سے قدرے بعد میں بجالائے۔ لیکن تکبیرۃ الاحرام اور نماز کا سلام قطعی طور پر امام کے بعد کہے۔

۳- اگر ماموم اس وقت اِقتدا کرے جب امام رکوع میں ہو اور رکوع میں اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کی نماز صحیح ہے اور ایک رکعت شمار ہوتی ہے۔

روزہ

فروعِ دین میں سے ایک فرع روزہ ہے اور ہر مکلّف پر واجب ہے کہ ماہِ رَمَضَان کے روزے رکھّے یعنی خُدا کے فرمان کی خاطر صبح کی اذان سے مغرب تک ان چیزوں سے پرہیز کرے جو روزے کو باطل کرتی ہیں۔

دینِ اسلام میں روزے کی بے حد تاکید کی گئی ہے اور اسلام اس مقدّس عمل کو بہت اہمّیت دیتا ہے۔ اسلام میں روزے کا اجر اتنا زیادہ ہے کہ اسے پہلے سے متعین کرنے کی بجائے خدا نے خود اس کا ذمّہ لیا ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ ارشادِ خداوندی ہے : اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ یعنی روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کا اجر دوں گا۔

روزہ اپنی مخصوص شرائط کے ساتھ انسان کو نفسانی خواہشات کی غلامی سے آزاد کرانے اور اس کی رُوح کو آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے بے حد مؤثر ہے۔

رسولِ اکرمؐ نے جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے فرمایا :

"اے جابر! یہ رَمَضان کا مہینہ ہے، جو شخص اس مہینے میں دن میں روزہ رکھے اور رات کو خدا کی یاد میں بیدار رہے، اپنے پیٹ کی حرام سے اور اپنے دامن کی آلودگی سے حفاظت کرے اور اپنی زبان پر قابو رکھے، وہ جس طرح اس مہینے سے باہر نکلے گا، گناہوں سے بھی باہر نکل جائے گا۔"

جابرؓ نے عرض کیا :

"یارسول اللہؐ! یہ خبر کتنی اچھی ہے!"

آنحضرتؐ نے فرمایا :

"اے جابر! اس کی شرطیں کتنی سخت ہیں!"

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے :

"روزہ دوزخ کی آگ کے مقابلے میں مضبوط سپر ہے۔"

رمضان خُدا کا مہینہ ہے

اسلامی روایات میں ماہِ رمضان کو "ماہِ مبارک" اور "بہارِ تلاوتِ قرآن" جیسے بہت سے پسندیدہ اور دلکش نام دیئے گئے ہیں، لیکن شَہرُ اللّٰہ یعنی خُدا کا مہینہ ایک ایسا نام ہے جو سب سے عالی شان اور بہترین معانی کا حامل ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ سب مہینے خدا ہی کے ہیں لیکن ماہ رمضان کی اہمیّت کی بنا پر اسے خدا کا مہینہ کہا گیا ہے اور اس نام نے اسے مخصوص شان اور روحانیت بخشی ہے۔ یہی وہ مہینہ ہے جس میں سب سے بلند رتبہ آسمانی کتاب قرآن مجید نازل ہوئی۔

ماہِ رمضان المبارک کی آمد پر پروردگارِ عالم کی رحمت کے دروازے بندوں کے لیے کھل جاتے ہیں۔ ایک مخصوص روحانیت اور صفائی انسان کی رُوح میں پیدا ہو جاتی ہے اور روزہ داروں میں عبادت، تہذیبِ نفس اور اصلاحِ اخلاق کے لیے ایک خاص آمادگی نمودار ہو جاتی ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے ماہ شعبان کے آخری جمعہ کے دن "خُدا کے مہینے" کی عظمت اور قدر و قیمت کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا :

"اے لوگو! خدا کا مہینہ اپنی برکت، رحمت اور مغفرت کے ساتھ تمھاری طرف آ رہا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جو خُدا کے

نزدیک سب مہینوں سے بہتر ہے ۔ اس کے دن بہترین دن، اس کی راتیں بہترین راتیں اور اس کی گھڑیاں بہترین گھڑیاں ہیں ۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں تمھیں خُدا کی مہمانی کی طرف دعوت دی گئی ہے اور تم اس کے لطف و کرم کے مورد قرار دیے گئے ہو ۔ اس مہینے میں تمھیں سانس لینے سے تسبیح اور ذکرِ خُدا کا ثواب ملے گا اور سونے سے عبادت کا اجر ملے گا ۔

اس مہینے میں جب تم خدا کی بارگاہ میں حاضر ہو گے اور اس کی دہلیز پر بیٹھو گے تو وہ تمھاری دعا قبول کرے گا پس صِدق و صَفا اور پاک دل کے ساتھ خدا سے دُعا کرو کہ وہ تمھیں روزہ رکھنے اور قرآن پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے ۔ کیونکہ بدبخت ہے وہ شخص جو اس بابرکت مہینے میں خُدا کی مغفرت اور رحمت سے محروم رہے ۔"

روزہ تقویٰ کا موجب ہے

خُدا قرآن مجید میں فرماتا ہے :

"اے ایمان والو ! ہم نے تم پر روزے واجب کیے ہیں جیسے کہ پہلی قوموں پر واجب کیے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۔" (سورۂ بقرہ ۔ آیت ۱۸۳)

اسلام اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ پُورا ایک مہینہ (ماہِ رمضان) روزہ رکھیں ۔ مسلمان ایک مہینہ روزے رکھنے سے اپنے اندر صحیح معنوں میں تقویٰ یعنی پرہیزگاری کی صِفَت پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں،

کیونکہ جب انسان اپنے جسم کی فطری ضروریات پوری کرنے سے باز رہتا ہے تو وہ نفسانی خواہشات کی پیروی سے بخوبی اجتناب برت سکتا ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام روزہ دار کے اس بلند درجے پر پہنچنے کے لیے فقط کھانا پینا ترک کرنے کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ حکم دیتا ہے کہ وہ ہر اس چیز سے اجتناب برتے جو گناہ کے ارتکاب کا موجب ہو یا اس کو شیطانی وسوسوں اور سرکش نفسانی خواہشوں کی جانب لے جائے۔

مُبْطِلاتِ روزہ

کئی ایک چیزیں روزے کو باطل کرتی ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں :۔

۱ — کھانا پینا۔ اگرچہ وہ چیز عموماً کھائی پی نہ جاتی ہو۔ مثلاً مٹی یا درخت کا شیرہ۔

۲ — جماع

۳ — اِستمنار۔ یعنی انسان خود کوئی ایسا فعل کرے جس کے نتیجے میں منی خارج ہو۔

۴ — خُدا، پیغمبرِ خُدا ؐ اور ائمہ ؑ اہلبیت ؑ سے کوئی جھوٹی بات منسوب کرنا۔

۵ — گاڑھا غبار حلق میں پہنچانا۔

۶ — پورا سر پانی میں ڈبونا۔

۷ — صبح کی اذان تک جنابت، حیض اور نفاس کی حالت میں رہنا۔

۸ — مائع چیزوں کے ساتھ انیما کرنا۔

۹ — عمداً قے کرنا۔

بیع

بَیع کیا ہے؟

بیع سے مراد "بیچنا اور ایک مال کا دُوسرے مال سے تبادلہ کرنا" ہے۔ وہ اس طرح کہ کسی سامانِ تجارت کا مالک کہ جو "فروشندہ" کہلاتا ہے، اپنا سامان اس رقم کے عوض جو وہ حاصل کرتا ہے، دوسرے فریق کے سپرد کردیتا ہے اور دوسرا فریق کہ جو "خریدار" کہلاتا ہے وہ سامان کے حصول کے عوض اپنی رقم "فروشندہ" کو دے دیتا ہے۔

جیسا کہ ظاہر ہے بیع معاہدات کی ایک قسم ہے اور اس کی تکمیل کے لیے دو فریقوں کی ضرورت ہوتی ہے لہذا ضروری ہے کہ بلوغ، عقل، ارادہ اور اختیار جو معاہدات کی عام شرائط ہیں وہ بَیع کے سِلسلے میں بھی پُوری ہوں۔

بیع کا لزوم

بیع لازمی معاہدات میں سے ہے یعنی مُعاہدہ طے پاجائے تو فریقین میں سے کسی کو اسے فسخ کرنے کا اختیار نہیں۔

تاہم اِس بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کہ بعض اوقات بیع کے انجام پانے میں فروشندہ یا خریدار غفلت یا غلطی کی بنا پر دھوکا کھا جاتا ہے اور اسے کافی نقصان ہوتا ہے بیع کو لازمی قرار دینا عمومی مصلحت کے خلاف ہے اور شارعِ اسلام نے اس خرابی کا سدِّ باب کرنے کے لیے دو راستے تجویز کیے ہیں:

ان میں سے پہلا طریقہ اِقالہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب فریقین میں سے کوئی ایک پشیمان ہو جائے اور معاملے کو فسخ کرنا چاہے تو مستحب ہے کہ دوسرا فریق مان جائے اور معاملے کو کالعدم قرار دیدے۔

دُوسرا طریقہ خِیار ہے اور وہ ایک خاص اختیار ہے کہ جس سے استفادہ کرتے ہوئے معاملہ کرنے والا معاملے کو فسخ کرسکتا ہے۔

مشہور خیارات یہ ہیں :۔

۱۔ خیارِ مجلس

جب تک وہ مجلس کہ جس میں معاہدہ طے پایا ہو، برخاست نہ ہوجائے فریقین معاملہ فسخ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

۲۔ خیارِ غبن

اگر معاہدہ کے فریقین میں سے کوئی ایک دھوکا کھا گیا ہو اور اسے معاملے میں نقصان ہوا ہو، مثلاً اگر سامان اس کی واقعی قیمت سے کم پر بیچا جائے یا اس سے زیادہ قیمت پر خریدا جائے تو جس شخص کو دھوکا ہوا ہو وہ فوراً معاملہ فسخ کرسکتا ہے۔

۳۔ خیارِ عیب

جب معاملہ طے پا جانے کے بعد خریدار کو مال میں کسی عیب کا پتا چلے تو وہ معاملہ فسخ کرسکتا ہے یا قیمت میں فرق کے مطابق رقم واپس لے سکتا ہے۔

۴ - خیارِ حیوان

حیوانات مثلاً بھیڑ، بکری اور گھوڑے وغیرہ کے معاملے میں خریدار تین دن تک معاملہ فسخ کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۵ - خیارِ شرط

اگر فروشندہ یا خریدار یا دونوں اپنے معاملے میں کوئی شرط رکھیں تو اس شرط کی خلاف ورزی کی صورت میں معاملہ فسخ کر سکتے ہیں۔

نَقد - اُدھار - سَلَم اور وعدہ

سامان اور رقم لینے دینے کے لحاظ سے بیع کی چار قسمیں ہیں:

۱ * سامان اور رقم کا معاملہ طے پا جانے پر اسی وقت لین دین کر لیا جائے۔ اس بیع کو "نَقد" کہتے ہیں۔

۲ * سامان معاملہ طے پانے پر خریدار کے حوالے کر دیا جائے لیکن قیمت کی ادائیگی بعد میں ہو۔ اس بیع کو "اُدھار" کہتے ہیں۔

۳ * دوسری قسم کے برعکس رقم نقد ادا کی جائے لیکن سامان بعد میں خریدار کے حوالے کیا جانا ہو۔ اس بیع کو "سَلَم" کہتے ہیں۔

۴ * پہلی قسم کے برعکس سامان اور رقم دونوں کی ادائیگی بعد میں ہونی ہو۔ اس بیع کو "وعدہ" کہتے ہیں۔

بیع کی ان چار قسموں میں سے پہلی تین صحیح ہیں اور چوتھی باطل ہے۔

اِقرار

اِقرار کی اہمیّت

معاشرے میں ان حقوق کی بحالی کے لیے جن کے پامال اور ضائع ہونے کا خطرہ ہو اقرار کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں، کیونکہ جو کام عدالتیں بڑی چھان بین اور غور وخوض کے بعد انجام دیتی ہیں، اُسے اِقرار بڑے آسان اور واضح طریقے سے دو لفظوں میں مکمّل کر دیتا ہے۔

فرد کے نقطۂ نگاہ سے بھی اقرار کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے کیونکہ یہ اس جبلّت سے جنم لیتا ہے جسے زندہ کرنے اور بروئے کار لانے کے لیے اسلام اپنی تمام کوششیں صرف کرتا ہے اور وہ انسانی حق پرستی کی جبلّت ہے جو ہوس پرستی کے برعکس ہے۔

خُدا اپنے کلام میں اِسلام کے پیروؤں سے خطاب کرتے ہُوئے فرماتا ہے:

"جہاں تک ہوسکے عدالت کے وظیفے پر قائم رہو اور جو کچھ جانتے ہو اُسے جس طرح جانتے ہو بیان کرو اگرچہ وہ خُود تمھارے لیے یا تمھارے ماں باپ اور دُوسرے قریبی رشتے داروں کے لیے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو۔"

(سورۂ نساء - آیت ۱۳۵)

رسولِ اکرمؐ کی حدیث ہے:

"سچّی بات کہو خواہ اس سے تمھیں نقصان ہی پہنچے۔"

اِقرار کے معنیٰ اور شرطیں

شرع کی اصطلاح میں "اِقرار" وہ بات ہے جو بات کرنے والے پر کسی دُوسرے کا حق ثابت کرے مثلاً ایک شخص کہے کہ "میں فُلاں آدمی کا ایک ہزار روپے کا مقروض ہوں۔"

اِقرار کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بالغ اور عاقل ہو، لہذا کسی ایسے شخص کا اقرار صحیح نہیں جو نابالغ، دیوانہ یا مست ہو یا نیند کی حالت میں ہو۔

اشیاءِ خُورد ونوش

اسلام میں ہر وہ چیز جو کھانے اور پینے کے قابل ہو حلال ہے۔ بجُز ان چیزوں کے جن میں سے بعض خدا کی کتاب میں اور بعض رسولِ اکرمؐ کی سُنّت میں بیان کی گئی ہیں۔

وہ چیزیں جن کا کھانا اور پینا حرام ہے دو قسموں میں محدود ہیں یعنی جان دار اور بے جان۔

پہلی قسم ۔ حیوانات

اِن کی تین قسمیں ہیں:۔

دریائی ۔ صحرائی اور فضائی

دریائی حیوانات

جو حیوانات پانی میں رہتے ہیں ان میں سے فقط آبی پرندے اور فلس دار مچھلیاں حلال ہیں اور باقی مثلاً مار ماہی، سگ ماہی، کچھوا، دریائی کُتّا اور سور وغیرہ حرام ہیں۔

صحرائی حیوانات

صحرائی حیوانات دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی پالتو اور جنگلی۔ پالتو حیوانات میں سے بھیڑ، بکری، گائے اور اونٹ وغیرہ حلال گوشت ہیں اور اسی طرح گھوڑا، خچر اور گدھا بھی حلال ہیں مگر ان کا گوشت کھانا مکروہ ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے پالتو حیوانات مثلاً کتّا اور بلّی حرام ہیں۔

جنگلی حیوانات میں سے گائے، مینڈھا، ہرن، پہاڑی بکری اور گورخر (زیبرا) وغیرہ حلال ہیں اور باقی جو چیرنے پھاڑنے والے ہیں (مثلاً شیر، چیتا، بھیڑیا، لومڑی، گیدڑ وغیرہ) ان کا گوشت حرام ہے۔

واضح رہے کہ خرگوش کا گوشت بھی حرام ہے۔

فضائی حیوانات (پرندے)

پرندوں میں جو پوٹا اور سنگدانہ رکھتے ہیں یا اُڑتے وقت پَر مارتے ہیں اور جن کے چنگال نہیں ہوتے مثلاً گھریلو مُرغ، کبوتر، قمری اور تیتر وغیرہ، وہ حلال گوشت ہیں اور باقی حرام گوشت ہیں۔ نیز ٹڈّی کی کچھ

مخصوص قسمیں بھی حلال ہیں۔

تبصرہ

جن حیوانات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کا گوشت اس وقت حلال ہوتا ہے جب انھیں شریعت کے احکام کے مطابق ذبح کیا جائے۔

دُوسری قسم ۔ بے جان چیزیں

بے جان چیزوں کی ۲ دو قسمیں ہیں : جامدات اور مایعات

جامدات

۱ ۔ کسی بھی حیوان کا مُردار کھانا حرام ہے خواہ وہ حلال گوشت ہو خواہ حرام گوشت ہو۔ نجس چیزوں مثلاً حرام گوشت حیوانات کے فضلے کے لیے بھی یہی حکم ہے اور جو خوردنی چیزیں نجس چیز سے متصل ہوکر متنجس ہو جائیں، ان کی بھی یہی صورت ہے۔

۲ ۔ مٹی

۳ ۔ مہلک زہر

۴ ۔ جن چیزوں سے انسان طبعاً نفرت کرتا ہے مثلاً حلال گوشت حیوان کا فضلہ، اس کی رینٹ اور جو کچھ اس کی انتڑیوں میں سے نکلتا ہے۔ اسی طرح حلال گوشت حیوان کے بدن کے اجزا میں سے پندرہ چیزیں حرام ہیں۔

(تفصیل کے لیے توضیح المسائل ملاحظہ فرمائیے)

مایعات

۱۔ نشہ آور مشروب خواہ کسی قسم کا ہو اس کا پینا حرام ہے، اگرچہ وہ تھوڑا سا ہی ہو۔

۲۔ حرام گوشت حیوانات مثلاً سؤرنی، بلّی اور کُتیا کا دودھ۔

۳۔ اس حیوان کا خون جس کا خُون اچھلنے والا ہو۔

۴۔ جس حیوان کا خون اچھلنے والا ہو، اس کے نجس مایعات مثلاً پیشاب اور منی۔

۵۔ وہ مایعات جن میں نجاستوں میں سے کوئی ایک ڈال دی جائے۔

تبصرہ

حرام اشیائے خورد و نوش اس وقت حرام ہوتی ہیں جب اضطرار کی کیفیت نہ ہو۔

اِضطِرار کی کیفیت میں (مثلاً ایسی حالت میں کہ اگر انسان حرام غذا نہ کھائے تو بھوک کی وجہ سے اس کی جان کو خطرہ ہو یا بیمار پڑنے یا بیماری کے شدّت اختیار کرنے سے ڈرتا ہو یا اسے خوف ہو کہ سخت کمزوری کی وجہ سے سفر میں ساتھیوں سے پیچھے رہ جائے گا اور ہلاکت سے دوچار ہو جائے گا) حرام اشیائے خورد و نوش کا استعمال اِس حد تک جائز ہے کہ اضطرار رفع ہو جائے۔ بجز اس شخص کے جو چوری کے ارادے سے یا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کے مقصد سے اپنے وطن سے نکلے اور اضطرار سے دوچار ہو جائے۔

ایک اہم نکتہ

اپنی صحّت کا خیال رکھنا انسان کے اوّلین فرائض میں سے ہے اور ہر شخص اپنے خداداد شعور کی بدولت تھوڑی سی توجہ سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے۔

مختلف اشیائے خورد ونوش صحّت پر جو اثر ڈالتی ہیں وہ بھی واضح ہے۔ اس کے علاوہ یہ چیزیں انسان کی ذہنیت، اخلاق اور سماجی میل جول پر بھی بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں اس بات میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ ایک مست شخص اور ایک ہوشیار شخص کی نفسیاتی کیفیت ایک جیسی نہیں ہوتی اور نہ اس کا سماجی راستا یکساں ہوتا ہے، یا اگر کوئی شخص نفرت انگیز چیزیں کھانے پینے کی عادت ڈال لے تو اس عادت سے جو اثر اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ظاہر ہو گا وہ اس سے ملنے جلنے والے اشخاص کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی خداداد فطرت کی بدولت جانتا ہے کہ اسے اپنی غذا کے سلسلے میں کم و بیش ایک حد مقرر کرنی چاہیے۔ اسے چاہیے کہ نہ تو ہر کھائی جانے والی چیز کھائے اور نہ ہر پینے کی چیز پیے۔ جیسا کہ خُدا نے اپنے مقدس کلام میں فرمایا ہے کہ اس نے روئے زمین کی ہر چیز انسان کے لیے پیدا کی ہے اور وہ خود انسان یا اس کے لوازماتِ زندگی کی کوئی احتیاج نہیں رکھتا۔ وہ اپنی مخلوق کی بھلائی برائی سے بھی سب سے زیادہ واقف ہے۔ اِس لیے انسان کی بھلائی اور نیک بختی کی خاطر اس نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں حلال کی ہیں اور کچھ حرام قرار دی ہیں۔

امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا ہے :

"خدا نے کوئی کھانے پینے کی چیز حلال نہیں کی بجز اس کے کہ اس میں انسان کا فائدہ اور بہتری ہے اور کوئی چیز حرام نہیں کی بجز اس کے کہ وہ نقصان، خرابی اور ہلاکت کا موجب ہے۔"

ان حرام چیزوں میں سے بعض کے حرام قرار دیے جانے کی حکمت ایک ایسا شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے جو صاف اور پاکیزہ ذہن رکھتا ہو اور کئی ایک چیزوں کی تحریم کی حکمت بتدریج علمی بحثوں کے ذریعے کھل کر سامنے آگئی ہے۔ اگر کچھ اور چیزوں کے حرام قرار دیے جانے کی حکمت ہماری سمجھ میں نہیں آئی تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کبھی بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ پھر اگر وہ ہماری سمجھ میں نہ بھی آئے تو بھی یہ کہنا درست نہیں کہ انھیں حرام قرار دینے میں سرے سے کوئی حکمت یا مصلحت ہی نہیں ہے بلکہ اس بنا پر کہ یہ احکام ایک غیر محدود علم رکھنے والی مقدّس ہستی کی جانب سے ہیں۔ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ یہ بہترین اور مؤثر ترین حکمت اور مصلحت کے حامل ہیں اور یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنی مختصر زندگی اور علمی بے مائگی کے باعث اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔

غصب

اگر کوئی شخص حق ملکیت کی کوئی شرط پوری کیے بغیر کسی دوسرے شخص کا مال زبردستی چھین کر اسے اپنے مال قرار دے یا دوسرے کے مال کو اپنا مال تو قرار نہ دے لیکن اسے زبردستی اپنے تصرّف میں لاکر اس سے

فائدہ حاصل کرے تو اس فعل کو شریعت کی زبان میں "غصب" کہا جاتا ہے۔

پس "غصب" دُوسرے کے مال پر مسلّط ہونا ہے۔ جبکہ تسلّط کا کوئی سبب مثلاً "بیع"، اجارہ یا اجازت موجود نہ ہو۔

اِس سے پتا چلتا ہے کہ غصب ایک بُرا کام ہے جو اختصاص اور ملکیت کے اصول کو پامال کرتا ہے۔ جس طرح اختصاص اور ملکیت کا اصول معاشرے کی زندگی اور استواری کے لیے مؤثر ہے، اسی طرح غَصَب معاشرے کو تباہ کر دیتا ہے اور اس کی ترقی روک دیتا ہے۔

اگر یہ معمول بن جائے کہ معاشرے کے بااثر لوگ کسی جواز کے بغیر کمزوروں اور بیکسوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر قبضہ جمالیں تو اختصاص اور ملکیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہے گی۔ پھر جو شخص دوسروں کو اپنے سے کمزور دیکھے گا وہ ان کے اختصاصی حقوق کے بارے میں یہی طرزِ فکر اختیار کرے گا اور زیر دست اور کمزور لوگ بھی اپنی محنت کے ثمرہ سے بہرہ مند ہونے کے لیے اپنی عزّت اور شرافت کو بیچ ڈالیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی معاشرہ غلاموں کی تجارت کے بازار میں تبدیل ہو جائے گا۔ قوانین و ضوابط کی کوئی وقعت نہیں رہے گی اور ظلم و تعدّی کا دور دورہ ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے غاصِب کے لیے بڑے سخت قوانین وضع کیے ہیں اور غصب کو گناہِ کبیرہ قرار دیا ہے۔

کتاب و سنت کے مطابق شرک کے علاوہ ہر گناہ کے خُدا کی جانب سے معاف کر دیے جانے کا احتمال ہے اور ہر گناہ حتّٰی کہ شرک بھی توبہ

کے ذریعے قابلِ عفو ہے لیکن جس شخص کے نامۂ اعمال میں غصب اور دُوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کا اندراج ہو وہ حق دار کی جانب سے مُعافی کے بغیر خدا کی طرف سے باز پرس اور اپنے عمل کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

غَصَب کے بارے میں چند احکام

۱ ۔ غاصِب پر واجب ہے کہ وہ غصب کیا ہوا مال فوری طور پر اس کے مالک کو لوٹا دے اور اگر وہ زندہ نہ ہو تو اس کے وارثوں کو واپس کر دے، خواہ ایسا کرنا شدید نقصان کا موجب ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً یہ کہ اگر وہ کسی کا پتھر، سیمنٹ، سریا وغیرہ غصب کرے اور اسے ہزاروں لاکھوں روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والی عمارت میں لگا دے تو اسے چاہیے کہ اس عمارت کو گرا دے اور غصب کیا ہُوا پتھر، سیمنٹ اور سریا نکال کر اس کے مالک کو واپس کر دے۔ بجز اس کے کہ مال کا مالک اس کی قیمت لینے پر رضامند ہو جائے۔

یا مثلاً یہ کہ۔ دس من گندم غصب کر کے اسے دس کلو جَو میں مِلا دے اس صورت میں اگر گندم کا مالک اس کی قیمت لینے پر راضی نہ ہو تو غاصِب کو چاہیے کہ وہی گندم جَو سے علیحدہ کر کے اس کے مالک کو واپس کرے۔

۲ ۔ اگر غصب کیے ہوئے مال میں کوئی عیب پیدا ہو جائے تو غاصب کو چاہیے کہ اصل مال واپس کرنے کے ساتھ ساتھ اس عیب کی وجہ سے جو نقصان ہُوا وہ بھی پُورا کرے۔

۳ - اگر غصب کیا ہوا مال تلف ہو جائے تو غاصب کو چاہیے کہ اس کی قیمت ادا کرے۔

۴ - غاصب اگر غصب کیے ہوئے مال کے منافع سے استفادہ کیے بغیر اس کا منافع یا کوئی حصّہ ضائع کر دے تو وہ اس کے لیے ذمّہ دار ہے، مثلاً کوئی شخص ٹیکسی غصب کرے اور کچھ دن اس کا پہیّہ جام رکھے۔

نیز اگر وہ غصب کیے ہوئے مال میں کوئی منافع وجود میں لے آئے مثلاً یہ کہ ایک بھیڑ غصب کرے اور اسے چارہ کھلا کر فربہ بنا دے تو اس منافع پر اس کا کوئی حق نہ ہوگا۔

اگر منافع منفصل ہو (یعنی الگ کیا جا سکتا ہو) مثلاً یہ کہ زمین غصب کرے اور اس میں کھیتی باڑی کرے تو اسے چاہیے کہ وہ زمین مناسب معاوضے کے ساتھ مالک کو لوٹا دے لیکن فصل غاصب کی ہوگی۔

شُفعہ

اگر دو اشخاص مکان یا دوسری املاک میں شراکت دار ہوں اور ان میں سے ایک اپنا حصّہ کسی تیسرے شخص کے ہاتھ بیچ دے تو دوسرے حصّہ دار کو حق پہنچتا ہے کہ اس حصہ کو انھیں شرائط اور قیمت پر حاصل کر لے، اس حق کو "شفعہ" کہا جاتا ہے۔

یہ امر واضح ہے کہ اسلام میں یہ حق شرکاء کی برابری کے لیے اور ان نقصانات اور خرابیوں کو دور کرنے کی خاطر وضع کیا گیا ہے جو بعض شرکاء

کے تصرفات کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ املاک پر نئے شخص کے تسلّط کا نتیجہ صاحبِ شفعہ شریک کے نقصان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے یا طور طریقوں میں باہم فرق کی وجہ سے اختلاف اور جھگڑوں کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے یا اپنا حصّہ بیچنے والے شریک کو نقصان پہنچائے بغیر بلا شرکتِ غیرے ملکیت صاحبِ شفعہ شریک کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

زمین، مکان، باغ اور دوسری غیر منقولہ جائداد میں شُفعہ ثابت ہے، منقولہ مال پر قانونِ شفعہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

بنجر زمین کو آباد کرنا

جس زمین سے استفادہ نہ کیا جارہا ہو (خواہ وہ زمین کبھی بھی آباد نہ ہوئی ہو یا کسی زمانے میں آباد رہی ہو لیکن بعد میں ویران اور بیکار ہوگئی ہو یا اس نے مرغزار یا نیستان کی شکل اختیار کرلی ہو) اسے ہر حال میں آباد کرنا اسلام میں نیک کام شمار کیا گیا ہے اور یہ ملکیّت کے اسباب میں سے ایک سبب ہونے کے علاوہ ثوابِ اخروی کا موجب بھی ہے۔

رسول اکرمؐ سے مروی ہے کہ جو شخص بنجر زمین کو آباد کرے وہ زمین اس کی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

"جو جماعت زمین کو آباد کرے اس کا اس زمین پر پہلا حق ہے اور وہ زمین انھیں لوگوں کی ہے۔"

اِسلام میں بنجر زمینیں خُدا، رسولؐ اور امامؑ کا مال ہیں (یعنی اسلامی حکومت سے متعلق ہیں) اور مالِ غنیمت میں سے ہیں۔

بنجر زمین کو مندرجۂ ذیل شرائط کے ساتھ آباد کرکے اس کا مالک بنا جاسکتا ہے اور اگر کئی ایک اشخاص اس پر ملکیت حاصل کرنا چاہتے ہوں تو جو اسے آباد کرنے میں پہل کرے اس کا حق دوسروں پر فائق ہے۔

۱ - امام یا ان کے نائب کی اجازت۔

۲ - کسی دوسرے نے پہلے سے اس کے اردگرد پتھروں کی باڑ نہ باندھ دی ہو یا حدبندی وغیرہ نہ کردی ہو۔

۳ - دوسروں کی ملکیت اس تک پھیلی ہوئی نہ ہو۔ مثلاً نہر کے اطراف اور کنوئیں کے نیچے کی مٹی اور مزدعہ زمین۔

۴ - یہ کہ ویران مساجد اور اوقاف کی طرح آزاد (یعنی مستثنیٰ) زمین یا سڑکوں کی طرح عام مسلمانوں کا مال نہ ہو۔

تبصرہ

اصلاح اور آبادکاری کا ایک رسمی مفہوم ہے۔ لہٰذا جب عرفِ عام میں کہا جائے کہ "فلاں شخص نے زمین آباد کی ہے" تو ملکیت ثابت ہوتی ہے اور بلاشبہ مختلف مقاصد کے لیے آبادکاری کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً زراعت میں یہ چیز ہل چلانے سے عمل میں آتی ہے اور عمارت کے معاملے میں دیوار کھینچنے سے ثابت ہوتی ہے۔

۵ - اگر معدنیات رُوئے زمین پر ہوں اور ہر شخص بغیر کھدائی کیے ان سے استفادہ کرسکتا ہو تو سب کے لیے جائز ہے کہ اپنی

ضرورت کے مطابق ان سے بہرہ مند ہوں اور اگر ان سے استفادہ کرنے کے لیے کھُدائی اور دُوسری فنّی مساعی کی بھی ضرورت ہو (مثلاً سونا چاندی وغیرہ) تو جو شخص محنت مشقت کر کے کھدائی کرے اور انھیں زمین سے نکالے وہ ان کا مالک ہوگا۔

٦ ۔ بڑے دریا مسلمانوں کے درمیان مشترک ہیں اور یہی صُورت ندیوں اور برف اور بارش کے پانی کی ہے جو پہاڑوں سے نیچے کی طرف بہتا ہے اور جو کوئی زیادہ نزدیک اور آگے ہو اس کا حق دُوسروں پر فائق ہوتا ہے۔

لُقطہ

جو مال کسی کو ملے اور اس کے مالک کا عِلم نہ ہو وہ لُقَطہ کہلاتا ہے۔

١ ۔ جو مال ملے اور اس کے مالک کا عِلم نہ ہو، اگر اس کی قیمت ایک مثقال چاندی یا اس سے کم ہو تو اسے بلا روک ٹوک اٹھا کر اپنے مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ اگر اس کی قیمت ایک مثقال چاندی سے زیادہ ہو تو اسے نہیں اٹھانا چاہیے۔ اگر اُٹھا لیا جائے تو ایک سال عام طریقوں سے اس کے مالک کو تلاش کرنا چاہیے اور مالک مِل جائے تو اسے دے دینا چاہیے۔ اگر مالک نہ ملے تو اس کی طرف سے فقراء کو بطور صَدَقہ دے دینا چاہیے۔

٢ ۔ اگر کوئی مال کسی ایسے کھنڈر سے کہ جس کی آبادی ختم ہو چکی ہو یا غار

سے یا بے مالک کی بنجر زمین سے ملے تو وہ اس شخص کا مال ہے جسے مِلے۔

۳ ۔ اگر ایسا حیوان ملے جس کا مالک نہ ہو تو اس پر لُقطہ کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔

۴ ۔ اگر سرِراہ ایسا بچّہ ملے جس کا مالک نہ ہو تو سب مسلمانوں پر واجب کفائی ہے کہ اُسے اٹھالیں اور اس کی پرورش کریں۔

۵ ۔ اگر چوری کا مال کسی کے پاس بطورِ امانت رکھا جائے تو اس پر لُقطہ کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔ ایسا مال اس کے مالک کو دے دینا چاہیے اور چور کو واپس نہیں کرنا چاہیے۔

مُؤلِّفؒ کا تعارُف

علاّمہ سیّد محمد حسین طباطبائی ۱۹۰۳ء میں تبریز میں پیدا ہوئے۔ آپ طباطبائی خاندان کے چشم و چراغ تھے جو چودہ پشتوں سے ممتاز علمی شخصیتوں کو جنم دیتا رہا ہے۔ آپ نے عربی زبان اور مروّجہ علوم کی تعلیم اپنے آبائی شہر ہی میں حاصل کی۔

بیس سال کی عمر میں عازمِ نجف ہوئے جہاں پہنچ کر آپ نے اپنے وقت کے نامور علماء مرزا محمد حسین نائینی اور شیخ محمد حسین اصفہانی سے فقہ اور اصولِ فقہ میں کسبِ فیض کیا۔ علومِ نقلیہ میں عبور حاصل کرنے کے بعد علاّمہ موصوف کو علومِ عقلیہ میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ آپ نے سیّد ابوالقاسم خوانساری سے روایتی ریاضی کا مکمل نصاب پڑھا اور پھر سید حسین بادکوبی سے روایتی فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ ساتھ ہی ساتھ آپ نے بوعلی سینا کی "شفا"، مُلاّ صدرا کی "اسفار" اور ابن ترکاہ کی "تمہید القواعد" جیسی معیاری کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔

علمِ حُصولی کے علاوہ آپ نے علمِ حُضوری حاصل کرنے کی طرف بھی خصوصی توجّہ دی جس کے ذریعے علم، قدّوسی حقائق کی رویت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ خوش قسمتی سے آپ کو عارف باللہ مرزا علی قاضی جیسے استاد میسّر آگئے جنھوں نے آپ کو اَسرارِ ربّانی سے روشناس کرایا اور راہِ کمال کی جانب آپ کی رہبری کی۔ علاّمہ خود بیان کرتے تھے کہ جب مرزا علی قاضی انھیں "عرفان" پڑھاتے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کمرے کی دیواریں بھی "عرفان" کی حقیقت بیان کر رہی ہوں۔

علامہ طباطبائی نے نجفِ اشرف میں جو وقت گزارا وہ ان کے لیے عقلی علوم کے اکتساب کا ہی نہیں بلکہ زہد اور رُوحانی مشقوں کا دَور بھی ثابت ہوا جس کے نتیجے میں ان کو تجرید یعنی وہ روحانی کیفیت حاصل ہوگئی جس میں انسان مادّی بندھنوں سے آزاد ہوجاتا ہے۔

علامہ طباطبائی نجف میں دس سالہ قیام کے بعد تبریز لوٹے اور وہیں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں اور ایران پر روس کے قبضے کے بعد ۱۹۴۵ء میں قم منتقل ہوگئے۔ یہاں آپ نے اپنی تدریس کو تفسیرِ قرآن، اسلامی فلسفے اور تھیوسوفی پر مرکوز کردیا اور ایک دفعہ پھر ملّا صدرا کی تعلیمات کو روایتی نصابِ تعلیم کی بنیاد بنا دیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب تہران کے طلباء "مارکسزم" سے متأثر تھے علّامہ موصوف وہ واحد عالم تھے جنھوں نے کمیونزم کے بُنیادی فلسفے کا مطالعہ کیا اور روایتی نقطۂ نگاہ سے "جدلیاتی مادیت" کا جواب دیا۔ آپ کی اس کاوش کا نتیجہ ایک ضخیم کتاب "اُصولِ فلسفہ و روش ریالسم" کی شکل میں ظاہر ہوا، جس میں آپ نے تمام جدلیاتی فلسفوں کے مقابلے میں "حقیقت" کا دفاع کیا ہے۔

علامہ طباطبائی نے ایران کے روایتی اور جدید علمی حلقوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک ایسا روشن خیال طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کی جو اسلامی عقلیات سے روشناس ہونا چاہتا تھا۔ ان کے بہت سے شاگردوں نے جن کا تعلق علماء کے گروہ سے ہے، اس کوشش میں ان کی تاسی کی ہے۔ ان کے کچھ شاگرد، مثلاً

مشہد یونیورسٹی کے استاد، سید جلال الدین آشتیانی اور تہران یونیورسٹی کے استاد، شیخ مرتضیٰ مطہریؒ خود کافی شہرت یافتہ اسکالر تھے۔

تعلیم و تربیت میں شدید مصروفیت کے باوجود علاّمہ نے ۲۵ سے زائد کتب و رسائل تالیف کیے اور بے شمار مضامین لکھے جو اُن کے روایتی اسلامی علوم میں تبحّر کی گواہی دیتے ہیں۔ علاّمہ کے آثار میں سے المیزان فی تفسیر القرآن (۲۰ جلدیں) اصولِ فلسفہ و روش ریالیسم (۵ جلدیں) اور حاشیہ بر اسفار (۷ جلدیں) قابلِ ذکر ہیں۔ اب تک آپ کی بعض کتابوں کا انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، جاپانی، تھائی، انڈونیشی، ہاؤسا اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسلامی علمیت کی طویل روایت میں جو کچھ مستقل ہے علاّمہ طباطبائی اس کی علامت تھے۔

آپ کی ذات میں عالی ظرفی، تواضع اور تلاشِ حق کی وہ خصوصیات جمع ہو گئی تھیں جو صدیوں سے بہترین مسلمان علماء کا خاصہ رہی ہیں۔

عصرِ حاضر کے اِس جلیل القدر عارف، فلسفی اور مفسّرِ قرآن نے ۱۹۸۱ء میں داعیِ اجل کو لبّیک کہا اور قم میں اپنی آخری آرامگاہ میں محوِ خواب ہے۔

نَقُمْ بِعِلْمٍ وَلَا نَبْغِيْ لَهُ بَدَلًا
فَالنَّاسُ مَوْتٰى وَاَهْلُ الْعِلْمِ اَحْيَاءٌ

مطبع شاھین پیکجز کراچی

انتشارات جامعه تعلیمات اسلامی

ISLAMIC SEMINARY PUBLICATIONS

ISLAMIC SEMINARY PUBLICATIONS

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نٓ وَالۡقَلَمِ وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ

اسلام کے حقیقی نظریات اور معارف کے اِدراک

اور

آپ کے عِلمی، دینی اور رُوحانی ذوق کی تسکین کے لئے

عالِم اسلام کے جیّد عالموں اور دانشوروں کی تحقیقی کاوشوں پر مبنی اور اپنے مواد کی صحّت، دیدہ زیب کتابت، عمدہ کاغذ اور خوبصورت طباعت سے مزیّن ہونے کی بنا پر جامعۂ تعلیماتِ اسلامی کی قابلِ قدر مندرجہ ذیل مطبوعات کتابوں کی دنیا میں یقیناً گرانبہا اضافہ ہیں۔

اسلام دین فطرت	جمعی از دانشمندان	۳۰/- روپے
اسلام دین معاشرت	جمعی از دانشمندان	۳۰/- "
اسلام دین معرفت	محمد صحفی	۵۰/- "
اسلام دین حکمت	محمد بہشتی۔ جواد باہنر	۱۰۰/- "
فلسفۂ معجزہ	آیت اللہ خوئی	۲۵/- "
فلسفۂ شہادت	مرتضیٰ مطہری	۱۵/- "
فلسفۂ ولایت	مرتضیٰ مطہری	۲۰/- "
فلسفۂ احکام	ناصر مکارم/جعفر سبحانی	۴۰/- "
فلسفۂ حجاب	مرتضیٰ مطہری	۲۵/- "
تاریخ عاشورا	محمد ابراہیم آیتی	۳۰/- "
توضیح المسائل	آیت اللہ خوئی	۲۵/- "
پاسداران اسلام	محمد حسین طباطبائی	۳۰/- "
مکتب اسلام	محمد حسین طباطبائی	۳۰/- روپے
مکتب رسول	محسن قرائتی	۵۰/- "
مکتب تشیّع	محمد رضا مظفر	۲۵/- "
انتظار امام	محمد باقر صدر	۱۰/- "
آخری فتح	مرتضیٰ مطہری	۱۰/- "
تفسیر سُورۃ الحمد	آیت اللہ خوئی	۲۰/- "
فُزت بربّ الکعبہ	محمدی ری شہری	۵/- "
تعلیمات اسلامی	جمعی از دانشمندان	۲۴/- "
مرد انقلاب	مصطفیٰ زمانی	۱۵/- "
بُت شکن	مصطفیٰ زمانی	۱۵/- "
گفتار عاشورا	جمعی از دانشمندان	۱۸/- "
سیر و سُلوک	شہید مطہری، علامہ طباطبائی، امام خمینی	۴۰/- "

اس کے علاوہ بچّوں کے لیے قرآنی قاعدے اور دینی قصّے بھی دستیاب ہیں

جامعۂ تعلیماتِ اسلامی پاکستان